

﴿جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں﴾

نام کتاب : تفہیم المسائل (جلد چہارم)

مصنف: پروفیسر مشتق غیب الرحمن

صفحات:

تعداد:

قیمت:

☆.....ناشر.....☆

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

۴۱ انفال پلازہ اردو بازار، کراچی

ملنے کا پتا:

دارالعلوم نعیمیہ بلاک 15 فیڈرل بی ایریا، کراچی

فون: 021-6314508/6324236

مکتبہ اہلسنت جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری گیٹ، لاہور

فون: 042-7634478

WWW.NAFSEISLAN.COM

☆ انتساب ☆

میں اپنی اس ناچیز علمی کاوش کو اپنے ایک جِدِّ اعلیٰ حضرت قبلہ
قاضی عبدالرحمن رحمہ اللہ تعالیٰ و قدس اللہ سرہ العزیز کے نام
سے منسوب کرنے کو اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتا ہوں،
جو اپنے عہد کے ایک عالمِ اجل، جامع العلوم، صاحب ورع
و تقویٰ اور ولی کامل تھے۔

العبد الضعیف

15، ستمبر 2007ء

منیب الرحمن

نَفْسِ اسْلَام

WWW.NAFSEISLAM.COM

صفحہ نمبر	مضمون
14	آغازِ تکلم
16	﴿کتاب العقائد﴾
18	کلمہ کفر
19	توہینِ نبی
20	نبی کریم ﷺ کے والدین کے ایمان کے بارے میں
27	اہانتِ معاویہ
29	نومسلم کے ایمان کی غیر یقینی کیفیت
31	غیر مسلموں سے معاملات اور ان کی عبادت گاہوں میں جا کر ان کے طریقے سے عبادت کرنا
38	آثارِ قیامت میں ”تقاربِ زمانی“ کا مفہوم
41	زمانے کو برا کہنے کی ممانعت
44	﴿کتاب الطہارت﴾
46	غسل کے بعد وضو
47	بچے کی پیدائش کے بعد زچہ اور بچہ کا غسل
48	﴿کتاب الصلوٰۃ﴾
50	طلوع آفتاب اور نماز
52	تارکِ صلوٰۃ کا شرعی حکم

57 ظہر کے پہلے کی چار سنتیں چھوٹ جائیں تو کب پڑھے؟

60 جہاں زمین کے نیچے سیوریج لائن گزر رہی ہے، اس جگہ پر نماز

پڑھنا

61 مسجد میں اپنے لئے اور دوسرے کے لئے جگہ مختص کرنا یا کپڑا رکھ کر

محفوظ کرنا

62 نماز میں اقامت کہنے والے کا امام بننا یا امام کا خود ہی اقامت

کہہ دینا

65 امام یا مؤذن کا غیر شادی شدہ ہونا

66 تراویح کی امامت کا استحقاق

67 جسمانی نقص سے امامت میں فرق

69 نابینا کی امامت

71 امام صاحب کی رہائش

73 نماز میں خلاف ترتیب قراءت کا حکم

75 قراءت کی غلطی سے فساد نماز

77 قراءت میں متشابہ لگنا اور یاد آنے پر واپسی اسی جگہ سے پڑھنا

78 ریڈیو، ٹی وی پر آیت سجدہ سن کر سجدہ تلاوت کرنے کا حکم

79 مسجد میں جماعت ثانی

خواتین کے مخصوص ایام کی نمازوں کی قضا نہیں، صرف روزوں کی قضا 83
ہے

85 نمازِ قصر میں وطن کی اصطلاح

88 اذانِ جمعہ اور نماز کی سعی

92 خطبہ جمعہ کے دوران بیٹھنے کی ہیئت

97 نمازِ جمعہ کے بعد طویل دعا

100 کپڑا الٹا کر چلنے یا گھسیٹے ہوئے چلنے کا حکم، نماز میں ”سکفِ
ثوب“، ”جز ثوب اور اسبالِ ازار“ کا حکم

113 تسبیحاتِ فرض کے فوراً بعد پڑھی جائیں یا سُنَّیں و نوافل کے بعد؟

120 ﴿کتاب المساجد﴾

122 مسجد کی چھت پر بالغ طالبات کے مدرسے کا حکم

126 مسجد کے قیام کے بعد اس کی حیثیت کو تبدیل کرنا

129 منبرِ نبوی ﷺ کی سڑھیاں

130 مسجد کی بالائی منزل پر جماعت

131 فنائے مسجد کا حکم

134 چندہ جس مقصد کے لئے جمع کیا گیا ہے، اسے اس کے بجائے

دوسرے مصارف پر صرف کرنا

137 مسجد کا استعمال شدہ سامان کسی دوسری مسجد میں دینا

- 138 خزانچی کے گھر سے مسجد کی رقم کی چوری
- 139 مسجد اور مسلک
- 141 مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے کی کراہت اور عذر کی بنا پر جواز کی صورتیں
- 146 نامکمل وقف
- 148 ﴿کتاب الجنائز﴾
- 150 غسل میت سے پہلے ایصالِ ثواب یا قرآن خوانی
- 152 مصنوعی دانتوں کے ساتھ تدفین
- 154 پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت
- 159 جھوٹی قبر بنانا اور اس کی تعظیم کرنا
- 161 مردہ پیدا ہونے والے بچے کے کفن و دفن کا طریقہ
- 164 ﴿کتاب الزکوٰۃ﴾
- 166 زکوٰۃ کی رقم سے قرض کی ادائی
- 166 زکوٰۃ کی رقم سے نادار کے قرض کی ادائی / زکوٰۃ کی رقم ہبہ یا قرض کہہ کر دینا
- 168 ادھار کی رقم سے زکوٰۃ کی ادائیگی
- 169 اسپتال کے لئے زکوٰۃ کی رقم سے آلاتِ طب کی خریداری
- 169 زکوٰۃ کی رقم سے مقامی بچوں کے لئے تعلیم القرآن کا مدرسہ چلانا

- 171 ترکے کی تقسیم سے پہلے کی مدت پر زکوٰۃ واجب نہیں
- 174 زکوٰۃ کی رقم سے ڈائلیسس مشین کی خریداری
- 176 مقامی مدارس میں زکوٰۃ اور نفلی صدقات کا استعمال
- 177 زکوٰۃ کی ادائیگی میں تملیک کی شرط
- 178 زکوٰۃ کا استحقاق
- 180 ﴿کتاب الصوم﴾
- 182 دودھ پلانے والی ماں کے لئے روزے کا حکم
- 184 عذر کی بنا پر روزے چھوڑنا
- 185 غسل واجب ہو اور صبح صادق
- 188 ﴿کتاب الحج﴾
- 190 فلسفہ و روح حج
- 196 قرعہ اندازی اسکیم پر حج
- 197 اسقاطِ فرض کے لئے حج بدل سے متعلق ایک اہم مسئلہ
- 199 حج قرآن میں جنایت پر صورت مسئلہ کے مطابق ایک دم یا ایک
- صدقہ لازم آئے گا یا دودو
- 201 دم کی ادائیگی حد و حرم میں
- 202 احرام کی حالت میں دانت سے خون آنا یا بواسیر کا خون اور اس کا حکم
- 204 دورانِ حج ناپاکی

- 205 حج و عمرہ کے مسائل
- 230 عمرے کی ادائیگی کے لئے محرم
- 231 حج سے تمام گناہوں کا معاف ہو جانا
- 234 ﴿کتاب النکاح﴾
- 236 حرمت رضاعت
- 238 ثبوت رضاعت
- 239 خالہ کے نکاح میں رہتے ہوئے اس کی بھانجی سے نکاح حرام ہے
- 243 حرمت مصاہرت
- 247 حرمت مصاہرت ثابت نہیں
- 250 شادی اور تقریبات پر فائرنگ اور آتش بازی
- 252 جبری نکاح کا حکم
- 254 جعلی نکاح نامے کی حیثیت
- 255 غیر رجسٹرڈ نکاح کی شرعی حیثیت
- 256 میاں بیوی کے ایک دوسرے پر الزامات لگانے سے از خود نکاح باطل نہیں ہوتا
- 262 حرمت نکاح
- 263 حقیقی بھائی کی رضاعی بہن سے نکاح

265	لا علمی میں بہن بھائی کا نکاح
266	تحلیل شرعی کے لئے زوج غیر کے ساتھ نکاح صحیح ضروری ہے
267	عنین کا حکم
271	حرمتِ مصاہرت زنا سے بھی ثابت ہوتی ہے
276	﴿کتاب الطلاق﴾
278	”ولایتِ حال“ نسبتِ طلاق کے لئے کافی ہے
280	ازدواجی تعلقات میں کشیدگی اور طلاق
283	طلاقِ ثلاثہ کے بعد شوہر اول سے نکاح کا حکم
285	الفاظِ طلاق
287	مذاکرۃ طلاق
289	تین طلاق کا حکم
293	طلاق میں اضافت
296	بیوی کو شروط طلاق دینا
297	خلع اور حقِ حضانت
299	طلاقِ بائن
301	”تم تو میری بیوی نہیں ہو“، الفاظِ طلاق نہیں
302	مسئلہ طلاق
304	شروط طلاق

- 306 طلاق معلق بالشرط
- 307 خلع
- 307 زوج منقو والخر
- 313 تحریری طلاق نامہ لڑکی کو نہ ملے تب بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے
- 314 طلاق مغلطہ کے بعد تعلقات
- 116 ثبوت طلاق کے طریقے
- 318 طلاق غیر مدخولہ
- 319 تحلیل شرعی کے لئے شخص غیر کی قید
- 320 طلاق ہوئی یا نہیں؟
- 321 جبری طلاق کی ایک صورت
- 325 مطلقہ غیر مدخولہ کامہر (1)
- 326 مطلقہ غیر مدخولہ کامہر (2)
- 328 امام شافعی کے نزدیک تین طلاق کا حکم
- 329 انکار طلاق کی صورت میں شرعاً کیا حکم ہے
- 333 طلاق مدہوش
- 335 فیملی کورٹس کے فاضل جج صاحبان کی خدمت میں مؤدبانہ
- گزارشات
- 343 ماں کا حق نگہداشت ساقط ہونے کی صورتیں

- 346 بچوں کی کفالت
- 350 ﴿کتاب العت﴾
- 352 عدت
- 353 کیا میں دورانِ عدت طلاق گھر سے باہر جاسکتی ہوں؟
- 354 عدتِ وفات
- 356 مدّتِ عدت
- 359 ازواجِ تعلقات نہ ہوں تب بھی عدت ضروری ہے
- 359 دورانِ عدت جنازے میں شرکت
- 362 ﴿کتاب الفرائض﴾
- 364 ترکہ کی تقسیم
- 368 ایک یا دو اشخاص کا دیگر ورثاء کی موجودگی میں تمام جائیداد پر قابض ہو جانا
- 369 لاوصیہ لوارث
- 370 تقسیم ترکہ میں مقدم کون؟
- 375 تقسیم ترکہ اور برائش لاء
- 377 لاولد چچا کے ترکہ میں بھتیجے اور بھتیجیوں کا حق وراثت
- 379 لاولد پھوپھی کے ترکہ میں مقدم سگے یا سوتیلے بھتیجے
- 380 مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان وراثت

383 تقسیم وراثت سے متعلق چند اہم اصولی امور کی وضاحت
385 شوہر اور بیوی کی مشترکہ کمائی سے بنائی ہوئی جائیداد اور تقسیم
ترکہ

386 بیوی کا واجب الادا قرضہ کس کے ذمے ہوگا؟

387 زندگی میں وراثت تقسیم نہیں ہوتی

388 کیا سوتیلا بیٹا اکیلا وارث بن سکتا ہے

389 ترکے کی تقسیم موجودہ قیمت کے مطابق

390 غیر وارث کو ترکے سے حصہ

392 تقسیم ترکہ

393 ڈان

395 ترکے میں سوتیلی اولاد کا حصہ نہیں

395 پنشن ترکے میں شامل نہیں

397 مرحوم کے بہن بھائی محروم رہیں گے

400 ﴿حلال و حرام، مجائز و ناجائز﴾

402 قتلِ خطا

405 قتلِ شبہ عمدہ

408 غیر مسلم کا چیف جسٹس یا قائم مقام بننا

محافل میلاد کے بارے میں یہ کہنا کہ ”اس میں حضور ﷺ“ 412
تشریف لائے ہوئے ہیں اور اس میں وحدہ لا شریک بھی شریک
ہوتا ہے“

418 خاتون مبالغہ کا غیر شرعی طرز عمل

426 مرد پر ریشم کا لباس حرام ہے

427 مالک کو بتائے بغیر بھی حقوق ادا کرنے سے انسان بری الذمہ
ہو جاتا ہے

432 شرعاً قسم منعقد نہیں ہوئی

433 پرائز بانڈز اور شیئرز کا شرعی حکم

434 ٹریفک سگنل توڑنے کا شرعی حکم

435 کامرس یا اکاؤنٹنگ کی تعلیم میں سودی اندراج

436 بجلی کی چوری

438 انجکشن کے ذریعے جانوروں کی افزائش نسل کا جواز

439 روحانی علاج کی شرعی حیثیت

442 ﴿متفرق﴾

444 والدین کی خدمت کے وسیلے سے دعا کرنے پر اجر آخرت باطل
نہیں ہوتا

446 پرائیویٹ اسکولوں / کالجوں میں ایام تعطیلات کی فیس کا شرعی حکم
قوم کا اصل مسئلہ طبقاتی نظامِ تعلیم ہے

448 استخارہ کا مفہوم، شرعی حیثیت اور استخارہ کے نام پر ماضی کے
احوال بتانا

454 قیامِ تعطیسی کا شرعی حکم

460 نیاز کا مفہوم اور جواز

461 رجب کے کوئڈے اور ”تبارک“ کی روٹیاں

465 قیامت کے دن اعمال کا وزن کس طرح ہوگا

471 ایصالِ ثواب کا کھانا اور صدقہ جاریہ

478 یومِ میلاد النبی ﷺ کی صحیح تاریخ کا تعین

484 محافلِ میلاد میں مخلوط اجتماعات

485 تبرکاتِ انبیاء کرام کا احترام

489 عوام کا یہ کہنا کہ ہم سب اللہ کے سامنے غریب ہیں

490 نماز تراویح کی امامت کا معیار

491 مدرسے کی سالانہ رپورٹ میں تصاویر کی اشاعت

الحمد لله رب العلمين، والصلوة والسلام على رحمة للعلمين،
سيدنا ومولانا محمد وعلى اله الطيبين الطاهرين وعلى صحابته
الصديقين الكاملين، وعلى اولياء امته وعلماء ملته من الفقهاء
المجتهدين والمحدثين والمفسرين اجمعين

آغازِ تکلم

تفہیم المسائل کی جلد چہارم پیش خدمت ہے۔ بنیادی طور پر یہ سوال و جواب
روزنامہ ایکسپریس میں شائع ہوتے رہے ہیں، کچھ ایسے سوال و جواب ہیں، جو اخبار
میں شامل اشاعت نہ ہو سکے، وہ بھی اس جلد میں شامل ہیں۔ بعض اوقات ایک جیسے
سوال مختلف سائلین کی جانب سے آتے ہیں، اس لئے نفس مسئلہ اور جواب میں درج
مواد کا تکرار ہو جاتا ہے۔ اس مرتبہ میں نے کتاب کو مرتب کرنے کے بعد اشاعت
سے پہلے نظر ثانی کے لئے اپنے دارالعلوم کے استاذ حدیث و صدر مدرس علامہ احمد علی
سعیدی صاحب زید مجدہم کو دیا، انہوں نے کافی محنت سے پڑھا، جہاں ضروری عربی
عبارات شامل ہونے سے رہ گئی تھیں، وہ شامل کرائیں اور مکرر رات کو حذف کرایا۔
حتمی مراحل میں تصحیح کے لئے فاضل مصنف و صاحب طرز ادیب علامہ محمد اعظم سعیدی
نے سرسری مطالعہ کیا اور جو فروگزاشت رہ گئی تھیں، ان کی نشاندہی فرمائی۔ اس
کتاب میں شامل مسائل کے حل میں میرے معاون مفتی عبدالرزاق نقشبندی

زید مجدہ کا علمی تعاون شامل حال رہا ہے۔ کمپوزنگ اور بار بار صحیح میں عزیزم یا سررحمن
 نے مسلسل محنت کی، میں ان تمام حضرات کا تہ دل سے ممنون و شکر ہوں۔ ہم تمام
 ورپیش مسائل میں اپنے دارالعلوم کے شیخ الحدیث، امام المفسرین والمحدثین فی
 العصر علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم سے مشاورت بھی کرتے رہتے ہیں اور تمام
 متعلقہ مقامات پر ”تبیان القرآن“ اور ”شرح صحیح مسلم“ سے بھی استفادہ
 کرتے رہتے ہیں۔ الحمد للہ علی احسنہ علامہ صاحب کی ”نعمت الباری“ شرح
 صحیح بخاری کی چوتھی جلد پر کام ہو رہا ہے اور ”کتاب الصیام“ کے نصف تک مکمل
 ہو چکی ہے۔ پہلی جلد جو ”کتاب التیمم“ پر مکمل ہوئی ہے، ان شاء اللہ
 العزیز عید الاضحیٰ کے موقع پر طبع ہو کر مارکیٹ میں آجائے گی اور اہل علم ”شرح صحیح
 مسلم“ کے انداز سے ہٹ کر ایک منفرد طرز میں اسے پائیں گے۔ اللہ عزوجل کی
 بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ تمام تر علمی، فکری اور جسمانی ثواب کی سلامتی کے ساتھ انہیں اس
 عظیم کام کی تکمیل کی توفیق و سعادت نصیب فرمائے، ممکنہ طور پر یہ شرح بارہ مجلدات
 میں مکمل ہوگی۔ ہم نے اپنی بشری استطاعت کی حد تک اس کتاب کی لفظی و معنوی
 صحت کی سعی کی ہے، لیکن ہماری سعی میں خطا اور لغزش کا امکان موجود ہے، بلکہ ہم جیسے
 کم علم اور خطا کار انسانوں سے ایسی خطاؤں کا وقوع بھی ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہماری
 خطاؤں کو معاف فرمائے۔ اہل علم سے گزارش ہے کہ ہماری کسی خطا پر آگاہ ہوں
 تو ضرور مطلع فرمائیں، ہم ان کے شکرگزار ہوں گے۔ دعا ہے کہ اللہ جل شانہ اپنے
 حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل اس عاجزانہ سعی کو قبول فرمائے، اور اسے

سابقہ مجلّٰدات کی طرح قبول عام عطا فرمائے، آمین بحمد سید المرسلین علیہ
وعلیٰ آلہ وصحبہ افضل الصلوة والتسلیمات۔

بہر الضعیف

منیب الرحمن



کلمہ کفر

سوال: 1

زید اور بکر میں کسی فقہی مسئلے کی وجہ سے بحث ہوئی اور جبکہ زید طالب علم ہے، اور زید نے کہا کہ فلاں مسئلے کے بارے میں فلاں فلاں علماء کرام و فقہاء عظام نے یہ یہ فرمایا ہے کہ جبکہ تمہاری بات ان کے خلاف جاتی ہے، تو اس پر بکر سے کچھ جواب نہ بنا اور بکر نے یہ کہا کہ ”میں اپنے مرشد کے فرمان کے آگے (معاذ اللہ) تمام عالموں اور مفتیوں کے فتوؤں کو جوتے کی نوک پراڑا تا ہوں۔“ آیا بکر کا یہ جو جملہ ہے کہ ”میں ان کے فتوؤں کو جوتے کی نوک پراڑا تا ہوں۔“ بکر کا یہ قول کہنا کیسا ہے، جواب عنایت فرمائیں، (محمد راحیل قادری، ملیرشٹی، کراچی)۔

جواب :

اللہ اور رسول کے علاوہ دوسرے کسی بھی شخص کا قول و عمل مطلقاً واجب العمل اور حجت نہیں ہے، کسی شخص کا اپنے پیر و مرشد یا استاد کا یا کسی دوسرے معظم شخص کے بارے میں یہ نظریہ رکھنا کہ ان کا فرمان میرے لئے مطلقاً واجب العمل ہے، غلو یعنی مبالغہ آرائی اور گمراہی ہے، قبیح سنت عالم دین پیر و مرشد سے عقیدت رکھنا اور ان کی تعلیمات پر عمل کرنا فعل مستحسن ہے، لیکن اس کے نتیجے میں علماء دین اور ان کے شرعی فتوؤں کی حقارت کرنا یہ کفر ہے۔ استفتاء میں مذکور خط کشیدہ الفاظ میں مذکور فی السؤال شخص نے علم اور علماء کی بالقصد والا راہ توہین کی ہے اور فقہاء کرام کی تصریحات کی رو سے شرعی فتاویٰ اور بغیر کسی دنیاوی عداوت کے علماء کی تذلیل و تحقیر کفر ہے، لہذا مذکورہ

فی السوال شخص اپنے ان کفریہ الفاظ کی وجہ سے کافر ہوا، اس پر توبہ کر کے تجدید ایمان اگر شادی شدہ ہے، تو تجدید نکاح فرض ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

رجل عرض علیہ خصمه فتوی الاثمة فردھا وقال جہ بارنام فتوی آوردہ
قیل یمکفرو کذا لولم یقل شیئاً ولكن القی الفتوی علی الارض وقال این جہ شرع
است۔

ترجمہ: ”ایک شخص پر اس کے فریق مخالف نے ائمہ فقہاء کرام کا فتویٰ پیش کیا، اس نے جواباً کہا کتنی بار فتویٰ کا نام لو گے، ایک قول کے مطابق وہ کافر ہو جائے گا، اسی طرح اگر اس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا، لیکن فتویٰ زمین پر پھینک دیا اور کہا کہ یہ کہاں کی شریعت ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص: 272، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

توہین نبی

سوال: 2

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اور مفتیان شرع اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص یہ کہتا ہے کہ ”میرے باپ کی بات کا وجہ میرے نزدیک نبی کی بات سے کم نہیں، اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے اور اس کا مذکورہ جملہ کیا معنی رکھتا ہے؟، (محمد قاسم، بہاول نگر)۔

جواب:

جس شخص نے یہ جملہ کہا العیاذ باللہ وہ کافر ہو گیا اور اس پر لازم ہے کہ وہ اس بات سے رجوع کرے اور دوبارہ کلمہ پڑھے اور اگر شادی شدہ ہے تو دوبارہ نکاح کرے، کیونکہ اس کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو نبی ﷺ کے برابر قرار دیتا ہے اور اس میں نبی ﷺ کا استخفاف ظاہر ہے اور اس سے یہ مفہوم بھی نکلتا

ہے کہ جب وہ اپنے باپ کی بات کو نبی ﷺ کی بات کے برابر سمجھتا ہے تو وہ اپنے باپ کو معاذ اللہ نبی ﷺ کے برابر سمجھتا ہے۔

نبی ﷺ کی بات کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے:

وما ينطق عن الهوىٰ ۝ ان هو الا وحي يوحىٰ -

ترجمہ: ”اور وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں فرماتے، نہیں ہوتا ان کا فرمانا، مگر وحی جو (ان کی طرف) کی جاتی ہے، (النجم: 3، 4)۔“

آیت مبارک میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے قول کو اپنا قول فرمایا ہے۔ اور مذکورہ شخص کا یہ جملہ کفریہ ہے، لہذا وہ اپنی بات سے رجوع کرے اور کلمہ پڑھے، شادی شدہ ہے تو دوبارہ نکاح کرے، علامہ امجد علی اعظمی ایک سوال کے جواب میں درمختار کے حوالے سے لکھتے ہیں: مما يَكُونُ كُفْرًا اتفاقًا يبطل العمل والنكاح واولاده اولاد زنا وما فيه خلاف يغمر بالاستغفار والتوبة وتحديد النكاح -

ترجمہ: ”جس نے کفر پر اتفاق کیا اس کا عمل اور نکاح باطل ہو گیا اور اس کو توبہ واستغفار اور تجدید نکاح کا حکم دیا جائے گا اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے بعد جو اولاد پیدا ہوگی وہ ولد الزنا ہوگی، (فتاویٰ امجدیہ جلد چہارم ص: 399 مکتبہ رضویہ آرام باغ کراچی)۔“

نبی کریم ﷺ کے والدین کے ایمان کے بارے میں

سوال: 3

ایک صاحب کا کہنا ہے کہ معاذ اللہ! رسول اللہ کے والدین کریمین جہنمی ہیں اور وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں مندرجہ ذیل دو حدیثیں پیش کرتے ہیں:

(1): ”حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ مُلِکِہ کے دو بیٹے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: ہماری ماں شوہر کا احترام کرتی تھی، اولاد پر مہربان

تھی، اور مہمان (کے ساتھ حسن سلوک کا بھی) ذکر کیا، سوائے اس کے کہ اس نے زمانہ جاہلیت میں بچی کو زندہ درگور کر دیا تھا، (تو نبی کریم ﷺ نے) فرمایا: تم دونوں کی ماں جہنم میں ہے، وہ پلٹ کر جانے لگے اور نا کواری ان کے چہرے پر واضح نظر آرہی تھی، پھر (نبی کریم ﷺ) نے ان دونوں کو واپس بلوایا، وہ دونوں لوٹ کر آئے اور ان دونوں کے چہروں سے اس امید پر مسرت جھلکنے لگی کہ (شاید کوئی امید افزا) صورت حال پیدا ہوگئی ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”میری ماں بھی تم دونوں کی ماں کے ساتھ ہے“ (آگے حدیث طویل ہے) مسند احمد، رقم الحدیث: 3787۔“

(2): ”حضرت انس سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میرے (وفات یافتہ) باپ کہاں ہیں؟، آپ ﷺ نے فرمایا: جہنم میں، جب وہ لوٹ کر (جانے لگا) تو آپ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا: ”بیشک میرا اور تمہارا باپ (دونوں) جہنم میں ہیں، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 490)۔“ ان احادیث کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے والدین کریمین کے ایمان کی بابت شرعی موقف واضح کیجئے، (علی حسن نقوی)۔

جواب:

یہ احادیث ان دونوں کتب احادیث میں موجود ہیں۔ مسند احمد کے حاشیے پر اس حدیث کی متعدد توجیہات بیان کی گئی ہیں، جو یہ ہیں: (1) سند کے لحاظ سے یہ حدیث ضعیف ہے، اور حدیث ضعیف پر عقیدے کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ اس کے ایک راوی عثمان بن عمیر کو، جس کی کنیت ابوالیقطان ہے، امام دارقطنی کے حوالے سے ڈھمی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

امام ہشمی نے ”المجمع“ میں اسے روایت کر کے تبصرہ کیا ہے کہ اسے امام احمد، امام بزار اور امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور ان سب کی اسناد میں عثمان بن عمیر ہے اور وہ ضعیف ہے۔ ایک تو جیہہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ ”امی مع امکما“، ”یعنی میری ماں تم دونوں کی ماں کے ساتھ ہے“ اس سے مراد یہ کہ دونوں عالم برزخ میں ہیں، یہ کلمات آپ نے ”تور یہ“ کے طور پر فرمائے تاکہ سائل کو کم از کم وقتی طور پر ذہنی اذیت سے نجات مل جائے۔ ”تور یہ“ سے مراد ایسا ذہنی کلمہ استعمال کرنا جو دو معانی کا حامل ہو، ایک معنی قریب جو متبادر الی الفہم ہو (یعنی فوراً سامع کے ذہن میں آجائے) اور دوسرا دور کا معنی ہو، قائل کی اصل مراد دور کا معنی ہو لیکن مخاطب قریب کا معنی مراد لے اور ایسا دین کی کسی حکمت کے تحت کرنا جائز ہے۔ یا اس کی ایک تو جیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو آپ کے ابوین کی اس وقت تک بذریعہ وحی خبر نہیں دی گئی تھی، اور یہ مفہوم حدیث کے آخری کلمات سے مستفاد ہوتا ہے کہ ”میں نے ان کی بابت اپنے رب سے دریافت نہیں کیا“، یعنی اس وقت تک رسول اللہ ﷺ اور آپ کے رب کے درمیان اس مسئلے میں مراجعت نہیں ہوئی، بعد میں ہو گئی اور آپ کو اپنے ابوین کریمین کا جنتی ہونا بذریعہ وحی بتا دیا گیا۔

چند احادیث ملاحظہ فرمائیں:

عن انس بن مالک قال فخطب رسول الله ﷺ فقال: ”انا محمد بن عبد الله بن عبد المطلب بن هاشم بن عبد مناف بن قصي بن كلاب بن مرة بن كعب بن لؤي بن غالب بن فهر بن مالك بن نضر بن كنانة بن خزيمة بن مدركة بن الياس بن مضر بن نزار“۔ وَمَا افترق الناس فرقتين الا جعلني الله في خيرهما فآخر جئت من بين ابوين، فلم يصيبني شئ من عهد الجاهلية۔

وَخَرَجْتُ مِنْ نِكَاحٍ، وَلَمْ أُخْرَجْ مِنْ سَفَاحٍ، مِنْ لَدُنْ آدَمَ حَتَّىٰ اُنْتَهَيْتُ إِلَىٰ
ابِي وَأُمِّي فَلَا خَيْرَ كُمْ نَفْسًا، وَخَيْرَ كُمْ أَبًا۔

ترجمہ: ”حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ
رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ”میں محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن
ہاشم بن عبد مناف ابن قصی بن کلاب بن مرثدہ بن کعب، بن لؤی بن غالب بن فہر
بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مُدرکہ بن الیاس بن مُضر بن نزار ہوں۔
جب بھی لوگوں کے دو گروہ ہوئے، مجھے اللہ تعالیٰ نے ان میں سے سب سے بہتر گروہ
میں رکھا۔ پس میرا اپنے ماں باپ سے ظہور ہوا تو مجھے زمانہ جاہلیت کی بدکاریوں میں
سے کسی چیز نے نہیں چھوڑا تھا اور میں نکاح کے ذریعہ پیدا ہوا اور میں بدکاری کے ذریعہ
پیدا نہیں ہوا، حتیٰ کہ حضرت آدم سے لے کر میں اپنے ماں باپ تک پہنچا، پس میں بھی
تم سے خیر اور بہتر ہوں اور میرے باپ بھی تم سب سے خیر اور افضل ہیں، (دلائل
النبوۃ للبیہقی، جلد: 1، ص: 174، 175، مطبوعہ: دارالکتب العلمیہ، بیروت)۔“

عن علی ابن ابی طالب أنَّ النبی ﷺ قال خَرَجْتُ مِنْ نِكَاحٍ وَلَمْ أُخْرَجْ
مِنْ سَفَاحٍ مِنْ لَدُنْ آدَمَ إِلَىٰ أَنْ وَلَدَنِي أَبِي وَأُمِّي، لَمْ يُصْنِنِي مِنْ سَفَاحِ الْجَاهِلِيَّةِ
شَيْئًا۔

ترجمہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: میں نکاح سے پیدا
ہوا ہوں، میری ولادت ناجائز طریقے سے نہیں ہوئی، آدم علیہ السلام سے لیکر اس وقت
تک جب کہ میرے والد اور والدہ نے مجھے جنا، مجھے زمانہ جاہلیت کی کسی غلط چیز نے
نہیں چھوڑا، (دلائل النبوۃ لابی نعیم، جلد: 1، ص: 11، بیروت)۔“

علامہ ابن جوزی متوفی 579ھ لکھتے ہیں:

عن ابن عباس قال قلت: يا رسول الله ﷺ أين كنت وأدم في الجنة؟ قال: كنت في صُلبه وأهبط إلى الأرض وأنا في صُلبه، وركبت السفينة وفي صُلب أبي نوح وقُذِفْتُ في النار في صُلب أبي إبراهيم لم يلتق لي أبوان قط على سَفَاح لم يزل ينقلني من الأصلاب الطاهرة إلى الأرحام النقية مهلباً.

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! تب آپ کہاں تھے؟، جب آدم علیہ السلام جنت میں تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: میں ان کی صُلب (پشت) میں تھا اور جس وقت انہیں زمین پر اتارا گیا اس وقت بھی میں ان کی صُلب میں تھا، اور مجھے اپنے باپ نوح کے صُلب میں کشتی میں سوار کیا گیا، اور مجھے اپنے باپ ابراہیم کی پشت میں آگ میں ڈالا گیا، اور میرے والدین کبھی بھی برائی پر نہیں ملے میں پاک اور طاہر پشتوں سے پاکیزہ رحموں میں منتقل ہوتا رہا ہوں، (الوفابا حوال المصطفیٰ، جلد: 1، ص: 28، مطبوعہ: دارالکتب العلمیہ، بیروت)۔“

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت کریمین یعنی حضرت عبداللہ و آمنہ رضی اللہ عنہما سے لے کر حضرت آدم و حوا علیہما السلام تک آپ کے تمام آباء واجداد اور ائمہات وجدات کے بارے میں امت کا اجماع اکثری اور علماء حق کا موقف یہ ہے:

- 1۔ ان میں سے بعض انبیاء کرام و رُسُلِ عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام تھے۔
- 2۔ دیگر جنہوں نے کسی نبی یا رسول کے عہد، تعلیمات اور شریعت کے احکام کو صحیح اور غیر تحریف شدہ شکل میں پایا، وہ اس عہد کے مومنین کا ملین تھے۔
- 3۔ دیگر جنہوں نے کسی نبی یا رسول کے عہد، تعلیمات اور شریعت کے احکام کو صحیح اور

غیر تحریف شدہ شکل میں نہیں پایا، بلکہ ایک نبی کے وصال فرمانے کے بعد جب طویل عرصہ گزر گیا، تو ان کی تعلیمات فراموش کر دی گئیں یا ان میں تحریف کر دی گئی اور مسخ کر دیا گیا۔ اس دور کو زمانہ فترۃ وحی اور زمانہ انقطاع وحی (Gap Period of Revelation) کہا جاتا ہے، ایسے دور میں لوگ تفصیلی شرعی احکام کے مکلف نہیں ہوتے بلکہ دین فطرت اور توحید کے مکلف (Accountable) ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی (Existence of God) اور احدیت باری تعالیٰ (ONENESS of God) کے پابند ہوتے ہیں۔ امت کا اجماع اکثری اور علماء حق کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وہ آباء واجداد، جو زمانہ فترۃ وحی میں گزرے، ان میں سے کوئی بھی مشرک، کافر اور ملحد نہیں تھا، سب کے سب دین فطرت اور دین توحید پر قائم رہے۔ آپ ﷺ کے اجداد عالی نسب، حضرت کعب بن لؤی، حضرت قصی، حضرت عبدالمطلب، وغیرہم کے جو خطبات اور ارشادات تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں، وہ اس امر کا واضح ثبوت ہیں۔

4۔ رسول اللہ ﷺ کے آباء واجداد میں کوئی مشرک اس لئے بھی نہیں ہو سکتا کہ آپ کا فرمان ہے: لَمْ يَزَلْ يَنْقُلُ مِنْ أَصْلَابِ الطَّاهِرِينَ إِلَى أَرْحَامِ الطَّاهِرَاتِ وَالْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ۔

ترجمہ: ”میرا (نور نبوت اور جوہر وجود ہر دور میں میرے آباء واجداد کی) پاک پشتوں سے (میری ائمہات وجدات کے) پاک رحموں میں منتقل ہوتا رہا اور مشرک تو ہوتے ہی ناپاک ہیں۔“ اور سورہ توبہ آیت نمبر: 28 میں اللہ تعالیٰ کا بھی یہی ارشاد ہے کہ: ”إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ“، کہ مشرک تو ناپاک ہی ہوتے ہیں۔ لہذا رسول اللہ ﷺ نے جو اپنے ان تمام آباء واجداد اور ائمہات وجدات کو طاہرین و طاہرات قرار

دیا ہے اس سے دونوں طرح کی طہارت مراد ہے، ایک سفاحت سے پاکیزگی کہ سب کا تعلق باقاعدہ نکاح سے قائم ہوا، غیر اخلاقی اور غیر شرعی طریقے سے نہیں، اور دوسرا شرک اور عقائدِ باطلہ سے پاکیزگی۔

5۔ پس جن آیات و احادیث میں آپ ﷺ کے باپ کے شرک ہونے یا جہنم کے عذاب میں مبتلا ہونے کا ذکر ہے، ان مقامات پر آپ کے حقیقی والد مراد نہیں بلکہ مجازی باپ یعنی چچا مراد ہے، جیسے واذ قال ابراهيم لابيہ ازر اتَّخِذْ اَصْنَامًا الْهٰٓةَ۔ ترجمہ: ”اور (اے رسول! اس وقت کو یاد کیجئے) جب آپ کے (جدِ اعلیٰ) ابراہیم علیہ السلام نے اپنے (مجازی) باپ آزر سے کہا کہ آپ (اپنے خود ساختہ) بتوں کو خدا مان رہے ہیں، (الانعام: 75)۔“ سوال میں جس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے، برسمیل تسلیم اس کی بھی یہی تاویل کی جائے گی۔ اور عربی زبان میں چچا پر باپ (أب) کا اطلاق کیا جاتا ہے، ہمارے ہاں اردو میں بھی ”تایا ابو“ وغیرہ کا استعمال عام ہے۔ اور حدیث مبارک میں بھی ہے: فَأَتَمَّ عَمُّ الرَّجُلِ حَسَنُ أَبِيهِ۔ ترجمہ: ”پیشک ایک شخص کا چچا اس کے باپ ہی کے مرتبے میں ہوتا ہے، (ترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ، باب مناقب اہل البیت)۔“

المخجد میں حَسَنُ اور حَسَنُ کے معنی ہیں: سرگابھائی، چچا یا ایک اصل سے پھوٹنے والی دو شاخیں۔ ماضی قریب کے ایک عالم مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے اپنی تصنیف قصص القرآن میں آزر کو ابراہیم علیہ السلام کا حقیقی باپ قرار دیتے ہوئے استدلال کیا ہے کہ جب حقیقی معنی مراد لیا جاسکتا ہو تو مجازی معنی کی طرف عدول کرنے کی کیا ضرورت ہے اور کونسا قرینہ ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ جب ہم نے عقلی و نقلی دلائل کی روشنی میں ایک اصول طے کر لیا ہے کہ حضور کے آباءِ کرام میں کوئی بھی کافر و شرک نہیں گزرا تو یہی مجاز

کی طرف عدول کا قرینہ بن جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام والدین کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مغفرت کی دعا کرتے ہیں، تو عرض کرتے ہیں: رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ۔ ترجمہ: ”اے ہمارے پروردگار! تو مجھے اور میرے والدین کو بخش دے“، (ابراہیم: 41)۔ ”اب“ کا اطلاق مجازاً چچا پر ہو سکتا ہے، لیکن ”والد“ کا اطلاق صرف حقیقی باپ پر ہی ہو سکتا ہے، جس کے نسب سے وہ پیدا ہوا ہے، چنانچہ علامہ قاضی ثناء اللہ مظہری لکھتے ہیں: فِهَذِهِ الْآيَةُ تَدُلُّ عَلَى أَنَّ وَالِدَيْهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَا مُسْلِمَيْنِ وَإِنَّمَا كَانَ آزَرُ عَمًّا لَهُ وَكَانَ اسْمُ أَبِي إِبْرَاهِيمَ تَارِخَ وَلَا جُلْ دَفَعَ تَوَهُّمَ آزَرَ قَالَ وَالِدَيَّ يَعْنِي مَنْ وَلَدَانِي حَقِيقَةً وَلَمْ يَقُلْ أَبَوَيَّ لِأَنَّ الْآبَ يُطْلَقُ عَلَى الْعَمِّ مَحَازًا۔

ترجمہ: ”یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آپ کے والدین مسلمان تھے اور آزر آپ کا چچا تھا اور آپ کے والد کا نام تاریخ تھا۔ اور اس وہم کو دور کرنے کے لئے کہ باپ سے مراد چچا ہے آپ نے دعائیں ”وَالِدَيَّ“ کا لفظ استعمال کیا، یعنی جنہوں نے مجھے حقیقت میں جنا ہے اور ”أَبَوَيَّ“ کا لفظ استعمال نہیں کیا کیونکہ اب کا لفظ بطور مجاز چچا کے لئے بھی استعمال ہوتا رہتا ہے، (تفسیر مظہری)۔“ واضح ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام چچا مومن نہیں تھے، ایک چچا عبدالعزیٰ ابولہب تو رکیس المشرکین تھا، بلکہ یہ واحد مشرک تھا جس کی مذمت میں قرآن مجید کی ایک مکمل سورت ”الْأَنْفَالُ“ نازل ہوئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ”ابوین کریمین“ کو اللہ تعالیٰ کے دیئے اختیار سے زندہ کیا، ان پر ایمان (توحید و رسالت) کی دعوت پیش کی، انہوں نے اسلام قبول فرمایا اور پھر ان کا ایمان پر وصال ہوا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں: لیکن متاخرین میں علماء نے حضور ﷺ کے والدین کریمین، بلکہ

حضرت آدم علیہ السلام تک آپ کے تمام آباء و ائہات کا ایمان ثابت کیا ہے، اس اثبات کے لئے انہوں نے تین طریقے اختیار کئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سب حضرات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر تھے۔ دوسرا یہ کہ ان حضرات کو دعوت اسلام نہ پہنچی، بلکہ یہ حضرات زمانہ فترۃ میں ہی انتقال کر چکے تھے، ان کو حضور ﷺ کی نبوت کا زمانہ نہ ملا۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ کے والدین کریمین کو خدا تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا سے آپ کے دستِ اقدس پر دوبارہ زندگی عطا فرمائی اور وہ آپ پر ایمان لائے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والدین کے زندہ کرنے کی حدیث اگرچہ اپنی حد ذات میں ضعیف ہے، لیکن متعدد طریق سے اس کی تصحیح اور تحسین کر دی گئی ہے اور یہ بات کو یا متقدمین سے پوشیدہ رہی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت متاخرین علماء پر کھول دی۔ ”واللہ یختص برحمۃ من یشاء“ اس بارے میں رسائل تصنیف کئے اور دلائل سے اس مسئلے کا اثبات فرمایا، مخالفین کے شبہات کے جوابات دیئے۔ ان دلائل اور جوابات کو اگر یہاں نقل کیا جائے تو بات لمبی ہو جائے گی۔ ان کے رسائل میں دیکھ لیا جائے، واللہ اعلم، (اشعۃ اللمعات، جلد: 1، ص: 718، مطبوعہ مطبع: تج کمار، لکھنؤ)۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے ”تبیان القرآن“ جلد سوم میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے، اہل ذوق اس کا مطالعہ فرمائیں۔

اہمیت معاویہ

سوال: 4

میں اسلامیات کی کتاب کا ایک صفحہ منسلک کر رہا ہوں جو saint Josiph اسکول کے O-Level میں پڑھائی جا رہی ہے۔ اس میں حضرت امیر معاویہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں کئی گستاخیاں کی گئی ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں فتویٰ جاری کریں تاکہ مصنف، اسکول اور پبلشر کے خلاف مقدمہ قائم کیا جاسکے۔

نوٹ: انگلش عبارت کا ترجمہ درج ذیل ہے:

21 رمضان کو حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسنؑ کو چالیس ہزار افراد کی رضامندی سے خلیفہ بنایا گیا۔ لیکن حضرت امیر معاویہؓ حضرت امام حسنؑ کو خلیفہ نہیں بنانا چاہتے تھے انہوں نے جاسوس کوفہ بھیجے تاکہ وہاں کے حالات کا پتہ چل سکے۔ حضرت امام حسنؑ کو اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ کو خط لکھا اور اپنی خلافت کا حق بتایا۔ مگر حضرت امیر معاویہؓ نے مزید جاسوس بھیجے اور اس شخص کیلئے جو حضرت امام حسنؑ کو قتل کرے دو ہزار درہم اور اپنی بیٹی نکاح میں دینے کا انعام مقرر کیا۔

آخر میں ایک صلح نامہ ہوا جس کے بعد حضرت امام حسنؑ مسجد میں آئے اور اعلان کیا کہ خون خرابے سے بچنے کیلئے وہ خلافت چھوڑ دیتے ہیں۔

حضرت امیر معاویہؓ کو اس بات سے تسلی نہ ہوئی اور وہ امام حسنؑ کو مارنا چاہتے تھے انہوں نے امام حسنؑ کی زوجہ سے کہا کہ اگر وہ حضرت امام حسنؑ کو زہر دے تو وہ اسکو دو ہزار درہم، دس جوڑے کپڑے سونے کی کشیدہ کاری کئے ہوئے اور کوفہ کی زیتون کے تیل کی تمام پیداوار انعام میں دیں گے اور اس کا نکاح اپنے بیٹے سے کریں گے، (محمد سلیم خمیسہ، شہید ملت روڈ، کراچی)۔

جواب:

استفتاء میں جس نصیبتی عبارت کی نشاندہی کی گئی ہے، یہ حضرت امیر معاویہؓ

رضی اللہ عنہ کی اہانت پر مشتمل ہے اور ان کے کردار کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، کاتب وحی ہیں ایسی عبادت کو نصابی کتب میں شامل کرنا قوم کی بچوں کے عقائد کو مسخ کرنے اور انہیں گمراہ کرنے کی سازش ہے، اس کے ذمہ داروں کو قومی اور دینی مجرم قرار دے کر ان کے خلاف مقدمات قائم کرنا چاہئیں۔

وفاقی و صوبائی وزارت تعلیم کیلئے ضروری ہے کہ ایسی نصابی کتاب کو فو رائے منسوخ کرے، بازار میں موجود اسکے تمام نسخے ضبط کئے جائیں اور مصنف، ناشر اور ناشر کے خلاف کارروائی کی جائے۔ صحابہ کرام ہماری تمام وراثت دینی کے امین ہیں، قرآن و سنت کی حقانیت و حجیت کا مدار صحابہ کرام کی صداقت، عدالت اور امانت کو تسلیم کیے جانے پر ہے، ورنہ ہمارے پاس تمام دینی سرمایہ جس میں کتاب و سنت، عقائد و ایمانیات، ارکان اسلام اور جملہ ضروریات و تفصیلات دین شامل ہیں، غیر مستند، غیر معتبر اور ناقابل اعتبار قرار پائے گا۔ صحابہ کرام کو سب و شتم کرنا، ان کا استخفاف و توہین کرنا حرام ہے، جمہور فقہائے امت کے نزدیک موجب کفر ہے اور ایسے شخص کی ضلالت، فسق و فجور اور مبتدع ہونے پر سب کا اتفاق ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

نومسلم کے ایمان کی غیر یقینی کیفیت

سوال: 5

(۱): اگر غیر مسلم کلمہ پڑھ کر پھر بھی غیر مسلم کے طور طریقوں کو نہ چھوڑے، اور دین کو نہ سیکھے۔ فرائض و واجبات کی ادائیگی کا پاس نہ رکھے۔ غرض اپنا چال چلن اور طور طریقے نہ بدلے تو شرع میں کیا حکم ہے؟

سوال: 6

کوئی غیر مسلم یوں کہتا ہے کہ میں کلمہ تو پڑھ لوں یا جیسے آپ بہتر سمجھتے ہیں (یعنی کلمہ پڑھا دیں یا نہ پڑھائیں)، یعنی غیر مسلم تذبذب کے ملے جلے جذبات رکھتا ہے؟ دلائل و براہین قرآن و سنت کی روشنی میں اس عقدہ کو حل فرمادیں، (حافظ غلام فرید، کراچی)۔

جواب:

ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ دل کی سچائی سے ضروریات دین جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت، کتب الہی، آخرت اور دیگر تمام ضروریات دین پر، جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں، کامل یقین رکھنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا۔ ایمان اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کا نام ہے جو شخص دل سے ضروریات دین کا قائل ہو وہ مسلمان اور مؤمن ہے، اور جس کا دل تصدیق سے خالی ہو وہ کافر ہے۔ دوسرے مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ اس نو مسلم کو احکام شرع کی تعلیم دیں فرائض و واجبات کی ادائیگی کی تعلیم و تلقین کریں پھر بھی اگر وہ اپنی غیر مسلمانہ روش ترک نہ کرے تو محض اس کا دعویٰ مسلمانی قابل قبول نہ ہوگا۔ اعمال صالحہ مثلاً نماز، روزہ وغیرہ کا تارک اور محرمات کا مرتکب فاسق اور گنہگار ہے مگر دائرہ اسلام سے خارج نہیں سمجھا جائیگا۔ اسی طرح جھوٹ بولنے والا شخص اور شراب پینے والا اور دوسری برائیوں کا مرتکب شخص گنہگار کہلائے گا۔ بد عمل مسلمان کو یا اپنی بد عملی کی وجہ سے خود کو کافر کہنے کی بجائے اپنی اصلاح کرنی چاہیے اور دوسرے مسلمانوں کو بھی اصلاح کی طرف راغب کرنا چاہیے، اپنے کفر کا اقرار کفر ہے، لہذا جو شخص خود کو کسی غیر مسلم فرقے سے ظاہر کرے، وہ کافر ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

من كفر بالله من ^أ بعد ايمانه ^آ الا من اكره وقلبه مطمئن ^أ بالايمن ولكن
من شرح بالكفر صدر ^أ فعليه من الله ^ج ولهم عذاب عظيم ^و
ترجمہ: ”جس نے اللہ پر ایمان لانے کے بعد کفر کیا سوا، اس کے جس کو کفر پر مجبور
کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو بلکہ وہ لوگ جو کھلے دل کے ساتھ کفر
کریں تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے، (النحل: 106)۔“
لا تعتذروا قد كفرتم بعد ايمانكم۔

ترجمہ: ”اب عذر نہ پیش کرو، بے شک تم اپنے ایمان کے اظہار کے بعد کفر کر چکے
ہو، (التوبہ: 66)۔“ سوفی المحيط من قال فانا كافرا وفا كفر قال ابوالقاسم
هو كافر من ساعته۔

ترجمہ: ”اور محیط میں ہے کہ جو کہتا ہے کہ میں کافر ہوں یا میں کفر کروں گا، ابوالقاسم نے
کہا: وہ اسی وقت کافر ہو گیا، (شرح فقہ اکبر ص ۱۸۳)۔“

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ومن يرضى بكفر نفسه فقد كفر
ترجمہ: ”اور جو شخص اپنے کفر پر راضی ہو جائے تو وہ کافر ہو جائے گا، (فتاویٰ عالمگیری،
جلد: دوم، ص: ۲۵۷، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔“

علامہ علاؤ الدین ہسکفی لکھتے ہیں: (ويكفر فيهما) لرضاها بالكفر۔
ترجمہ: ”کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے، (رد المحتار علی الدر المختار جلد 5 ص: 393
دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

مذکورہ بالا حوالہ جات کی رو سے اقرار کفر، بھی کفر ہے، تمام تصریحات کا خلاصہ یہ ہے
کہ ایمان محض زبان سے کلمہ پڑھ لینے کا نام نہیں بلکہ دل کی سچائی سے تمام ضروریات

دین جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت، کتب الہی، آخرت اور دیگر تمام ضروریات دین پر، جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں، کامل یقین رکھنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا۔ ایمان اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کا نام ہے جو شخص دل سے ضروریات دین کا قائل ہو وہ مسلمان اور مؤمن ہے۔ اور جس کا دل تصدیق سے خالی ہو وہ کافر ہے اور بے یقینی کی سی کیفیت کے ساتھ یا کسی کی خوشی کی خاطر کلمہ پڑھ لینا ایمان نہیں، واللہ اعلم۔

غیر مسلموں سے معاملات اور ان کی عبادت گاہوں میں جا کر ان کے طریقے سے عبادت کرنا

سوال: 7

ایک مسلمان شخص اپنے کسی عیسائی دوست کی ترغیب پر ان کے معبد (گرجا) میں جاتا ہے اور ان کے ساتھ مل کر انہی جیسی عبادت کرتا ہے اور اس کا یہ کہنا ہے کہ وہ اپنے ایمان پر قائم تھا محض ان کی دلجوئی کے لئے اُس نے ایسا کیا۔ آپ براہ کرم وضاحت فرمائیں کہ کیا اسلامی نقطہ نظر سے اس طرح کرنا جائز ہے؟ اور اس کا یہ عمل اس کے ایمان پر اثر انداز ہوگا کہ نہیں؟، (حافظ غلام مرتضیٰ سیالوی، ضلع انک)۔

جواب :

یہ مسئلہ نہایت اہم ہے، اس لئے ہم صورت مسئلہ سے ہٹ کر اسلام کا اصولی نظریہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ دینی امور میں غیر مسلموں، مبتدعین اور بے دین لوگوں سے تعلق کی دو صورتیں ہیں، ایک مداخلت ہے اور دوسری مداخلت۔ مداخلت شرعاً ممنوع اور حرام ہے اور مداخلت جائز بلکہ اس سے اگر دینی فائدہ ہو سکتا ہے تو شرعاً مطلوب ہے۔ پہلے اس موضوع کے تمام پہلوؤں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے

ارشادات ملاحظہ فرمائیں:

(1) وَذُوالِوَالِدَيْنِ فَيُنْهِنُونَ O ترجمہ: ”انہوں نے یہ چاہا کہ اگر آپ (دین کے معاملے میں) ان سے (بے جا) نرمی کریں تو وہ بھی نرم ہو جائیں گے، (القلم: 9)۔“

(2) وَلَا تَرْكَبُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ۔

ترجمہ: ”اور تم ان لوگوں سے میل جول نہ رکھو، جنہوں نے ظلم کیا ہے، ورنہ تمہیں بھی (دوزخ کی) آگ لگ جائے گی، اور اللہ کے سوا تمہارے کوئی مددگار نہیں ہوں گے، پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی، (ہود: 113)۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ۔

ترجمہ: ”اے ایمان والو! میرے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان کی طرف دوستی کا پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ وہ اس حق کا کفر کرتے ہیں، جو ان کے پاس آچکا ہے، (الممتحنہ: 1)۔“

مداہنت کی تعریف:

مداہنت یہ ہے کہ کوئی مومن خلافِ شرع کوئی برائی دیکھے اور قدرت کے باوجود اس سے منع نہ کرے، روک ٹوک نہ کرے، اس رویے کے محرکات کئی ہو سکتے ہیں، مثلاً (الف) دینی بے غیرتی اور بے حمیت (ب) اس بات سے شرمائے کہ دوسرے اسے دنیانوسی اور قدامت پسند کہیں گے (ج) دنیوی مفاد اور طمع کے سبب کسی بااثر یا باختیار شخص کی خلافِ شرع حمایت کی بنا پر ایسا کرے۔

مدارات کی تعریف:

مدارات یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آئے، بے جا سختی نہ برتے، کسی دینی حکمت یا مصلحت کے تحت نرمی سے پیش آئے۔ اور کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی ظالم و جابر کے ناروا ظلم سے بچنے کے لئے اس سے الجھنے کے بجائے پہلو تہی اختیار کرے۔ ظاہر ہے یہ رخصت ان لوگوں کے لئے ہے جو اہل عزیمت و استقامت نہیں ہوتے، طبعاً کم ہمت ہوتے ہیں، اگرچہ دل سے برائی اور برے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ علامہ ملا علی القاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے مرقات ج: 9، ص: 331 پر اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اُھۃ اللّٰمعات ج: 4، ص: 174 پر اپنے اپنے انداز میں یہ تعریفات بیان کی ہیں، ہم نے ان سے استفادہ کر کے آسان الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔

ایک چیز کافروں سے موالات یعنی دوستی اور محبت کا رشتہ قائم کرنا ہے، اس کی بھی قرآن مین ممانعت آئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ۔

ترجمہ: ”مومن (اپنے) مومن (اہل دین) کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں، (آل عمران: 28)۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةَ مَنْ دُونَكُمْ۔

ترجمہ: ”اے ایمان والو! تم ایمان والوں کے سوا کسی کو اپنا راز دار نہ بناؤ، (آل عمران: 118)۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۚ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ

بعض ^ط و من يتولاهم منكم فانه منهم۔

ترجمہ ”اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ، وہ (مسلمانوں کے خلاف) ایک دوسرے کے حمایتی ہیں اور تم میں سے جو کوئی (مسلمانوں کو چھوڑ کر) انہیں دوست بنائے گا، تو وہ انہی میں سے ہوگا، (المائدہ: 51)۔“

وَلَا تَرْكَبُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمْ النَّارُ۔

ترجمہ: ”اور ظالموں سے میل جول نہ رکھو ورنہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ جلائے گی، (ہود: 113)۔“

غیر مسلموں کے ساتھ روزمرہ کے معاملات

ایک صورت کفار کے ساتھ روزمرہ معاملات کی ہے، جس میں ان کے ساتھ لین دین، تجارتی معاہدات، معاملات کرنا، اگر ایک دفتر یا ادارے میں کام کر رہے ہیں یا محلے میں رہ رہے ہیں، تو کسی، چاہلوسی اور خوشامد کے بغیر محض انسانی بنیادوں پر حسن اخلاق سے پیش آنا، وہ کسی مصیبت یا مشکل میں گرفتار ہوں تو ان کی مدد کرنا، بشرطیکہ وہ کوئی حرام یا شرعاً ممنوع کام نہیں ہے۔ اتفاقاً کوئی صورت پیش آگئی تو ایک ٹیبل یا ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھا لینا، بشرطیکہ اس دسترخوان پر کوئی حرام چیز نہ ہو، بعض اوقات بین المذاہب مکالمہ بھی کرنا پڑتا ہے اور اس کے لئے مجلس کا انعقاد ناگزیر ہے۔ یہ رویہ اسلام کے مفاد میں نہیں ہے کہ غیر مسلم یہ سمجھیں کہ مسلمان ان سے بلاوجہ نفرت کرتے ہیں یا یہ لوگ مردم آزار اور انسانیت دشمن ہیں۔ اسی طرح اگر غیر مسلموں سے شرعی حدود کے اندر معاہدات، معاملات یا کاروبار کیا ہے تو مسلمان کو امانت و دیانت کے اعلیٰ معیار پر فائز ہونا چاہئے، ان کی کسی بھی خیانت، کذب، بد عہدی، ملاوٹ اور بد معاہدگی کی وجہ سے لوگ اسلام پر طعن کریں گے۔ علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

”اور مُعَامَلَتِ مُجْرٌ وہ سوائے مرتدین کے ہر کافر سے جائز ہے جبکہ اس میں کوئی اعانت کفر یا معصیت نہ ہو نہ ہی اضرار اسلام و شریعت (یعنی جس میں شریعت یا اسلام کا نقصان ہو)، ورنہ ایسی معاملت مسلم سے بھی حرام ہے چہ جائیکہ کافر سے، قال تعالیٰ: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ ترجمہ: ”گناہ و ظلم پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، (المائدہ: 2)“، (تبیان القرآن، جلد: 11، ص: 844)۔“

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

”موالات و محرمات و معاملات میں زمین و آسمان کا فرق ہے، دنیوی معاملت جس سے دین پر ضرر نہ ہو سو امرتدین کے کسی سے ممنوع نہیں، ذمی (اسلامی ریاست کا غیر مسلم شہری) تو معاملت میں مثل مسلم ہے: لَهُمْ مَالُنَا وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَيْنَا۔ ان کے لئے وہی (حقوق) ہیں جو ہمارے لئے ہیں اور جو (فرائض) ان پر ہیں وہی ہم پر ہیں، (یعنی دنیاوی منافع میں ہماری طرح ان کو بھی حصہ دیا جائے گا اور دنیوی مواخذہ ان پر بھی وہی ہوگا جو ایک مسلمان پر کیا جائے گا)۔ اور غیر ذمی سے بھی خرید و فروخت، اجارہ و استیجار، ہبہ و استیہاب (یعنی ہبہ کا لین دین) بشرطہا (اپنی شرعی شرائط کے مطابق) جائز اور خریدنا مطلقاً ہر مال کا، کہ مسلمان کے حق میں مقبوم ہو اور بیچنا ہر جائز چیز کا جس میں اعانتِ حرب (یعنی مسلمانوں کے خلاف جنگی مدد کرنا) اور اہانتِ اسلام نہ ہو، اسے نوکر رکھنا جس میں کوئی کام خلافِ شرع نہ ہو، اس کی جائز نوکری کرنا جس میں مسلم پر اس کا استعلا (یعنی اسے دینی امور میں بالادستی دے دی جائے) نہ ہو، ایسے ہی امور میں اجرت پر اس سے کام لینا یا اس کا کام کرنا بمصلحت شرعی اسے ہدیہ دینا جس میں کسی رسم کفر کا اعزاز نہ ہو، اس کا ہدیہ قبول کرنا جس سے دین پر اعتراض نہ ہو، حتیٰ کہ کتابیہ سے نکاح کرنا بھی فی نفسہ حلال ہے، وہ

صلح کی طرف جھکیں تو مصالحت کرنا مگر وہ صلح (منع ہے) جو حلال کو حرام کرے یا حرام کو حلال، یونہی ایک حد تک معاہدہ اور مواعدت کرنا بھی اور جو جائز عہد کر لیا اس کی وفا فرض ہے اور غدر (دھوکہ دینا) حرام الی غیر ذلک من الاحکام، (فتاویٰ رضویہ، ج: 14، ص: 420، 421 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“

مسلمانوں کا غیر مسلموں کے عبادت خانوں میں جا کر ان کے طریقے پر عبادت کرنا حرام ہے اور اگر وہ طریقہ اپنی وضع کے اعتبار سے کفر ہے جیسے بتوں کے سامنے سجدہ کرنا یا آگ کی پرستش کرنا یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مجسمے کے آگے سجدہ کرنا تو یہ کفر ہے۔ اور اس میں یہ عذر مقبول نہیں ہوگا کہ دل میں ایمان ہے اور محض غیر مسلم کی دل داری کے لئے ایسا کیا ہے، شریعت کے احکام کا اطلاق ظاہر حال پر ہوتا ہے۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے ہندوؤں کے ساتھ مندر میں عبادت کئے جانے کی بابت سوال ہوا، آپ نے جواب میں لکھا:

الاشباہ والنظائر میں ہے: عبادة الصنم كفر ولا اعتبار بما في قلبه و كذا لو تزور بزار اليهود والنصارى دخل كنيسهم اولم يدخل۔

ترجمہ: ”بت کی پوجا کرنا کفر ہے اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں اور اسی طرح اگر کسی نے یہودیوں اور عیسائیوں کا زنا رگلے میں باندھا (اس نے بھی کفر کیا)، خواہ وہ ان کے گرجوں (چرچ) میں داخل ہو یا نہ ہو، (۲) سائل یہ پوچھتا ہے کہ وہ حرکات ملعونہ جائز ہیں یا نہیں، یہ پوچھے کہ کفر ہے یا نہیں، ان کی عورتیں نکاح سے نکلیں یا نہیں ان حرکات سے، جامع الفصولین منہج الروض الازہر میں ہے: من خرج الی السلسلة (قال القاری ای مجمع اهل الکفر) کفر لان فیہ اعلان

الكفر وكذبه اعدان عليه.

ترجمہ: ”جو کوئی (دارالاسلام کو چھوڑ کر) کفار و مشرکین کے مجمع میں جائے (التسلية، محدث و فقیہ ملا علی قاری نے فرمایا: اس کا معنی مجمع اہل کفر ہے) تو وہ کافر ہو گیا، کیونکہ اس میں کفر کا اعلان ہے، کو یا وہ کفر پر ان کی امداد کر رہا ہے، وہ مزید لکھتے ہیں: کفر کے اہتمام میں شریک ہونا اور اس پر راضی ہونا کفر ہے، الرضا بالكفر کفر (کفر پر راضی ہونا کفر ہے) وہ لوگ اسلام سے نکل گئے اور انکی عورتیں ان کے نکاح سے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 21، ص: 296، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: فی ”التاثر خانیة“: یکره للمسلم الدخول فی البیعة والکنیسة، وإنما یکره من حیث انه مَجْمَعُ الشیاطین لا من حیث انه لیس له حق الدخول قال فی ”البحر“ والظاهر انها تحریمة لانها المرادة عند اطلاقهم، وقد اُفتیت بتعزیر مسلم لازم الكنيسة مع الیهود۔ فاذا حرمت دخول فالصلوة اولیٰ۔

ترجمہ: ”تاثر خانہ میں ہے: یہودیوں کی عبادت گاہ اور عیسائیوں کے گرجے (چرچ) میں کسی مسلمان کا داخل ہونا مکروہ ہے اس لئے کہ وہ شیاطین کے جمع ہونے کی جگہ ہے اس لئے نہیں کہ وہاں داخل ہونے کا حق نہیں ہے ”بحر الرائق“ میں فرمایا ظاہر یہ ہے کہ کراہت سے مراد کراہت تحریمی ہے کیونکہ جب مطلقاً مکروہ بولا جائے، تو اس سے ”کراہت تحریمی“ مراد ہوتی ہے، (فقہاء کرام نے) ایسے مسلمان کو سزا دینے کا فتویٰ دیا ہے جو یہودیوں کے ساتھ ان کے معبد (گرجا) میں مستقل آنا جاتا رہتا ہو، پس جب وہاں داخل ہونا حرام قرار پایا، تو نماز پڑھنا بدرجہ اولیٰ حرام ہے، (رد المحتار علی الدر المختار جلد 2، ص: 40، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“ البتہ یہود و نصاریٰ

کے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ مکالمے کے لئے مسلمانوں کے رہنما ان کی عبادت گاہوں میں جائیں، مشترکہ عبادت مقصود نہ ہو بلکہ ان کے طریق عبادت کا مشاہدہ مقصود ہو، تو یہ مباح ہے۔ غیر مسلم ممالک میں بعض اوقات مسلمانوں رہنماؤں کو غیر مسلم مذہبی رہنماؤں کے ساتھ امن اور عدل کے مشترکہ مقاصد کے لئے بیٹھنا پڑتا ہے، اس کی رخصت ہے۔ اسی طرح اگر اہل مذاہب سماوی دنیا میں ریاستی و گروہی ظلم اور جبر و تشدد کے خلاف بلا امتیاز مذہب انسانیت کے مفاد میں مشترکہ آواز بلند کریں، تو اس کی رخصت ہے۔

آثارِ قیامت میں ”تقاربِ زمانی“ کا مفہوم

سوال: 8

رسول اللہ ﷺ نے جو مختلف آثارِ قیامت بیان فرمائے ہیں، ان میں ایک یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ”زمانے میں قربت ہو جائے گی“ اس سے کیا مراد ہے؟، (محمد انس محبوب، ایبٹ آباد)

جواب :

یہ درست ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے علاماتِ قیامت متعدد بیان فرمائی ہیں، جنہیں اصطلاحِ محدثین میں ”أشراط الساعة“ کے عنوان کے تحت کتب احادیث میں جمع فرمایا ہے، انہی روایات میں ہے: عن انس بن مالك قال: قال رسول الله ﷺ: لا تقوم الساعة حتى يتقارب الزمان فتكون السنة كالشهر والشهر كالجمعة وتكون الجمعة كالיום ويكون اليوم كالساعة وتكون الساعة كالضربة۔

ترجمہ: ”حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت

مت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ زمانہ باہم قریب ہو جائے گا، پھر سال مہینے کی طرح ہو جائے گا اور مہینہ ہفتے کی طرح، اور ہفتہ دن کی مانند اور دن ایک گھڑی کی مانند اور ایک گھڑی چنگاری کی مانند ہو جائے گی، (سنن الترمذی، رقم الحدیث: 2332 مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت)۔“

”قارب زمانی“ کے حقیقی اور قطعی معنی کیا ہیں؟، یہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ ہی کو معلوم ہے، لیکن ہماری فہم ناقص میں جو معنی و مفہوم بظاہر مراد ہو سکتے ہیں، وہ یہ ہیں:

(1) یہ کہ زمانے سے برکت اٹھ جائے گی، اور مقاصد خیر کے لئے اس کی افادیت کم ہو جائے گی۔

(2) لوگ اپنے مشاغل دنیا اور ہولعب میں اس قدر مشغول ہو جائیں گے کہ اعمال خیر اور فکر آخرت کے لئے ان کے پاس فرصت ہی نہیں ہوگی، ترغیبات دنیا میں مشغولیت، فراوانی تعیشات، فواحش و منکرات کا عام ہونا اور خواہشات نفس کے پیروکاروں کے لئے ان کا حصول آسان ہونا اور ان میں ہمہ وقتی انہماک، کثرت مال کی خواہش اور حصول، ان لذات میں انسان اتنا کھو جائے گا کہ اسے سال مہینوں میں، مہینے ہفتوں اور ہفتے دنوں میں اور دن لمحوں میں اور لمحے آگ کے شراروں تک گزرتے ہوئے محسوس ہوں گے، لیکن لذت کام و دھن، ہوائے نفس اور جنسی شہوات کی پیاس بجھ نہیں پائے گی۔

(3) جس طرح رنج و الم، درد و کرب اور آفت و بلا کے زمانے میں ایک ایک پل کا گزرنہ دشوار ہو جاتا ہے، لگتا ہے کہ وقت ٹھہر گیا ہے، ایک ایک گھڑی قیامت بن کر گزر رہی ہے، حالانکہ کمیت کے اعتبار سے شب و روز اور مہ و سال کے پیمانے وہی

ہوتے ہیں، گردشِ لیل و نہار کا دورانیہ وہی رہتا ہے، لیکن مصیبت کا ایک ایک پل بھاری ہو جاتا ہے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے وقت یا مکان کی مقدار اور ظرفیت تو وہی رہتی ہے، لیکن برکت سے کیفیتِ اجرا و مقدارِ اجر میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔
ذیل میں احادیث ملاحظہ کیجئے:

(1) عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ فی الجماعۃ تضعف علیٰ صلوٰتہ فی بیتہ وفی سورۃ خمس او عشرین ضعفا۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی شخص کے گھر پر یا بازار میں نماز پڑھنے کے مقابلے میں باجماعت نماز پڑھنے کا ثواب پچیس گنا زیادہ ہے، (صحیح بخاری و مسلم)۔“

(2) عن عبد اللہ بن عمر قال: قال رسول اللہ ﷺ: صلوٰۃ الجماعۃ تفضل صلوٰۃ الفرد بسبع وعشرین درجۃ۔

ترجمہ: ”عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: باجماعت نماز کا ثواب انفرادی نماز سے ستائیس درجے زیادہ ہے، (صحیح بخاری و مسلم)۔“

(3) عن انس بن مالک قال: قال رسول اللہ ﷺ: صلوٰۃ الرجل فی بیتہ بمصلوٰۃ و صلوٰتہ فی مسجد القبائل بخمس وعشرین صلوٰۃ و صلوٰتہ فی مسجد الذی یجمع فیہ بخمس مائۃ صلوٰۃ و صلوٰتہ فی المسجد الاقصیٰ بخمسين الف صلوٰۃ و صلوٰتہ فی مسجد ی بخمسين الف صلوٰۃ و صلوٰتہ فی المسجد الحرام بمائۃ الف صلوٰۃ۔

ترجمہ: ”انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی

شخص کے گھر پر (فرض) نماز پڑھنے کا ثواب ایک نماز کے برابر ہے، اور اس کا اپنے (محلے یا) قبیلے کی مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب 25 نمازوں کے برابر ہے، اور اس جامع مسجد میں پڑھنے کا ثواب 500 نمازوں کے برابر ہے، اور اس کا مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور اس کا مسجد الحرام میں نماز پڑھنے کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے، (ابن ماجہ)۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ عبادت ایک ہی ہے لیکن مقامات کے اعتبار سے اجر و ثواب کے پیمانے بڑے ہو جاتے ہیں، اسے ہم برکت سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے: شب قدر کی فضیلت ایک ہزار مہینوں کے برابر ہے (سورۃ القدر: 3)۔

تقارب زمانی کا ایک معنی یہ ہو سکتا ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے اپنی درمیانی انگلی اور شہادت کی انگلی کو کشادہ کر کے فرمایا: بعثت انا والساعة كهاتين و جمع بين اصبعيه۔ ترجمہ: ”میرے اور قیامت کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے، جیسے میری ان دو انگلیوں کے درمیان“، (سنن ابن ماجہ: رقم الحدیث 4040 دار الفکر، بیروت)۔

قرآن نے بھی فرمایا: اقتربت الساعة وانشق القمر۔ ترجمہ: ”قیامت قریب آگئی اور چاند شق ہو کر (دو ٹکڑے) ہو گیا، (سورۃ القمر: 1)۔“۔ دراصل انگشت ہائے مبارک کا درمیانی فاصلہ اگرچہ کم ہے، لیکن آپ نے پورے کرۂ زمین کا نقشہ بنا ہوا دیکھا ہوگا جو چند فٹ کے کاغذ پر سما جاتا ہے، مگر اس میں نیچا سکیل لکھا ہوتا ہے، کہ اس نقشے میں ایک انچ کی لکیر کئی ہزار میٹر کو تعبیر کر رہی ہے، ہو سکتا ہے کہ یہی کیفیت حضور ﷺ کی مبارک انگلیوں کے درمیانی فاصلے کی ہو۔ (4) چونکہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم غیب سے معلوم تھا کہ ابتدائے تخلیق کائنات سے آپ کے عہد مبارک تک کتنا طویل عرصہ گزر چکا ہے، اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے کروڑ سال گزر چکے ہیں، ماہرین

ارضیات اپنے علم طبیعیات و ارضیات کے مطابق بعض چیزوں کی عمر کروڑوں سال بتاتے رہتے ہیں، تو علم نبوت میں ان کروڑوں سال کے مقابلے میں قیام قیامت تک اتنی ہی مدت باقی ہو جسے آپ نے تقابل کرتے ہوئے دوائیوں کے درمیانی فاصلے سے تعبیر کیا، اور جوں جوں قیامت قریب ہوتی چلی جائے گی، کائنات کی عمر اپنی کل مدت تخلیق کے اعتبار سے اسی طرح سمٹی ہوئی نظر آئے گی۔

زمانے کو برا کہنے کی ممانعت

سوال : 9

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ غلطی کرتے ہیں، گناہ کرتے ہیں، انہیں اس پر ٹوکا جائے تو یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ کیا کریں زمانہ ہی برا ہے، پہلے کہتے تھے ”چودھویں صدی ہے“، اب کہتے ہیں: ”پندرہویں صدی ہے“ یہ سب کچھ تو ہونا ہے، کیا یہ رویہ یا طرز عمل درست ہے؟، شریعت مطہرہ اور کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیجئے، (نعیم الرحمن، کوہاٹ)۔

جواب :

یہ سوچ، یہ انداز فکر بالکل غلط اور باطل ہے، یہ وہی فریب نفس ہے اور اغواء نفس ہے جس سے بچنے کے لئے رسول اللہ ﷺ اپنے خطبے میں تعلیم امت کے لئے ارشاد فرمایا کرتے تھے: ”تَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّ رِوَاغِ نَفْسِنَا“ یعنی اے اللہ! ہم اپنے نفس کی شرارتوں اور فکری کجروی سے تیری پناہ میں آتے ہیں۔ ”زمانہ“ کیا ہے، گردش لیل و نہار کا نام ہے، مرور ایام کا نام ہے، دنوں، ہفتوں اور ماہ و سال کے گزرنے کا نام ہے، سورج وہی ہے، چاند وہی ہے، زمین وہی ہے، نظام قدرت بھی وہی ہے، لہذا زمانے کا کیا قصور؟ قصور ہر شخص کا اپنا ہے، کوئی ہی عمل ہر ایک کی اپنی ہے

اور ہر ایک اپنے عمل کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جوابدہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کل نفس بما کسبت رہیں۔

ترجمہ: ”ہر شخص اپنے اعمال کے عوض رہن ہے“، (الطور: 21)۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”کل نفس بما کسبت رہینا“، ترجمہ ”ہر شخص اپنے عمل کے بدلے رہن ہے“، (المدرثر: 38)۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا“، ترجمہ: ”بلاشبہ (قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی) سماعت بصر رت اور فہم و ادراک (کی ساری صلاحیتوں) کے بارے میں باز پرس ہوگی“، (بنی اسرائیل: 36)۔ لہذا کسی شخص کا اپنی کوتاہی و غفلت و عمل کے لئے زمانے کو برا کہنا یا اسے جواز بنانا ہرگز درست نہیں ہے، حدیث پاک میں ہے: عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قال النبی ﷺ: ”قال اللہ یغذینی ابن آدم، یسب الدھر وانا الدھر، بیدی الامر، اقلب اللیل والنهار۔“

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بنی آدم مجھے اذیت دیتا ہے، (وہ اس طرح کہ) وہ دھر (زمانے) کو گالی دیتا ہے، حالانکہ ”دھر“ تو میں ہوں، زمانے پر قبضہ و اختیار میرا ہی ہے، گر دس ویل و نہار میں کرتا ہوں، (صحیح بخاری و مسلم رقم الحدیث 6181-7491)۔“ اس حدیث کی شرح میں علامہ بیہقی بن شرف الدین نووی لکھتے ہیں: اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: انما الدھر (یعنی میں زمانہ ہوں) اور یہ اطلاق مجازی ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ میں زمانے اور زمانے کے اندر پیدا ہونے والے حوادث و واقعات کا خالق ہوں، اس کا سبب یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں

لوگوں کی عادت تھی کہ جب کوئی اندوہناک حادثہ ہوتا تو وہ زمانے کو برا کہتے تھے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: زمانے کو برا مت کہو، کیونکہ جن مصائب و حوادث کی بنا پر تم زمانے کو برا کہہ رہے ہو، وہ تمام حوادث اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے ہیں، کیونکہ وہی ہر چیز کا خالق ہے، (شرح صحیح مسلم للنووی ج 2 ص 237 مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی) اس حدیث کی شرح میں علامہ امام حافظ بن احمد بن علی بن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: ایک روایت میں یہ بھی ہے: *ولا تقولوا اخینة الدهر*، یعنی یوں نہ کہو کہ ہائے زمانے کی محرومی، ناکامی، آگے چل کر وہ فرماتے ہیں: زمانے کو برا کہنے سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا رد ہے جو زمانے کو حوادث و آفات کا فاعل حقیقی یا مؤثر حقیقی مانتے ہیں، یہ نظریہ باطل ہے، کیونکہ فاعل حقیقی تو صرف اللہ تعالیٰ ہے، جب مصائب نازل کرنے والے کو برا کہو گے، تو یہ ”برا کہنا“ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے گا، لہذا اس حدیث کے ظاہری کلمات کی تین تاویلیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی زمانے میں ہونے والے جملہ امور کی تدبیر فرمانے والا ہے، دوسری یہ کہ: اللہ تعالیٰ ہی زمانے کا مالک و مختار ہے، تیسری یہ کہ: اللہ تعالیٰ ہی گردش لیل و نہار فرمانے والا ہے، اسی لئے ان کلمات کے بعد فرمایا: ”بیدی اللیل والنہار“، شب و روز کا نظام میرے دست قدرت میں ہے، (فتح الباری، شرح صحیح البخاری، ج 10 ص 564-565)۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: *یقلب اللہ اللیل والنہار ان فی ذالک لعبرة لا ولی الا بصار*۔

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ گردش لیل و نہار کا (نظام) فرماتا ہے، بلاشبہ اس میں اہل عقل و خرد کے لئے (بڑی) نصیحت ہے، (النور: 44)۔“

﴿کتاب الطہارۃ﴾

غسل کے بعد وضو

سوال: 10

پاک ہونے کے لئے غسل کا طریقہ کیا ہے؟ کیا غسل کرنے کے بعد وضو کرنا ضروری ہے؟، (عبدالجبار پر دیسی، لائڈھی)۔

جواب:

آپ کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ غسل واجب کا طریقہ دریافت کر رہے ہیں، ناپاکی یا جنابت کی حالت میں غسل کا طریقہ یہ ہے: پہلے دونوں ہاتھ گٹوں تک دھوئیں، بدن پر جہاں کہیں نجاست لگی ہو، اس کو دور کریں، پھر وضو کریں، پھر تین مرتبہ واسنہ کدھے پر اور تین مرتبہ بائیں کندھے پر پانی بہائیں، پھر سر پر اور تمام بدن پر تین مرتبہ پانی بہائیں۔ اور اگر ایک ساتھ سارے بدن پر تین مرتبہ پانی بہا دیا، جیسے آج کل شاور کے نیچے غسل کرتے ہیں تو بھی درست ہے اور کسی نہریا بڑے تالاب میں بھی غسل کر سکتے ہیں۔

عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت کانت رسول اللہ ﷺ اذا اغتسل من الجنابة دعابشئى نحر الحلاب فاخذ بكفه بدأ بشق رأسه الايمن، ثم الايسر، ثم اخذ بكفيه فقال بهما على رأسه۔

ترجمہ: ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب غسل جنابت کا ارادہ کرتے تو (دو دھدان کی قسم کا) ایک برتن منگواتے، پھر اس سے پانی لے کر پہلے سر کی دائیں جانب دھوتے، پھر بائیں جانب، پھر دونوں ہاتھوں سے پانی لے کر سر پر بہاتے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 710)۔“ غسل جنابت میں کلی کرنا اور ناک میں اندر تک پانی ڈالنا فرض ہے، غسل طہارت اور غسل مسنون میں فرض نہیں

سنت ہے۔ غسل کرنے کے بعد نماز پڑھنے کے لئے وضو کی ضرورت نہیں رہتی، اگر غسل میں پورے بدن پر پانی ڈالنے سے پہلے صحیح طریقے سے کلی کر لی ہے اور ناک میں پانی ڈال لیا ہے، تو اب غسل کے بعد وضو کی ضرورت نہیں ہے، غسل کے لئے نیت کرنا سنت ہے۔

بچے کی پیدائش کے بعد زچہ اور بچہ کا غسل

سوال: 11

کئی ایک گھرانوں میں جب بچے کی پیدائش ہوتی ہے، تو پیدائش کے وقت بچے کو غسل دینے کے بعد چالیس روز تک نہ ماں غسل کرتی ہے، اور نہ ہی بچے کو غسل دیا جاتا ہے، کیا یہ عمل صحیح ہے یا غلط؟، (برکت علی، گلشن اقبال، کراچی (معرفت دین و دانش، روزنامہ ایکسپریس)۔

جواب:

بچے کی پیدائش کے بعد ضرورت کے وقت اس بچے کو غسل دینے کی کوئی ممانعت نہیں ہے اور یہ نظریہ غلط ہے کہ ایک مرتبہ غسل دینے کے بعد اسے دوبارہ غسل نہیں دے سکتے، سوائے اس کے کہ ڈاکٹر طبی طور پر غسل دینے کو اس کے لئے نقصان دہ قرار دے۔ بچے کی پیدائش کے بعد ماں (زچہ) کے رحم سے جو خون جاری ہوتا ہے، اس کو نفاس کہتے ہیں، شرعی اعتبار سے نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے، اگر چالیس دن تک اس کا خون جاری رہتا ہے تو اس عرصے میں وہ شرعی طور پر ناپاک رہے گی، اور ان ایام میں وہ نماز نہیں پڑھے گی اور نہ ہی بعد میں اس پر ان نمازوں کی قضا ہے، اسی طرح اس کے لئے قرآن کو چھونا اور زبانی قرآن کی تلاوت کرنا بھی منع ہے، البتہ کلمات قرآن بطور ذکر، تسبیح و دعا پڑھ سکتی ہے۔ اگر خون چالیس دن کے بعد بھی جاری رہتا ہے تو اب یہ ”نفاس“ نہیں ہے، بلکہ وہ غسل کر کے پاک ہو جائے اور نمازوں کا سلسلہ شروع کر دے، ہاں اگر خون اتنی دیر بھی نہ رکتا ہو کہ ایک وقت کی

نماز پڑھ لے، تو ہر نماز کے لئے تازہ وضو کر کے نماز پڑھ لیا کریں (وضو سے پہلے خون آلود مقام دھولیں)، اور اس وقت کے اندر مزید جتنی قضا نمازیں، نوافل وغیرہ پڑھ سکتی ہوں، پڑھ لیں اور تلاوت بھی کر سکتی ہیں۔ شرعاً نفاس کی کم از کم کوئی مقرر مدت نہیں ہے، بس جس دن خون رک جائے، وہ غسل کر کے پاک ہو لے اور نماز کا سلسلہ شروع کر دے، اگر نہیں کرے گی، تو گنہگار ہوگی اور وہ نمازیں اس کے ذمے قضا ہوں گی۔ تاہم جب تک نفاس کا سلسلہ جاری ہے، وہ شرعی پاکی کے لئے تو غسل نہیں کرے گی، البتہ جسمانی میل پسینہ دور کرنے کے لئے، طبیعت کے تکرار اور انقباض کو دور کرنا چاہے تو غسل کر سکتی ہے۔

نَفْسِ اسْلَام

WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿کتاب الصلوة﴾

طلوع آفتاب سے پہلے نماز عید

سوال: 12

طلوع آفتاب ہونے پر کتنی دیر تک نماز پڑھنا مکروہ ہے؟ ایک دیوبندی امام نے نماز عید الاضحیٰ کی جماعت صبح سات بج کر پچیس منٹ پر کھڑی کر دی جبکہ اس روز طلوع آفتاب سات بج کر سترہ منٹ پر تھا۔ کیا ان کی نماز عید ہوگئی یا نہیں؟ نیز کورنگی میں واقع دارالعلوم کراچی کے نماز سے متعلق نظام الاوقات کے نقشے کے مطابق طلوع آفتاب کے بعد صرف دس منٹ تک نماز پڑھنا مکروہ ہے جبکہ ہم اہلسنت وجماعت کے یہاں طلوع آفتاب سے لے کر بیس منٹ تک مکروہ وقت ہے، جیسا کہ بہار شریعت وغیرہ کتب میں مذکور ہونے کے ساتھ ساتھ عمل بھی اسی پر ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس مسئلہ پر تفصیلی اور مدلل روشنی ڈالیں، (عبداللہ قادری، کراچی)۔

جواب:

اوقات مکروہہ (طلوع، غروب اور نصف النہار شرعی) ان تینوں وقتوں میں کوئی نماز نہ فرض نہ واجب نہ نفل نہ ادا نہ قضا یونہی سجدۂ تلاوت بھی جائز نہیں ہاں اگر اس دن کی نماز عصر ادا نہ کی ہو تو اگرچہ سورج غروب ہو رہا ہو تو بھی پڑھ لے۔
علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ثلاث ساعات لا تجوز فيها المكتوبة ولا صلاة الجنابة ولا سجدة التلاوة اذا طلعت الشمس حتى ترتفع وعند الانتصاف الى أن تزول وعند احمرارها الى أن تغيب ألا عصر يومه ذالك فانه

يجوز اداؤه عند الغروب هكذا في فتاوى قاضى خان۔

ترجمہ: ”تین ساعتیں جن میں کسی قسم کی نماز، نماز جنازہ، سجدہ تلاوت جائز نہیں، جب سورج طلوع ہونا شروع ہو یہاں تک کہ بلند ہو جائے اور نصف النہار شرعی سے نصف النہار حقیقی یعنی آفتاب ڈھلنے تک ہے، آفتاب کے زرد ہونے سے غروب تک مگر یہ کہ اس دن کی نماز عصر غروب کے وقت بھی پڑھ لے، فتاویٰ قاضی خان میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 54 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

”جب سے آفتاب کی کرن چمکے اس وقت سے بیس منٹ گزرنے تک نماز ناجائز اور وقت کراہت ہوا، اور ادھر جب غروب کو بیس منٹ رہیں، وقت کراہت آجائے گا، اور آج کی عصر کے سواء ہر نماز منع ہو جائے گی، (فتاویٰ رضویہ جلد: 5 ص: 138، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“ سائل کے مطابق مذکورہ دیوبندی امام نے سات بج کر پچیس منٹ پر عید کی نماز کھڑی کر دی، یہ نماز مکروہ ہوئی، کیونکہ طلوع آفتاب اور نماز میں آٹھ منٹ کا وقفہ ہوا اور امام احمد رضا قادری کے نزدیک طلوع آفتاب کے کم از کم بیس منٹ بعد نماز پڑھنی چاہئے، اس سے پہلے پڑھی تو مکروہ ہوگی۔ دارالعلوم کراچی کے نظام الاوقات کو بھی اگر صحیح مان لیا جائے، تو اس کی رو سے بھی طلوع آفتاب کے دس منٹ بعد تک نماز پڑھنا مکروہ ہے، اور استفتاء میں درج صورت مسئلہ کے مطابق مذکورہ امام نے طلوع آفتاب کے آٹھ منٹ بعد نماز عید کی جماعت کھڑی کی، لہذا سب کی نماز مکروہ ہوئی اور اس کی ذمہ داری امام پر عائد ہوتی ہے۔ نماز عید سے متعلق علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ووقت صلاة العیدین من حين تبيض الشمس الى ان تروى كذا في المراجعة و كذا في

النبيين۔ والافضل أن يعجل الاضحى ويؤخر الفطر كذا في الخلاصہ۔

ترجمہ: ”اور نماز عیدین کی ادائیگی جب سورج روشن ہو جائے، سے اس کے زوال (نصف النہار شرعی) تک ہے، ”سراجیہ“ اور ”تبیین“ میں اسی طرح ہے عید الاضحیٰ میں جلدی اور عید الفطر میں تاخیر کرنا افضل ہے، ”خلاصہ“ میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 150 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

طلوع سے مراد آفتاب کا کنارہ ظاہر ہونے سے اس وقت تک ہے کہ اس پر نگاہیں خیرہ ہونے لگیں جس کی مقدار کنارہ چمکنے سے بیس منٹ تک ہے۔

تارکِ صلوٰۃ کا شرعی حکم

سوال: 13

بے نمازی کے لئے شریعت میں کیا حکم ہے؟، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ترک نماز کرنے والا کافر ہو جاتا ہے؟، (محمد عمیر، بلد یہ ناؤن کراچی)۔

جواب:

نماز اسلام کا بنیادی رکن ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کو بیان کرتے ہوئے تو حید و رسالت کی شہادت کے بعد نماز کا ذکر فرمایا۔ قرآن میں ترک نماز پر بڑی وعید آئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسُوفَ يَلْقَوْنَ غَيَّاطٍ

(1) ترجمہ: ”پھر ان کے بعد ایسے ناخلف آئے، جنہوں نے نمازیں ضائع کیں اور خواہشات کی پیروی کی، تو عنقریب وہ (جہنم کے گڑھے) غی میں جا گریں گے، (مریم:

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۖ إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ ۖ فِي جَنَّاتٍ يَتَسَاءَلُونَ
عَنِ الْمُجْرِمِينَ ۖ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ ۖ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ
وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۖ

(2) ترجمہ: ”ہر شخص اپنے عمل کے بدلے میں گروہی ہے، سوائے دائیں طرف والوں کے، وہ جنتوں میں (ہوں گے اور) مجرموں کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں گے، (پھر وہ مجرموں سے کہیں گے) کون سا جرم تمہارے دوزخ میں داخل ہونے کا سبب بنا؟، وہ کہیں گے، ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے، اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، (المائدہ: 44-38)۔“

وَيُؤْتِي الْمُضَافِينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝

(3) ترجمہ: ”سوان نمازیوں کے لئے ہلاکت ہے جو اپنی نمازوں سے غفلت کرتے ہیں، (الماعون: 4-5)۔“

إِنَّ الْمُتَافِقِينَ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كَسَالَى يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا ط

(4) ترجمہ: ”بے شک منافق اپنے (زعم میں) اللہ کو دھوکہ دے رہے ہیں، وراں حالیکہ اللہ ان کو دھوکے کی سزا دینے والا ہے، اور جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی (اور بے دلی) سے اور وہ اللہ کا ذکر (تو) بہت ہی کم کرتے ہیں، (النساء: 142)۔“

علامہ علاؤ الدین ہسکفی لکھتے ہیں: (ہی فرض عین علی مکلف۔۔۔۔۔ ویکفر

جراحی‌ها) لب‌وتها بلمیل قطعی (و تارکها عمدا مجازة) ای تکاسلا فاسق

(يحبس حتى يصلي) لانه يحبس لحق العبد لحق الحق احق - الخ

ترجمہ: ”ہر مکلف یعنی عاقل و بالغ پر نماز فرض عین ہے، اس کی فرضیت کا منکر کافر کیونکہ نماز کا ثبوت دلیل قطعی سے ہے اور جو قصداً چھوڑے، (اگرچہ ایک ہی وقت کی)، وہ فاسق ہے، (جو نماز نہ پڑھتا ہو) اسے قید کیا جائے گا، یہاں تک کہ (وہ توبہ کرے) اور نماز پڑھنے لگے، کیونکہ جب بندے کے حق کی وجہ سے قید کیا جاتا ہے تو اللہ کا حق اس کا زیادہ حقدار ہے کہ (اس کی نافرمانی پر) اسے قید کیا جائے۔

نمازی کے حکم کے بارے میں ائمہ کے اقوال نقل کرتے ہوئے علامہ شامی لکھتے ہیں:

(قولہ وعند الشافعی يقتل) و كذا عند مالك و احمد وفي رواية عن احمد وهي المختارة عند جمهور اصحابه انه يقتل ككفر او بسط ذلك في الحلية۔
ترجمہ: ”صلاہ در مختار کا قول کہ وعند الشافعی يقتل یعنی امام شافعی کے نزدیک بے نمازی کو قتل کیا جائے گا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے اور یہی مذہب امام احمد بن حنبل کا بھی ہے اور امام احمد بن حنبل سے ایک قول جو کہ ان کے اصحاب کے نزدیک قول مختار بھی ہے یہ منقول ہے کہ (بے نمازی کو) ان کے کافر ہونے کی وجہ سے قتل کیا جائے گا اور حلیہ میں اس مسئلے کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، (رد المحتار علی الدر المختار جلد 2 ص: 7، 6 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

اسی طرح احادیث مبارکہ میں بھی ترک نماز پر وعید آئی ہے:

(1) عن جابر قال: قال رسول الله ﷺ: بين العبد وبين الكفر ترك الصلوة۔
ترجمہ: ”بندے اور کفر کے درمیان فرق نماز کا ترک ہے، (مشکوٰۃ: بحوالہ صحیح مسلم)۔“

(2) عن عبد الله بن شقيق قال: كان اصحاب رسول الله ﷺ لا يرون

شیئامن الاعمال ترکہ کفر اغیر الصلوة ۔

ترجمہ: ”عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں: کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب نماز کے علاوہ کسی بھی عمل کے ترک کو کفر نہیں سمجھتے تھے (یعنی اس کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے)، (مشکوٰۃ: بحوالہ ترمذی)۔“

(3) عن ابی الدرداء قال: اوصانی خلیلی ان لا یشرب الخمر فانہا مفتاح کل شر۔
وحرقت ولا تترك صلوة مكتوبة متعمدا فمن تركها متعمدا فقد برأت منه الذمة ولا تشرب الخمر فانها مفتاح کل شر۔

ترجمہ: ”ابو الدرداء بیان کرتے ہیں کہ: مجھے میرے (محبوب) دوست (رسول اللہ ﷺ) نے وصیت فرمائی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرانا خواہ تجھے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے اور جلا دیا جائے (یہ حکم عزیمت پر مبنی ہے، کم ہمت لوگوں کے لئے حالتِ اکراہ میں قرآن نے رخصت رکھی ہے) اور کسی فرض نماز کو جان بوجھ کر (ہرگز) نہ چھوڑنا، پس جس نے (فرض نماز کو) قصداً چھوڑا اس سے (اللہ اور رسول کا) ذمہ (یعنی عہد اور امان) اٹھ گیا اور شراب نہ پینا کیونکہ یہ ہر برائی کی کنجی ہے، (مشکوٰۃ: بحوالہ ابن ماجہ)۔“

ڈاکٹر وحید الزحیلی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ”اس امر پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ نماز ہر بالغ، عاقل، طاہر مسلمان پر فرض ہے، سوائے اس خاتون کے جو حالتِ حیض یا نفاس میں ہو یا جو شخص مجنون ہو یا بیہوشی کی حالت میں ہو۔ یہ خالص بدنی عبادت ہے، اس میں نیابت قطعاً قبول نہیں کی جائے گی لہذا کسی شخص کا دوسرے کی طرف سے نماز پڑھنا صحیح نہیں جیسے کسی شخص کا دوسرے کی طرف سے روزہ رکھنا شرعاً صحیح نہیں ہے۔ اس بات پر مسلمانوں

کا اجماع ہے کہ جو شخص نماز کی فرضیت کا انکار کرے، وہ کافر و مرتد ہے۔ کیونکہ نماز کی فرضیت قرآن، سنت اور اجماع کے قطعی دلائل سے ثابت ہے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ اور جو شخص سستی اور کاہلی کی بنا پر نماز ترک کرے وہ فاسق اور گنہگار ہے۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: نماز کا ترک دنیوی اور اخروی عذاب کا باعث ہے، (اور اس مقام پر وہ ان قرآنی آیات و احادیث سے استدلال کرتے ہیں، جو ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں)۔۔۔۔ آگے چل کر ڈاکٹر وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں: سستی کی بنا پر یا حقیر جانتے ہوئے نماز کو ترک کرنے کا حکام فقہاء کے نزدیک یہ ہیں:

حنفیہ کے نزدیک تارک الصلوٰۃ فاسق ہے، اسے قید کیا جائے گا اور تعزیری سزا دی جائے گی، یہاں تک وہ توبہ کرے اور نماز پڑھنا شروع کر دے یا قید خانے ہی میں اس کی موت واقع ہو جائے۔

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب تارک صلوٰۃ کے بارے میں بہت سخت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: تارک صلوٰۃ کو بر بناء کفر قتل کر دیا جائے گا، شوکانی نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے اور کہتے ہیں: حق یہ ہے کہ تارک صلوٰۃ کافر ہے اسے قتل کیا جائے گا اور بعض انواع کفر مغفرت اور استحقاق شفاعت سے مانع نہیں ہیں۔ بعض ائمہ کے نزدیک بلا عذر تارک صلوٰۃ سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا، اگر وہ توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے گا، اور مالکی اور شافعیہ کے نزدیک یہ قتل بطور حد ہو گا بر بناء کفر نہیں ہو گا یعنی اس پر کفر کا حکم نہیں لگا یا جائے، ایسے شخص کی وفات کے بعد اسے غسل دیا جائے گا، اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا، (الفقہ الاسلامی وادلتہ ص: 502 تا 505، دار الفکر، دمشق)۔

تارک صلوٰۃ کے بارے میں سب سے نرم اور صائب موقف امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ

تعالیٰ کا ہے اور وہ یہ کہ بلا عذر شرعی تارکِ صلوٰۃ فاسق و فاجر ہے، قابلِ تعزیر ہے، اسے قید کیا جاسکتا ہے تا وقتیکہ وہ توبہ کر کے نماز پڑھنا شروع کر دے، لیکن اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ اس عنوان سے متعلق قرآن مجید کی آیات مبارکہ اور احادیث شریفہ کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو امام اعظم کا موقف ہی صائب اور درست ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ان الله لا يغفر ان يشرك به ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء۔

ترجمہ: ”بے شک اللہ تعالیٰ اس (جرم) کو تو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا جائے اور اس سے کم تر جو بھی گناہ ہوں، جس کے لئے چاہے، اسے معاف فرما دیتا ہے، (النساء: 48)۔“ اس آیت مبارکہ میں شرک کے سوا ہر گناہ کی مغفرت کی گنجائش موجود ہے، خواہ وہ کسی درجے کا ہو اور یہ مغفرت اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ حدیث مبارکہ ہے: ”من قال لا اله الا الله دخل الجنة۔“ یعنی جس شخص نے صدقِ دل سے کلمہ طیبہ پڑھا وہ (آخر کار کسی نہ کسی مرحلے پر) جنت میں داخل ہوگا۔ وہ احادیث جن میں ترکِ نماز کو کفر قرار دیا گیا ہے، انہیں نماز کی فرضیت کے انکار پر محمول کیا جائے گا، یعنی جو نماز کی فرضیت کا منکر ہوتے ہوئے نماز کا تارک ہو تو وہ بالاجماع کافر ہے، ایسا شخص ملتِ اسلام سے خارج ہے، البتہ جو شخص فرضیتِ نماز کا عقیدہ تو رکھتا ہے لیکن کوتاہی کی بنا پر نماز کا تارک ہے تو وہ ائمہ ثلاثہ (امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نزدیک فاسق ہے۔ حدیث میں جو ترکِ نماز کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے، مندرجہ بالا شرح کی روشنی میں اس سے مراد اعتقادِ ترک کرنا ہوگا، یعنی انکارِ فرضیت یا تارکِ صلوٰۃ کے ظاہر حال کو بیان کیا گیا ہے کہ عملاً اس میں اور ایک کافر میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

ظہر کی پہلے کی چار سنتیں چھوٹ جائیں تو کب پڑھے؟

سوال: 14

ظہر کی چار سنتیں جو پہلے پڑھی جاتی ہیں، اگر وہ فرض ادا کرنے سے پہلے نہ پڑھ سکیں تو ان کی معافی ہے؟ یا پڑھا جائے گا۔ اگر پڑھنی ہے تو کس طرح؟ جواب دے کر شکریہ کا موقع دیں، (عبداللہ، کراچی)۔

جواب :

سنتیں بعض مؤکدہ ہیں جن کی ادا کرنے کے لئے شریعت میں تاکید فرمائی اور شارع علیہ السلام نے اس پر ہمیشگی اختیار فرمائی اور اس کے بے پناہ اجر و ثواب کو بیان فرمایا: عن أم حبیبة قتالت : قال رسول الله ﷺ : ”من صلی قبل الظهر أربعاً وبعدھا أربعاً حرّمه الله علی النار“۔

ترجمہ: ”ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو ظہر سے پہلے چار اور بعد میں چار رکعتیں (ہمیشہ) پڑھے اللہ تعالیٰ اس کو آگ پر حرام فرما دے گا، (سنن ترمذی رقم الحدیث: 427)۔“

عن عنبسة بن ابی سفيان قال: سمعت اختی أم حبیبة زوج النبی ﷺ تقول : سمعت رسول الله ﷺ يقول : ”من حافظ علی أربع رکعات قبل الظهر وأربع بعدھا حرّمه الله علی النار“۔

ترجمہ: عنبسة بن ابیوسفیان فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی ہمشیرہ، زوجہ نبی ﷺ (ام حبیبہ) کو فرماتے ہوئے سنا کہ وہ بیان کرتی ہیں: کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص ظہر سے پہلے چار رکعات اور ظہر کے بعد کی چار رکعات کی حفاظت کرے، اللہ تعالیٰ اس کو آگ پر حرام فرما دے گا، (سنن ترمذی رقم الحدیث: 428)۔“

اس حدیث کی شرح میں علامہ علی القاری لکھتے ہیں: ”حدیث میں ظہر کے بعد جن سنتوں کا ذکر ہے ان میں سے دو سنت ہیں اور دو مستحب، لہذا افضل یہ ہے کہ یہ الگ الگ دو گانے کی شکل میں پڑھی جائیں، ظہر سے پہلے کی چار سنتوں کے برعکس کہ وہ ایک سلام کے ساتھ پڑھی جائیں گی، جہاں تک یہ سنتیں پڑھنے پر غیر معمولی اجر، (یعنی یہ کہ وہ شخص جہنم کی آگ پر حرام کی نوید کا مسئلہ) ہے، اس سے یا تو مراد یہ ہے کہ وہ دائمی طور پر جہنم میں نہیں رہے گا یا یہ کہ جو شخص سنتوں اور مستحبات کا اتنا اہتمام کرتا ہے، وہ فرائض و واجبات کا اس سے بھی زیادہ پابند ہوگا اور محرمات سے بھی اجتناب کرنے والا ہوگا، تو یقیناً جہنم سے محفوظ رہے گا، (مرقات المفاتیح، ج: 3، ص: 113 مکتبہ امدادیہ، ملتان)۔“

عن عائشة: ان النبی ﷺ کان اذا لم یصل اربعاً قبل الظهر صلاہن بعدہ۔
ترجمہ: ”(امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے جب ظہر سے پہلے کی چار سنتیں نہ پڑھی ہوتیں، تو انہیں بعد میں پڑھ لیتے، (سنن ترمذی رقم الحدیث: 426 ج: 1، ص: 319 دارالکتب العلمیہ، بیروت)۔“

سنت مؤکدہ کو سنن الہدیٰ بھی کہتے ہیں، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:
والسنة نوعان: سنة الهدى، وترکھا یوجب اساءة وکراہیة کالجماعة والاذان والاقامة ونحوها۔

ترجمہ: ”سنت کی دو قسم ہیں: (جس میں سے ایک) سنن الہدیٰ (سنت مؤکدہ) بھی ہے، اور ان کا ترک کرنا، موجب گناہ اور باعث کراہیت ہے جیسے کہ جماعت، اذان و اقامت اور (ان جیسے دیگر) امور کا ترک کرنا، (رد المحتار علی الدر المختار جلد 1 ص:

196 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت) "علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وأما الاربع قبل الظهر اذا فاتته وحدها بان شرع فی صلاة الامام ولم يشتغل بالاربع فعامتهم علی أنه یقضیها بعد الفراغ من الظهر مادام الوقت باقیا وهو الصحيح هكذا فی المحيط۔ وفي الحقائق یقدم الركعتین عندهما وقال محمدرحمه الله تعالیٰ یقدم الاربع وعلیه الفتویٰ کذا فی السراج الوهاج۔

ترجمہ: "(جب ظہر کی جماعت کھڑی ہو جائے) اور (مقتدی کے) امام کے ساتھ (جماعت میں) شامل ہونے کی وجہ سے ظہر سے پہلے کی چار سنتیں رہ جائیں تو عام فقہائے کرام کی رائے یہ ہے کہ جب تک وقت باقی ہے، (ظہر کے فرائض سے) فارغ ہونے کے بعد پڑھ لے، یہی صحیح ہے، "محیط" میں اسی طرح ہے، اور "حقائق" میں ہے کہ شیخین (امام اعظم اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ) کے نزدیک (بعد والی) دو رکعتیں پہلے پڑھے، (اور پھر ظہر کی پہلی چار سنتیں جو چھوٹ گئی ہیں، پڑھے) امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پہلے والی چار (سنتیں) پہلے پڑھے (اور پھر بعد والی دو پڑھے) اور اسی پر فتویٰ ہے، "السراج الوهاج" میں اسی طرح ہے، (عالمگیری، ج: 1، ص: 112، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔"

صدر الشریعہ علامہ امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

ظہر یا جمعے کے پہلے کی سنت فوت ہوگئی اور فرض پڑھ لئے تو اگر وقت باقی ہے، بعد فرض کے پڑھے، اور افضل یہ ہے کہ پچھلی سنتیں پڑھ کر ان کو پڑھے، (فتح القدیر)، (بہار شریعت ج: 4، ص: 101، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، کراچی)۔"

ظہر سے پہلے کی چھوٹی ہوئی چار سنتوں کو پچھلی دو سنتوں کے بعد پڑھنا زیا دہ قرین

قیاس ہے کیونکہ پہلے والی چار تو اپنی جگہ سے ہٹ چکی ہیں، تو بعد والی دو تو اپنی جگہ پہ قائم و بنی چاہئیں، یہی شخصیں کا مذہب ہے اور صاحب فتح القدر کا مختار ہے۔

جہاں زمین کے نیچے سیوریج لائن گزر رہی ہے، اس جگہ پر نماز پڑھنا

سوال: 15

ہمارے گھر میں فرش کے نیچے گٹر کا پائپ گزرا ہوا ہے۔ کیا اُس فرش پر نماز ہو جاتی ہے؟، (بخت ولی، براولپنڈی)۔

جواب:

نمازی کے بدن، اس کے کپڑے اور جائے نماز (جس جگہ نماز پڑھ رہا ہے) کا نجاستِ حقیقیہ قدر مانع سے پاک ہونا، نماز کی شرائط میں سے ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

ولو كان رقيقاً وبسطه على موضع نجس ، ان صلح سائر اللعورة تحوز الصلاة كما في "البحر" عن "الخلاصة" وفي "القنية": لو صلى على زجاج يصف ماتحته قالوا جميعاً يحوز۔

ترجمہ: ”اگر نجس جگہ پر باریک کپڑا بچھا کر نماز پڑھی جو ستر کے کام میں آسکتا ہے (یعنی اس کے نیچے کی چیز نہ جھلکتی ہو) نماز ہوگئی، ”بحر الرائق“ میں ”خلاصہ“ سے اسی طرح منقول ہے۔ ”قنیہ“ میں ہے: اگر شیشہ پر نماز پڑھی اور اس کے نیچے نجاست ہے اگرچہ نمایاں ہو، نماز ہوگئی، (رد المحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص: 68 مطبوعہ: دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

مذکورہ صورت میں چونکہ پائپ فرش کے نیچے سے گزر رہا ہے اور نجاست پائپ کے

اندر ہے اور خود پائپ بھی زمین میں دفن ہے اور نمازی نہ تو نجاست پر کھڑا ہے اور نہ ہی اس کے نجاست سے آلودہ ہونے کا کوئی خطرہ ہے لہذا اس مقام پر نماز تو جائز ہے، لیکن اگر اس مقام پر پڑھنے سے طبیعت میں کراہت محسوس ہوتی ہے تو دوسری جگہ پڑھ لیں۔

مسجد میں اپنے لئے اور دوسرے کے لئے جگہ مختص کرنا یا کپڑا رکھ کر محفوظ کرنا

سوال: 16

ایک نمازی مسجد میں اپنا رومال یا تولیہ یا کوئی کپڑا اس لئے رکھے کہ دوسرے کو وہ جگہ ملے اور وہ آدمی ابھی مسجد میں نہیں ہے کہ جس کے لئے جگہ روک رہے ہیں یا اپنے لئے کسی جگہ کو مقرر کر لے کہ وہاں کسی کو نہ بیٹھنے دے، کیا ایسا کرنا درست ہے؟، (وقاص احمد، کراچی)۔

جواب:

نماز میں اپنے یا کسی دوسرے شخص کے لئے جگہ مخصوص کرنا مکروہ ہے، حدیث مبارکہ میں ہے: عن جعفر بن عبد اللہ: أن تمیم بن محمود أخبرہ، أن عبد الرحمن بن شبل أخبرہ، أن رسول اللہ ﷺ نہی عن ثلاث: عن نقرة المغراب، وأفتراش السبع، وأن يعزطن الرجل المقام للصلاة كما يعزطن البعير۔

ترجمہ: ”عبدالرحمن بن شبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (نماز میں) تین باتوں سے منع فرمایا، کوڑے کی طرح ٹھونگ مارنا، (یعنی جلدی جلدی سجدہ کرنا کہ پیشانی زمین سے ٹکرائے اور مقدار سنت تین تسبیحات پڑھنے سے پہلے

اُٹھ جائے) درندے کی طرح پاؤں بچھا کر بیٹھنا اور مسجد میں کوئی شخص جگہ مقرر کر لے جیسے اونٹ جگہ مقرر کر لیتا ہے، (سنن نسائی، رقم الحدیث: 1111)۔“

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ويذكره لئلا تسان ان يخص بنفسه مكانا في المسجد يصلي فيه كذا في التتارخانيه -

ترجمہ ”کسی شخص کا مسجد میں اپنے لئے کوئی جگہ خاص کر لینا کہ وہیں نماز پڑھے، مکروہ ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: اول، ص: 108، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

لہذا مسجد میں نہ کسی کا اپنے لئے پہلے سے جگہ مختص کرنا درست ہے اور نہ دوسرے کے لئے، اس سے اپنے لئے یا دوسرے کے لئے تعلق (یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھنے) کا تاثر پیدا ہوتا ہے اور نماز کے من جملہ مقاصد شرعیہ میں سے بندے میں، عجز و انکسار پیدا کرنا ہے اور اپنے نفس کے عجب (غرور و تکبر) سے بچنا ہے، پھر مسجد ہی تو وہ مقام ہے جہاں انسانوں کے درمیان مساوات قائم ہوتی ہے، جیسے علامہ اقبال نے کہا: بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و یاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

ہاں اگر کوئی شخص پہلے سے مسجد میں صف میں بیٹھا ہوا ہے، اور کوئی صاحب علم، صاحب ورع و تقویٰ آ جاتا ہے، اور وہ شخص اس کی دین داری، تقویٰ اور علم کی وجہ سے اس کے لئے جگہ خالی کر دیتا ہے، بشرطیکہ اس صاحب علم و تقویٰ کے دل میں ایسی خواہش نہ ہو کہ علم کی بنا پر اس کی تکریم کی جائے یا کوئی معذور و بیمار ہے اور اسے کنارے میں ٹیک لگا کر بیٹھنا ہے تو اس بنا پر کوئی اس کی رعایت کر کے جگہ چھوڑ دے تو یہ جائز اور مستحسن امر ہے اور محاسبین اخلاق میں سے ہے، ہاں کسی کی دنیوی و جاہت و منصب یا دولت کی

وجہ سے اسے تکریم دی جائے تو یہ شرعاً پسندیدہ امر ہے۔

نماز میں اقامت کہنے والے کا امام بننا یا امام کا خود ہی اقامت کہہ دینا

سوال: 17

اگر مؤذن صاحب نے اقامت کہی اور امام صاحب کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے خود مصلے پر نماز پڑھانے آگئے تو کیا اس صورت میں مؤذن کی کہی گئی اقامت کافی ہوگی یا دوبارہ اقامت کہی جائے گی؟، (اراکین انتظامیہ جامع مسجد نورانی، لاہور 4 کراچی)۔

جواب:

اقامت درست اور کافی ہوگی، دوبارہ نہیں کہی جائے گی۔ حدیث مبارک میں ہے: عن زیاد بن الحارث الصدائی، قال: كنت مع رسول الله ﷺ في سفر. فأمرني فأذنت. فأراد بلال ان يقيم. فقال رسول الله ﷺ: "ان أخوا صدائ قد أذن. ومن أذن فهو يقيم".

ترجمہ: "زیاد بن حارث صدائی سے روایت ہے آپ نے فرمایا: ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے آپ ﷺ نے مجھے اذان کا حکم دیا۔ پھر (اذان کے بعد) بلال نے ارادہ کیا کہ وہ اقامت کہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارے بھائی صدائی نے اذان کہی پس جو اذان کہے وہی اقامت کہے، (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 717)۔"

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

والاحسن أن يكون اماما في الصلاة كذا في معراج الدراية۔ والافضل أن يكون المؤذن هو المقيم كذا في الكافي۔ وان أذن رجل وأقام آخر ان

غائب الاول جواز من غير كراهة وان كان حاضراً او يلحقه الرحشة باقامة
غيره يكره وان رضى به لا يكره عندنا كذا في المحيط -

ترجمہ: ”اور امام ہی اذان دے تو یہ بہت زیادہ بہتر ہے جیسا کہ ”معراج الدراية“ میں
ہے، اور افضل یہ ہے کہ مؤذن ہی اقامت کہے ”کافی“ میں اسی طرح سے ہے۔ اور
اگر ایک شخص نے اذان کہی اور دوسرے نے اقامت کہی تو اگر پہلا شخص (جس نے
اذان کہی) غائب ہے تو بلا کراہت اقامت جائز ہے اور اگر وہ موجود ہے اور اس کی
اجازت کے بغیر دوسرے شخص نے اقامت کہی اور مؤذن کو (دوسرے کا اقامت کہنا)
ناگوار ہو تو پھر یہ مکروہ ہے، اور اگر وہ راضی ہے تو ہمارے نزدیک کوئی کراہت
نہیں، ”محیط“ میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 54، مکتبہ
رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

اس مسئلے سے معلوم ہوا کہ جو شخص امامت کرائے وہ اقامت بھی کہہ سکتا ہے، عموماً لوگ
یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر امام مصلیٰ پر نہ ہو تو اقامت نہیں کہی جائے گی یہ خیال باطل
ہے، اقامت کے وقت امام کا مصلیٰ پر ہونا نہ واجب ہے، نہ سنت نہ مستحب، امام مصلیٰ
پر ہو یا نہ ہو، دونوں صورتیں برابر ہیں، بلکہ عہد رسالت میں یہی طریقہ رائج تھا کہ
حضور اقدس ﷺ حجرے میں ہوتے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ کی طرف نظریں
جمائے رہتے، جب آپ حجرۃ النور سے نکلتے تو وہ اقامت شروع کر دیتے، صحابہ بھی
فوراً اقامت شروع ہوتے ہی کھڑے ہو جاتے، آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو اس عجلت
کے طریقہ سے منع فرمایا، چنانچہ اس کے بعد جب آپ حجرۃ النور سے نکلتے، اقامت
شروع ہو جاتی، آپ مصلیٰ پر تشریف لاتے اور جیسے جیسے آپ ﷺ صحابہ کرام کی
صفوں سے گزرتے، وہ کھڑے ہوتے جاتے۔ حدیث پاک میں ہے:

عن ابی قتادۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: اذا اُقيمت الصلوة فلا تقروا حتی ترونی۔

ترجمہ: ”حضرت ابو قتادہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب نماز کے لئے اقامت کہی جائے تو جب تک تم (خود) مجھے دیکھ نہ لو، (عجلت میں) کھڑے نہ ہوا کرو، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 604)۔“

جو مسئلہ دریافت کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ آیا جس شخص نے جماعت کے لئے اقامت کہی ہو، وہ آگے بڑھ کر امامت بھی کر سکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جی ہاں اقامت کہنے والا امامت کر سکتا ہے، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اقامت کہہ دی جاتی ہے مگر اقامت کہنے والے کے سوا کوئی امامت کا اہل نہیں ہے تو وہ آگے بڑھ کر امامت کر سکتا ہے یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ امام تو موجود ہوتا ہے مگر کوئی اقامت کہنے والا نہیں ہوتا تو ایسی صورت میں امام اقامت کہہ سکتا ہے۔

نوٹ: جماعت کے قیام کے لئے جماعت سے پہلے اقامت کہی جاتی ہے، اسے حدیث وفقہ میں ”اقامت“ کہا جاتا ہے، اور یہ عنوان اس کلمے سے ماخوذ ہے: قد قامت الصلوة، (نماز یعنی جماعت کھڑی ہو گئی ہے)۔

اقامت کے لفظی معنی ہیں: ”کھڑا کرنا“ اور یہاں مراد ہے ”جماعت کا قائم کرنا“۔ ہمارے ہاں عرف عام میں لوگ اسے ”تکبیر“ کہتے ہیں، ”تکبیر“ کے معنی ہیں ”اللہ اکبر“ کہنا یا اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعلان کرنا۔ چونکہ اس کا پہلا کلمہ ”اللہ اکبر“ ہے، اسی لئے اسے تکبیر بھی کہہ دیتے ہیں۔

امام یا مؤذن کا غیر شادی شدہ ہونا

سوال: 18

امامت یا مؤذن کے فرائض کی ادائیگی کے لئے کیا یہ شرط ضروری ہے کہ وہ شادی شدہ ہو۔ کیا امام کی غیر موجودگی میں مؤذن (جو کہ غیر شادی شدہ ہے) امامت کے فرائض انجام دے سکتا ہے؟، (حافظ معشوق علی سکندری، مؤذن جامع مسجد صدیقیہ 5-D نیو کراچی)۔

جواب :

شرائط امامت میں یہ کہیں بھی مذکور نہیں ہے کہ امام شادی شدہ ہو، شرائط امامت چھ ہیں، اسلام، عاقل، بالغ، مرد ہونا، قراءت پر قادر ہونا، معذور نہ ہونا۔ امام معین ہی امامت کا زیادہ حق دار ہے اگرچہ حاضرین میں کوئی اس سے زیادہ علم اور زیادہ تجوید والا ہو، اور اگر امام معین کسی بناء پر موجود نہ ہو یا آنے میں تاخیر ہو جائے تو اس کی جگہ مؤذن نماز پڑھانے کا زیادہ اہل ہے کہ یہ اس کے فرائض میں شامل ہے، ہاں اگر کسی مسجد میں امام معین کے ساتھ نائب امام بھی علیحدہ سے مقرر ہو تو نماز پڑھانے کا اختیار اسے حاصل ہوگا لیکن اگر مؤذن ہی نائب امام ہے تو پھر نماز وہی پڑھائے۔ جس وقت امام یا مؤذن کا تقرر کیا جاتا ہے تو مسجد کمیٹی امام یا مؤذن سے متعلق معلومات جمع کرتی ہیں، تو اس وقت شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونا سب معلوم ہو جاتا ہے بعد میں اس بات کو عذر بنانا محض فتنہ انگیزی ہے، لیکن بہر حال غیر شادی شدہ ہونا امام یا مؤذن کو ان کے فرائض سے علیحدہ کرنے کے لئے عذر نہیں ہے۔

تراویح کی امامت کا استحقاق

سوال : 19

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس بارے میں کہ ایک مسجد کے امام صاحب حافظ قرآن، قاری و عالم دین ہیں، مذکورہ امام کے ہوتے ہوئے انتظامیہ کے بعض افراد نے نماز تراویح کے لئے دوسرے حافظ کا انتظام کیا ہے جو صرف حافظ ہے، عالم وقاری نہیں، انتظامیہ کے ان افراد نے مذکورہ امام صاحب کو کہا کہ آپ کو اجازت ہے کہ کسی اور مسجد میں تراویح پڑھالیں۔ واضح ہو کہ مقررہ امام صاحب پر انتظامیہ یا کسی اور مقتدی کو کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ امام صاحب اور مقتدی صاحبان کی شدید خواہش ہے کہ وہ خود تراویح پڑھائیں۔

جس حافظ کو تراویح کے لئے مقرر کیا جا رہا ہے وہ انتظامیہ کے کسی ممبر کا رشتہ دار ہے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ انتظامیہ کا یہ عمل شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیا انتظامیہ کو یہ حق حاصل ہے کہ تراویح پڑھانے کا جو حق مقررہ امام کو حاصل ہے، بغیر کسی شرعی وجہ کے کسی اور کو تفویض کر دے؟ اس حافظ کے پیچھے جو عالم نہیں ہے رمضان میں نماز عشاء، وتر و تراویح پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں، (فخر عالم، مہاجرین مسجد بزرگ لائن کراچی)۔

جواب :

صورت مسئلہ میں امام معین (جو کہ عالم دین ہونے کے ساتھ قاری و حافظ بھی ہے) ہی نماز تراویح کی امامت کا زیادہ حقدار ہے، بلکہ افضل یہ ہے کہ وہی نماز تراویح پڑھائے، دوسرے کی اقتداء نہ کرے۔

علامہ نظام الدین تراویح کی بحث میں لکھتے ہیں:

ولو كان الفقيه قارئاً فالأفضل والأحسن ان يصلي بقراءة نفسه ولا يقتدى
بغيره كذا في فتاوى قاضي خان ۔

ترجمہ: اور اگر (تراویح پڑھانے والا) عالم ہو تو افضل ہے بلکہ احسن یہی ہے کہ وہ خود
پڑھائے دوسرے کی اقتداء نہ کرے فتاویٰ قاضی خان میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ
عالمگیری جلد 1 ص: 116 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔ جب امام خود حافظ قرآن ہے اور
تراویح پڑھانے کا خواہش مند بھی ہے تو اسے کسی دوسری جگہ جا کر پڑھانے کی کیا
ضرورت ہے اس بات کا وہ زیادہ حق دار ہے کہ خود اپنی مسجد میں تراویح پڑھائے ہاں
! اگر وہ بخوشی اجازت دے تو دوسرے شخص کو مقرر کیا جاسکتا ہے، انتظامیہ کے افراد
کا از خود فیصلہ کرنا جانبداری اور نا انصافی پر مبنی ہے انہیں چاہئے کہ اپنے اختیارات کا
نا جائز استعمال نہ کریں، شرعی معاملات میں مداخلت انتظامیہ کے دائرہ اختیار میں
نہیں ہے اور اگر وہ انتظامی امور کے اہل نہ ہوں شرعی معاملات میں ضد اور ہٹ دھرمی
اختیار کرتے ہوں تو ایسے لوگوں کو معزول کر دینا چاہئے اور ان کی جگہ نیک اور دین دار
لوگوں کا انتخاب کرنا چاہئے۔

جسمانی نقص سے امامت میں فرق

سوال: 20

ہماری مسجد میں نئے پیش امام صاحب مقرر کئے گئے ہیں، جو کہ بہترین
قاری عالم و مقرر ہیں، لیکن ان کے ایک پیر میں نقص ہے، یعنی تھوڑا نکلڑا کر چلتے ہیں،
جو ایک واضح نقص ہے، لیکن سجدہ کی حالت میں ان کی انگلیاں زمین پر لگ جاتی
ہیں۔ نمازی حضرات معترض ہیں کہ شرعی اعتبار سے ایسا شخص امامت نہیں کرا سکتا ہے،
اور اس کے پیچھے نماز میں کراہیت تو نہیں ہوگی، برائے مہربانی شریعت کی رو سے فتویٰ

عنایت فرمائیں، (قدیر احمد انصاری، جنرل سکریٹری، جامع مسجد باب الاسلام)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ولو كان لقدم الامام عوج وقام على بعضها يجوز وغيره أولى كذا في التبيين -

ترجمہ: ”اگر امام کے پیر میں ٹیڑھا پن (ایسا نقص ہو) کہ پورا پاؤں زمین پر نہیں جھاسکتا، تب بھی اس کی امامت جائز ہے، مگر (اس کے مقابلے میں) غیر معذور کی امامت بہتر ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 83 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے سوال ہوا: ایک آدمی جس کے دونوں پاؤں کی انگلیاں نہیں ہیں، کیا وہ ان لوگوں کی امامت کر سکتا ہے؟، جن کے دونوں پاؤں درست ہوں۔

اس کے جواب میں لکھتے ہیں: ”شریعت میں نماز کے احکام میں معذور اس کو کہتے ہیں، جس میں وضو توڑنے والی کوئی بات پائی جائے، اس طرح کہ وہ وضو کر کے نماز پڑھنے کا وقت بھی نہ پاسکے کہ وضو ٹوٹ جائے، مثلاً بار بار پیشاب کے قطروں کا آنا، ہر وقت رخ کا خارج ہونا یا بدن سے خون یا پیپ کا بہتے رہنا، اس کا حکم یہ ہے کہ ایسے شخص کے پیچھے غیر معذور کی یا اس سے کم عذر والے کی نماز نہیں ہوتی، جیسا کہ بہار شریعت میں لکھا ہے۔

پیر کی انگلیاں کٹی ہونے کی وجہ سے اس قسم کا معذور نہیں ہے، وہ اپنے قدم زمین پر لگا کر نماز پڑھے گا تو اس کی نماز بھی ہو جائے گی اور اس کی امامت بھی صحیح ہے۔ انگلی موڑنے کا حکم اس کے لئے ہے، جس کے پیر میں انگلی ہو اور جس کے پاؤں میں انگلی ہی نہیں ہے، اس کے لئے یہ حکم نہیں ہے، (وقار الفتاویٰ، جلد دوم، ص: 179، مطبوعہ

بزم وقار الدین، کراچی)۔

لہذا صورت مسئلہ میں مذکور امام کی اقتدا میں نماز جائز ہے، بقول سائل امام صاحب کے پاؤں کی انگلیاں زمین پر لگ جاتی ہیں، اگر خدا نخواستہ ان کے پاؤں کی انگلیاں سرے سے نہ ہوتیں، اور پاؤں زمین پر لگ جاتا، تب بھی ان کی امامت درست ہوتی، یا انگلیاں سالم ہوتیں مگر ٹانگ کے ٹنگ کی وجہ سے پاؤں زمین پر لگ جاتا اور انگلیاں پر بنائے عذر لگ جاتیں، تب بھی امامت درست ہوتی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ**۔

ترجمہ: ”اور اس نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی، (الحج: 78)۔
رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

عن انس، عن النبی ﷺ قال: ”يَسْرُوا وَلَا تَعْسُرُوا وَابْشُرُوا وَلَا تَنْفَرُوا“۔
ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”(دین میں) آسانی پیدا کرو، دشواری نہیں اور (لوگوں کو رحمت باری کی) بشارت سناؤ، انہیں دین سے متنفر نہ کرو (صحیح البخاری رقم الحدیث: 69 مطبوعہ مکتبۃ العصریہ، بیروت)۔“

ناجینا کی امامت

سوال: 21

کسی ناجینا قاری و حافظ قرآن امام کے پیچھے پنج وقتہ نماز اور نماز جمعہ ادا کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ یعنی کیا ناجینا کو امام بنانا جائز ہے؟، (حافظ قاری خلیق اللہ، نواب شاہ)۔

جواب:

امام ابو داؤد سحستانی اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

عن أنس ابن النبی ﷺ استخلف ابن أم مكتوم يوم الناس وهو أعمى -
ترجمہ: ”حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (غزوہ تبوک کے موقع پر عبد اللہ) ابن أم مكتوم کو (مدینہ منورہ میں) اپنا خلیفہ بنایا تا کہ وہ لوگوں کی امامت کریں، حالانکہ وہ نابینا تھے، (سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: 1595 المکتبۃ المکیہ، مکہ)۔“

اس کی شرح میں علامہ علی القاری لکھی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ابن الملک نے کہا نابینا کی امامت کی کراہت تب ہے جبکہ قوم میں اس کے مقابلے میں تندرست شخص اس سے بڑا عالم یا اس کے برابر درجے کا عالم موجود ہو، اور ابن حجر نے کہا کہ اس میں نابینا کی امامت کا جواز ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں، اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ بینا کی امامت اولیٰ ہے یا نابینا کی (جبکہ دونوں دستیاب ہوں)، (مرقاۃ المفاتیح، جلد: 3، ص: 84 مکتبۃ اہل ادبیہ، ملتان)۔“

نابینا شخص اگر احتیاط برتتا ہے یعنی کپڑوں یا بدن پر کوئی چیز لگ جائے تو کسی بینا شخص کو دکھا کر اطمینان کر لیتا ہے کہ کہیں نجاست تو نہیں لگی؟، اور اگر نجاست لگ گئی ہو تو دھو لیتا ہے، ایسے نابینا کی امامت جائز ہے، مگر مکروہ تنزیہی ہے اور اگر وہ حاضرین میں مسائل نماز کا سب سے زیادہ جاننے والا ہے، تو اس کی امامت بلا کراہت جائز ہے۔
علامہ علاؤ الدین ہسکفی لکھتے ہیں:

(ویسکرہ) تنزیہاً (امامۃ اعمیٰ) ونحوہ الأعمیٰ۔ ”تھر“ (الا ان یکون) ای

غیر الفاسق (أعلم القوم) فہو اولیٰ۔

ترجمہ: ”ناپینا اور ایسا شخص جسے رات کو نظر نہ آتا ہو، اس کی امامت مکروہ تنزیہی ہے (بحوالہ محر) اور اگر یہ زیادہ صاحب علم ہو تو اس کی امامت بہتر ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد: 2، ص: 255، 254 دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“ چونکہ علامہ ہسکفی نے ناپینا کا ذکر فاسق اور اعرابی کے سیاق میں کیا ہے، اس لئے اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ”وحاصلہ ان قوله “الا ان یکون أعلم القوم“ خاص بالاعمی، اما غیرہ فلا تنتفی الکراہۃ بعلمہ۔“

ترجمہ: ”اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ (علامہ ہسکفی کا یہ قول کہ) ”اگر وہ پوری قوم سے زیادہ عالم ہو“ (تو وہ ناپینا امامت کا زیادہ حق دار ہے) ناپینا کے ساتھ خاص ہے، جہاں تک غیر ناپینا (کی امامت) کا تعلق ہے، تو علم کی بنا پر اس کی کراہت منقہ نہیں ہوگی۔۔۔۔۔۔ اور آگے چل کر لکھتے ہیں: کہ اگر ناپینا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ عالم ہے تو استحقاق امامت کا معاملہ بالکل برعکس ہوگا (یعنی ناپینا عالم ہی زیادہ حق دار ہوگا)، (ردالمحتار علی الدر المختار ج: 2، ص: 255 دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ اندھے کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی یا تحریمی یا نہیں اور یہ امامت کے واسطے سزاوار ہے یا نہیں، جواب میں وہ لکھتے ہیں: اندھا اگر تمام موجودین میں سب سے زیادہ مسائل کا جاننے والا نہ ہو اور اس کے سوا دوسرا صحیح القراءت، صحیح العقیدہ، غیر فاسق معین حاضر جماعت ہے، تو اندھے کی امامت مکروہ تنزیہی ہے، اور اگر وہی سب سے زیادہ علم نماز رکھتا ہے، تو اسی کی امامت افضل ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 520 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“

علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ”ناپینا کی امامت مکروہ تنزیہی ہے، جبکہ دوسرے لوگ

مسائل طہارت و نماز میں اس سے زائد یا اس کے برابر ہوں، اور اگر سب سے زائد یہی علم رکھتا ہو، تو اس کی امامت میں اصلاً کراہت نہیں، بلکہ اس صورت میں اسی کو امام بنانا بہتر ہے۔ بحر الرائق میں ہے: قید کراہۃ امامۃ الاعمى فی المحيط وغیرہ بان لا یكون افضل القوم فان كان افضلهم فهو اولیٰ۔ مکروہ تنزیہی ناجائز نہیں ہوتا مگر اس سے بچنا بہتر، اور کرنا برا ہے مگر گناہ نہیں، (فتاویٰ امجدیہ جلد اول ص: 107 مطبوعہ مکتبہ رضویہ، آرام باغ، کراچی)۔“

امام صاحب کی رہائش

سوال: 22

ہماری مسجد کے امام، صاحب حیثیت ہیں، پھر بھی مسجد میں رہائش اختیار کئے ہوئے ہیں، جبکہ وہ با آسانی رہائش اور دیگر ضروریات اپنے خرچے پر انجام دے سکتے ہیں، کیا ایسے امام کے پیچھے نماز ادا ہو جائے گی؟، (عبدالحمید بندھانوی، لیاقت آباد)۔

جواب:

اگر امام صاحب کے تقرر کے وقت ان کی شرائط ملازمت میں مکان کی سہولت بھی شامل تھی، جو آپ نے ان کو فراہم کی ہے، تو خواہ وہ صاحب حیثیت ہوں، ان کا مسجد کے مکان میں رہنا جائز ہے۔ امامت کا منصب چونکہ کل وقتی ہے، کسی بھی وقت امام کی خدمات کی ضرورت پیش آسکتی ہے، اس لئے مساجد کے ساتھ عملے کے مکانات کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ہمارے ہاں عرف عام میں بھی اسے لازم و ملزوم سمجھا جاتا ہے۔

فقہ العصر علامہ محمد نور اللہ نعیمی (فتاویٰ نور یہ جلد 1 ص: 184) لکھتے ہیں: ”تکمیل تعمیر

کے بعد ضروریات مسجد میں سے امام اول نمبر میں ہے کیونکہ مسجد کی صرف ظاہری تعمیر کا کوئی اعتبار نہیں جب تک کہ اس کی معنوی اور حقیقی تعمیر نہ ہو حتیٰ کہ مسجد کے لئے روشنی پانی وغیرہ کے وسیع تر انتظام سے امام کی ضروریات مقدم ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

المدنی يبدأ من ارتفاع الوقف عمارته شرط الوقف ام لا ثم الى ما هو اقرب الى العمارة واعم للمصلحة كالامام للمسجد والمدرس للمدرسة يصرف اليهم بقدر كفايتهم ثم المراج والبسط كذلك الى اخر المصالح

ترجمہ: ”وقف قائم کرنے سے جس چیز کا آغاز ہوتا ہے، وہ اس کا تعمیر کرنا (اور آباد کرنا) ہے، خواہ واقف اس کی شرط لگائے یا نہ لگائے، پھر جو امر (مسجد کی) کی آباد کاری کے لئے ضروری ہے اور مصلحت و مفاد وقف میں جو زیادہ شامل ہے، (وہ ضروری ہے)، جیسے مسجد کے لئے امام اور مدرسہ کے لئے مدرس، ان پر ضرورت اور کفایت کے مطابق وقف کا مال خرچ کیا جائے (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص: 320)۔“ مسجد کے عطیات صدقات نافلہ ہوتے ہیں، اس لئے ان کا مصرف بننے کے لئے امام کا نادر ہونا شرط نہیں ہے۔ زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ، کفارات اور صدقات واجبہ کا مصرف بننے کے لئے نادر ہونا شرط ہے۔

نماز میں خلاف ترتیب قرائت کا حکم

سوال: 23

امام صاحب نے عشاء کی نماز کی پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ اعلیٰ کی آخری چار آیات کی تلاوت کی اور دوسری رکعت میں سورہ اعلیٰ کی شروع کی تین آیات

ت تلاوت کیں۔ نماز کے بعد چند لوگوں نے امام صاحب کو بتایا کہ آپ نے اس طرح نماز پڑھائی ہے، اس لئے دوبارہ نماز پڑھائیں مگر امام صاحب اور چند اور افراد نے نماز کو جائز قرار دیا۔ اور دوبارہ نماز نہیں پڑھائی۔ آپ سے التجا ہے کہ برائے کرم مجھے صحیح راہ دکھائیں، عین نوازش ہوگی، (محمد علی، ۲۹۸ فیروز اسٹریٹ نمبر ۶ ڈیفنس آفیسر ہاؤسنگ اسکیم۔ ملیر کینٹ کراچی)۔

جواب:

نماز میں قرآن ترتیب سے پڑھنا یعنی سورتوں میں ترتیب رکھنا واجب ہے اور یہ احکام قراءت میں سے ہے، احکام نماز سے نہیں، اگر قصداً خلاف ترتیب پڑھا تو یہ مکروہ تحریمی ہے لیکن نماز واجب الاعادہ نہیں ہوگی اور اگر بھولے سے پڑھا تو مکروہ بھی نہیں ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر غلطی سے ایک لفظ بھی خلاف ترتیب زبان سے نکل گیا تو اسی کو پڑھے، اس کو چھوڑنا مکروہ ہے، علامہ علاء الدین ہسکمی لکھتے ہیں:

لا بأس أن يقرأ سورة ويسعيدها في الثانية وإن يقرأ في الأولى من محل وفي الثانية من آخر ولو من سورة إن كان بينهما آيتان فأكثر - ويكره الفصل بسورة قصيرة وأن يقرأ منكوساً إلا إذا ختم فيقرأ من البقرة - وفي "الغنية": "قرأ في الأولى الكافرون وفي الثانية - ألم ترأوتبت - ثم ذكر بتم، وكيل يقطع ويبدأ -

ترجمہ: "اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایک رکعت میں کوئی سورت پڑھی اور پھر دوسری رکعت میں بھی اُسی کو پڑھا، یا پہلی رکعت میں ایک سورت کے ایک مقام سے تلاوت کی اور دوسری رکعت میں دوسرے مقام سے، اگر چہ ان دونوں کے درمیان دو آیات یا زیادہ کا فاصلہ ہو، اور درمیان سے ایک چھوٹی سورت کا چھوڑنا مکروہ ہے، اور سورت کا الٹا پڑھنا (یعنی دوسری رکعت میں ایسی سورت کا پڑھنا کہ جو ترتیب کے اعتبار سے

پہلی رکعت میں پڑھی گئی سورت سے پہلے ہو) مکروہ ہے، مگر یہ کہ ختم قرآن میں پھر سورہ بقرہ سے تلاوت کی جائے۔ اور ”قنیہ“ میں ہے: پہلی رکعت میں سورہ کافرون پڑھی اور دوسری رکعت میں سورہ الم تر (الفیل) یا تبت (سورہ لہب)، پھر (دوران تلاوت) یاد آیا تو اسی سورت کو مکمل کرے، اور ایک ضعیف قول یہ بھی ہے کہ اُسے چھوڑ دے اور پھر (ترتیب کے مطابق دوسری سورت) پڑھے، (رد المحتار علی المختار جلد: 2، ص: 238، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی)۔

علامہ ابن عابدین شامی (وَأَنْ يَقْرَأَ مَنْكُوساً) کی تشریح میں لکھتے ہیں: بَأَنْ يَقْرَأَ فِي الثَّانِيَةِ سُورَةً أَعْلَى مَعَاقِرَ فِي الْأُولَى، لَأَنْ تَرْتِيبَ السُّورِ فِي الْقِرَاءَةِ مِنْ وَاجِبَاتِ التَّلَاوَةِ۔

ترجمہ: ”یعنی دوسری رکعت میں اُس سے پہلے والی سورت تلاوت کرنا، جو پہلی رکعت میں پڑھی تھی (مکروہ ہے)، اس لئے کہ قراءت میں سورتوں کا ترتیب سے پڑھنا واجبات تلاوت میں سے ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی مزید لکھتے ہیں:

أَفَادَ أَنَّ التَّنْكِيسَ أَوْ الْفَصْلَ بِالْقَصِيرَةِ إِذَا يَكْرَهُ إِذَا كَانَ عَنْ قِصْدٍ فَلَوْ سَهَوَا فَلَا كَمَا فِي ”شرح المعنى“۔ وَإِذَا لَفَتَتْ الْكَرَاهَةَ فَاعْرَاضُهُ عَنِ الَّتِي شَرَعَ فِيهَا لَا يَنْبَغِي۔ وَفِي ”الخلاصة“: افْتَتَحَ سُورَةً وَقَصَلَ سُورَةً أُخْرَى فَلَمَّا قَرَأَ آيَةً أَوْ آيَتَيْنِ أَرَادَ أَنْ يَتَرَكَ تِلْكَ السُّورَةَ وَيَفْتَتِحَ الَّتِي أَرَادَهَا يَكْرَهُ۔ وَفِي ”الفتح“: وَلَوْ كَانَ: أَيِ الْمَقْرُوءِ حَرْفًا وَاحِدًا۔

ترجمہ: ”اس عبارت سے یہ مستفاد ہوا ہے کہ قرآن کو الٹا پڑھنے اور درمیان سے ایک چھوٹی سورت چھوڑ کر پڑھنے کو جو مکروہ لکھا گیا ہے، مراد اس سے یہ ہے کہ ایسا قصداً

کرنا مکروہ ہے، لیکن اگر بھول کر ہو تو مکروہ نہیں، اسی طرح ”شرح منیہ“ میں ہے: جب (بھول کر) خلاف ترتیب سہواً پڑھنے سے کراہت نہیں ہوتی تو جس سورت کو (خلاف ترتیب) شروع کر دیا ہے اسے چھوڑنا مناسب نہیں ہے اور ”خلاصۃ الفتاویٰ“ میں ہے کہ: کسی شخص کا ارادہ دوسری سورت پڑھنے کا تھا مگر اس نے کوئی اور سورت شروع کر دی اور ایک یا دو آیات پڑھنے کے بعد اگر وہ یہ چاہے کہ اُس سورت کو چھوڑ کر وہی سورت پڑھے جس کا (دل میں) ارادہ تھا تو یہ مکروہ ہے اور ”فتح القدیر“ میں ہے: اگرچہ ایک حرف ہی پڑھا ہو، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 2، ص: 239، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: امام نے پہلی رکعت میں ”قل اعوذ برب الناس“ پڑھی اور دوسری میں ”قل اعوذ برب الفلق“ پڑھی اور آخر میں سجدہ سہو کیا، اس مسئلہ کا حکم بیان فرمائیے، آپ نے جواب میں لکھا: ”اگر بھول کر ایسا کیا نماز میں حرج نہیں اور سجدہ سہو نہ چاہئے تھا اور قصد ایسا کیا تو گناہ گار ہوگا، نماز ہوگئی، سجدہ سہو اب بھی نہ چاہئے تھا، تو بہ کرے، پہلی میں اگر سورۃ ناس پڑھی تھی تو اُسے لازم تھا کہ دوسری میں بھی سورۃ ناس ہی پڑھتا کہ فرض کی دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورت پڑھنا صرف خلاف اولیٰ ہے اور ترتیب الٹا کر پڑھنا حرام، (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 346، 347 مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“

صورتِ مسئلہ میں چونکہ امام نے نماز میں ایک ہی سورت ”الاعلیٰ“ کی آیات بھول کر خلاف ترتیب پڑھی ہیں، لہذا نماز بلا کراہت جائز ہے اور جماعت کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

قراءت کی غلطی سے فساد نماز

سوال: 24

نماز کے کما ندر دورانِ قراءت ”عَلَىٰ أَبْوَيْكَ“ (سورۃ یوسف) کی جگہ ”عَلَىٰ أَبْوَيْكَ“ پڑھ لے تو نماز ہوگی یا نہیں؟ زید نے دورانِ نماز استسحوذ علیہم الشیطن فانسبہم ذکر اللہ ط اولئک حزب الشیطن ط الا ان حزب الشیطن ہم الخسرون 0 (مجادلہ: 19) کے بجائے ”اولئک حزب اللہ“ پڑھ لیتا ہے، آیا نماز میں کوئی خلل واقع ہوا یا نہیں، اور اگر امام دہرا کر دوبارہ صحیح پڑھ لے تو کیا نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی، (یعقوب حنفی، نیا آباد کراچی)۔

جواب :

قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ اگر نماز میں قراءت کے دوران ایسی غلطی ہوئی ہو، جس سے معنی میں فساد لازم آتا ہو تو نماز فاسد ہو جائے گی ورنہ نہیں۔ اعراب کی ایسی غلطی، جس سے معنی میں فساد لازم نہیں آتا، اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ اور اگر معنی میں اتنا تغیر ہو کہ اس کا اعتقاد اور قصد اُپر ہٹنا کفر ہو تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اعادہ لازم ہوگا۔ لفظِ أَبْوَيْكَ (کاف پر زیر) مذکر کے لئے استعمال ہوتا ہے اور مؤنث کے لئے أَبَوَيْكَ (کاف کے نیچے زیر) استعمال ہوتا ہے، اس طرح پڑھنے سے نماز ادا ہو جائے گی، احتیاطاً دہرائی جائے تو بہتر ہے۔

سورہ مجادلہ کی آیت میں اولئک حزب الشیطن کے بجائے اولئک حزب اللہ پڑھنے سے نماز فاسد ہو جائے گی اور دہرانا واجب، اگر قصد اُپر تھا تو کفر لازم ہوگا، ایسی صورت میں تجدید ایمان اور تجدید نکاح ضروری ہے۔ تاہم اگر بھول کر غلط پڑھنے کے بعد واپس دہرا کر صحیح پڑھ لیا تو نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی۔

مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا گیا کہ امام نے نماز کے اندر سورۃ الحشر کی آیت نمبر 20 میں ”ہم الفائزون“ کی جگہ ”ہم الفاسقون“ پڑھ لیا، لیکن اسی وقت آیت کو دوبارہ لوٹا کر صحیح کر لیا۔ نماز ہوگئی یا نہیں؟

وہ جواب میں لکھتے ہیں: نماز میں دورانِ قراءت غلط پڑھنے کے بعد پھر لوٹا کر صحیح طور پر اسے پڑھا، تو یہ نماز ہو جائے گی۔ علامہ سید احمد طحطاوی متوفی 1230ھ نے حاشیہ الطحطاوی علی الدر المختار میں لکھا: وفي المضممرات قرأ في الصلوة بخطأ فاحش ثم اعاد وقرأ صحيحاً فصلواته جائزة۔

ترجمہ: ”اور مضممرات میں ہے کہ اگر کسی نے نماز میں فحش غلطی کی، پھر اسے لوٹا کر صحیح پڑھ لیا، تو اس کی نماز جائز ہے، (کتاب الصلوٰۃ، باب ما یفسد الصلوٰۃ، جلد 1، ص: 267، المکتبۃ العربیہ، کوئٹہ)۔“

قراءت میں متشابہ لگنا اور یاد آنے پر واپسی اسی جگہ سے پڑھنا

سوال: 25

ایک آدمی نے نماز شروع کی، اس نے سورہ فاتحہ کے بعد قراءت شروع کی، ایک سورت پڑھی درمیان میں بھول گیا اور اس سورت کو چھوڑ کر اس کی جگہ دوسری سورت پڑھنا شروع کر دی، کیا اس صورت میں اس پر سجدہ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟، (بخت ولی، راولپنڈی)۔

جواب:

صورتِ مسئلہ میں نماز درست ہوگئی اور سجدہ سہو کی ضرورت نہیں تھی، لیکن اگر دونوں سورتوں کے درمیان ایک رکن ادا کرنے کی مقدار تاخیر ہوئی، تو سجدہ سہو لازم ہوگا۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: امام مغرب میں

رکوع ”لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ“ پڑھ رہا تھا جب ”فِي الْاَنْجِيلِ“ تک پڑھ لیا، آیت پارہ 22 کا تشابہ لگا اُس کے بعد ”اِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ“ تک پڑھی، پھر جب یاد آیا اُسے چھوڑ کر مقامِ اصل سے شروع کیا اور نماز ختم کی اور سجدہ سہو نہ کیا اس صورت میں نماز ہوئی یا نہیں؟، آپ نے جواب میں لکھا: نماز ہو گئی اور سجدہ سہو کی بھی حاجت نہ تھی اگر بقدر ادائے رکن سوچتا نہ رہا ہو، ہاں اگر بھولا اور سوچنے میں اتنی دیر خاموش رہا، جس میں کوئی رکن نماز کا ادا ہو سکتا ہے تو سجدہ سہو لازم آیا ”كما في الدر المختار“ وغیرہ۔ اگر نہ کیا تو نماز جب بھی ہو گئی مگر ناقص ہوئی پھیرنا واجب ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 274، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

ریڈیو، ٹی وی پر آیت سجدہ سن کر سجدہ تلاوت کرنے کا حکم

سوال: 26

Radio یا T.V یا اس سے ملتے جلتے آلات میں بیانات چل رہے ہوں یا پھر تلاوت ہو رہی ہو تو اگر دورانِ تلاوت آیت سجدہ آجائے، یا حضور ﷺ کا اسم گرامی آئے تو کیا سجدہ کرنا یا درود شریف پڑھنا واجب ہے؟۔ احتیاطی طور پر پڑھ لیتے ہیں لیکن مسئلے کے اعتبار سے وضاحت فرمائیں، (مولانا زاہد اللہ عادل، جامع مسجد اقصیٰ فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں: (لا) تحجب (بسماعہ من الصدی

والطی) ومن کل تال حرفاء ولا بالتہجی اشباہ۔

ترجمہ: ”آیت سجدہ کی کونج سننے یا پندے (طوطے) کے آیت سجدہ بار بار دہرانے سے (اگر اسے پریکٹس کرادی گئی ہو) سجدہ تلاوت لازم نہیں آتا۔ اسی طرح کئی افراد

آیت سجدہ ایک ایک حرف (الگ الگ) پڑھیں تو سننے والے پر سجدہ تلاوت واجب نہیں ہوتا، یا اس کے حروف جدا جدا کر کے پڑھے، تو اس کے سننے پر سجدہ تلاوت واجب نہیں ہوتا۔“

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی نے ”زیلعی“ وغیرہ کے حوالے سے پرندے سے اور بازگشت سے آیت سجدہ سننے پر سجدہ تلاوت کے عدم وجوب کے قول کو رائج قرار دیا ہے جب کہ ایک ضعیف قول کے مطابق اس صورت میں بھی واجب ہے لیکن علامہ شامی عدم وجوب کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں: قلت والا کثر علی تصحیح الاول وبہ جزم فی نورالایضاح۔ میں کہتا ہوں کہ پہلا یعنی عدم وجوب کا قول اکثر کے نزدیک صحیح ہے اور نورالایضاح میں بھی اس قول کو اختیار کیا گیا ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، ج: 2، ص: 509)۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ولا تحب اذا سمعها من طبر ہر المختار۔

ترجمہ: ”اور (اگر) پرندے (مثلاً طوطے سے) آیت سجدہ سنی تو سننے والے پر سجدہ تلاوت واجب نہیں ہوتا، (ج: 1، ص: 132)۔“ لہذا صورت مسئلہ میں اگر ریڈیو یا ٹی وی پر قاری براہ راست (Live) تلاوت کر رہا ہے تو بالاتفاق سننے والے پر سجدہ تلاوت واجب ہے، اگر ریکارڈنگ چل رہی ہے تو صحیح ترین قول یہ ہے کہ واجب نہیں ہے، اگرچہ بعض فقہاء کرام نے وجوب کا قول کیا ہے، لیکن جیسا کہ آپ نے تحریر کیا ہے کہ اگر آپ متوجہ ہو کر تلاوت سن رہے ہیں اور آیت سجدہ سن کر سجدہ تلاوت کر لیتے ہیں تو اس کی افضلیت میں کوئی شک نہیں ہے، اسی طرح ریڈیو، ٹی وی پر رسول اللہ ﷺ کا اسم مبارک سن کر ہر بار درود پاک پڑھ لینا افضل ہے، ”عدم وجوب“ کا معنی یہ ہے کہ نہ کرنے پر کھنگار نہیں ہوگا۔

مسجد میں جماعتِ ثانی

سوال: 27

ہم یہ دیکھتے چلے آئے ہیں کہ مسجد میں جماعت کے بعد دوسری جماعت کی جاتی ہے لیکن میں نے مسجد بلال ماڑی پور میں لکھا ہوا دیکھا ہے کہ مسجد میں دوسری جماعت کرنا مکروہ تحریمی ہے، وضاحت فرمائیے، (سید صفی اللہ شاہ، گڑھی نواب، بنگرام)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: المسجد اذا كان له امام معلوم وجماعة معلومة في محلة فصلى اهله فيه بالجماعة لا يباح تكرارها فيه باذان ثان اما اذا صلوا بغير اذان يباح اجماعاً وكذا في مسجد قارعة الطريق۔

ترجمہ: ”مسجد میں جب امام مقرر ہو اور پابندی سے جماعت ہوتی ہو اور وہاں کے رہنے والے باجماعت نماز پڑھتے ہوں تو ایسی مسجد میں اذانِ ثانی کے ساتھ جماعتِ ثانیہ جائز نہیں ہے البتہ جب وہ بغیر اذان کے جماعت سے نماز ادا کریں تو بالاتفاق دوسری جماعت جائز ہے جیسے شارع عام کی مسجد میں جائز ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 83 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔“

علامہ علاؤ الدین ہسکفی لکھتے ہیں:

يسكره تكرار الجماعة باذان واقامة في مسجد محلة لا في مسجد طريق أو مسجد لا امام له ولا مؤذن۔

ترجمہ: مسجد محلہ میں اذان و اقامت کے ساتھ دوسری جماعت مکروہ ہے مگر وہ مسجد جو شارع عام پر ہو یا جس مسجد میں امام و مؤذن مقرر نہ ہوں۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

يسكره تكرار الجماعة في مسجد محلة بأذان وإقامة، إلا إذا صلى بهما فيه
أو لا غير اهله أو اهله لكن بمخالفة الأذان، ولو كرر اهله بلونهما أو كان
مسجد طريق جاز اجتماعاً كما في مسجد ليس له امام ولا مؤذن ويصلي
الناس فيه فوجاً فوجاً، فإن الأفضل أن يصلي كل فريق بأذان وإقامة على
حدة كما في "امالي قاضيخان" اهـ۔

ترجمہ: ”مسجد محلّہ میں اذان و اقامت کے ساتھ جماعت کی تکرار مکروہ ہے، مگر اس
صورت میں کہ غیر محلّہ والوں نے وہاں اذان و اقامت کے ساتھ اولاً جماعت کرائی
ہو یا اہل محلّہ نے آہستہ اذان دیکر جماعت کروائی ہو۔ اور اگر اہل محلّہ نے بغیر اذان و
اقامت کے تکرار کی، تو یہ بالاتفاق جائز ہے یا اگر مسجد شارع ہے تو بالاتفاق
تکرار جماعت جائز ہے، جیسا کہ اس مسجد کا حکم ہے، جس کے لئے امام و مؤذن مقرر
نہ ہو اور لوگ اس میں گروہ درگروہ نماز ادا کرتے ہوں، تو وہاں افضل یہ ہے کہ ہر فریق
اپنی اپنی اذان و اقامت کے ساتھ الگ الگ نماز پڑھے، جیسا کہ ”امالی قاضی خان
“میں ہے، (رد المحتار علی الدر المختار، جلد دوم، ص: 246-245، مطبوعہ دار احیاء
التراث العربی، بیروت)۔“

فقہائے احناف کا معتمد مذہب یہ ہے کہ دوسری جماعت اذان کے اعادہ کے ساتھ
مکروہ ہے اور بلا اعادۃ اذان دوبارہ جماعت کرانے میں کوئی حرج نہیں جبکہ وہ
جماعتِ ثانی جماعتِ اولیٰ کی ہیئت پر نہ ہو، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

عن أبي يوسف أنه إذا لم تكن الجماعة على الهيئة الأولى لا تكره،
والأكره، وهو الصحيح، وبالعندول عن المحراب تختلف الهيئة۔

ترجمہ: امام ابو یوسف سے روایت ہے، جب جماعت پہلی ہیئت پر نہ ہو، تو مکروہ نہیں
ورنہ مکروہ ہے یہی صحیح ہے اور محراب سے ہٹ کر ادا کرنے سے ہیئت بدل جاتی ہے،
(رد المحتار علی الدر المختار، جلد دوم، ص: 246، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی،
بیروت)۔“

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے ”القطوف الدانیہ لمن احسن الجماعة
الثانیہ“ کے نام سے ایک ہی مسجد میں جماعتِ ثانیہ قائم کرنے کے مسئلے پر ایک مستقل
رسالہ تصنیف فرمایا ہے، اس میں آپ نے تقریباً 12 ممکنہ صورتیں اور ان کے احکام
بیان فرمائے ہیں، ان میں آج کل کے حالات کی مناسبت سے چند اہم صورتیں یہ
ہیں:

(1) جو مسجد شارع عام، بس اسٹینڈ، ریلوے اسٹیشن، ایئر پورٹ، سرائے وغیرہ کی
ہے، جہاں لوگوں کے قافلے آتے جاتے رہتے ہیں، نئی اذان و اقامت کے ساتھ کسی
کراہت کے بغیر تکرار جماعت جائز ہے۔

(2) ایک مسجد کسی محلے یا بستی کے لئے ہے، وہاں کچھ اجنبی لوگ یا مسافر اذان
و اقامت کے ساتھ جماعت کر کے چلے گئے ہو اہل محلہ کے لئے دوبارہ اذان
و اقامت کے ساتھ جماعت کرانا جائز ہے، کیوں کہ اس مسجد میں اقامت جماعت
انہی لوگوں کا حق ہے، جیسے اصولاً تو نماز جنازہ کی تکرار جائز نہیں ہے، لیکن اگر ولی کی
اجازت کے بغیر دوسرے لوگوں نے نماز جنازہ پڑھ لی ہو ولی کو عادیہ کا حق ہے۔

(3) محلے یا بستی کی جماعت میں بعض اہل محلہ نے اذان کے بغیر جماعت کر لی ہو اب
بھی وہاں اذان و اقامت کے ساتھ تکرار جماعت جائز ہے۔

(4) محلے یا بستی کی مسجد میں کچھ لوگوں نے آہستہ اذان دے کر جماعت کرائی ہو اہل

محلّہ کا دوبارہ اذان و اقامت کے ساتھ جماعت کرانا جائز ہے، کیوں کہ اذان کا اصل مقصد اعلانِ عام ہے، جو آہستہ اذانِ اول سے حاصل نہیں ہوا۔

(5) یا امام کسی دوسرے مسلک کا ہو، مثلاً شافعی، اور اس کے بارے میں ظن غالب یا یقین ہو کہ وہ بعض فقہی مسائل میں ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے کہ مسلک حنفی کے مطابق وضو نہیں ہوتا، مثلاً (الف) وہ پچھنا لگوانے کے بعد نماز کے لئے دوبارہ وضو نہیں کرتا (ب) جسم کی کسی عضو یا مقام سے خون نکل کر بہہ جانے سے دوبارہ وضو نہیں کرتا (ج) نماز کے اندر قہقہہ لگا کر ہنسنے سے نماز تو بالاتفاق فاسد ہو جاتی ہے، مگر شوافع کے نزدیک وضو نہیں ٹوٹتا، اور اب شافعی امام ایسی صورت میں احتیاط پر عمل کرتے ہوئے نماز کے لئے وضو کا اعادہ نہیں کرتا (و) امام شافعی المسلک ہے اور وہ وضو کرتے وقت احتیاط پر عمل کرتے ہوئے چوتھائی سر یا اس سے زیادہ کا مسح نہیں کرتا بلکہ چند بالوں کے مسح پر اکتفا کرتا ہے، تو ان صورتوں میں چونکہ احناف کے نزدیک وضو یا ہونا ہی نہیں ہے یا فاسد ہو جاتا ہے، لیکن اس سے نماز ادا نہیں کی جاسکتی، اب اگر کہیں صورت حال ایسی ہے کہ امام شافعی المسلک ہے اور یہ جاننے کے باوجود کہ اس کے مقتدی سب کے سب یا اکثر حنفی ہیں اور وہ مندرجہ بالا مسائل میں احتیاط پر عمل نہیں کرتا تو حنفی اپنی نماز کی حفاظت کے لئے جماعت ثانی کر سکتے ہیں۔

(6) پہلی جماعت میں امام ایسی قرأت کرتا ہے، جو موجب فسادِ نماز ہے۔

(7) ظن غالب یا یقین کی حد تک معلوم ہے کہ پہلی جماعت کا امام تو ہین الوہیت و رسالت کا مرتکب ہے۔

آخر میں لکھتے ہیں: ”اب محل نظر صرف ایک صورت رہی کہ مسجد محلّہ میں اہل محلّہ نے باذان و اقامت بروجہ سنت امام موافق المذہب سالم العقیدہ، متقی مسائل داں، صحیح

خواں کے ساتھ جماعت اولیٰ خالی عن الکرہت ادا کر لی، پھر باقی ماندہ لوگ آئے، انہیں دوبارہ اس مسجد میں جماعت قائم کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟، اور ہے تو بکراہت یا بے کراہت، اس بارے میں عین تحقیق وحق وثیق وحاصل انیق ونظر دقیق واثرتوفیق یہ ہے کہ اس صورت میں تکرار جماعت باعادہ اذان ہمارے نزدیک ممنوع و بدعت ہے، یہی ہمارے امام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب مہذب و طاہر الروایہ ہے، متن متین مجمع البحرین و بحر الرائق علامہ زین میں ہے:

ولا تكرر هاهنا في مسجد محللة باذان ثان۔

”مسجد محلہ میں دوسری اذان کے ساتھ تکرار جماعت جائز نہیں، (البحر الرائق، باب الامامة جلد: اول، ص: 346)“، (فتاویٰ رضویہ جلد: 7 ص: 125 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

خواتین کے مخصوص ایام کی نمازوں کی قضا نہیں، صرف روزوں کی قضا ہے

سوال: 28

میں نماز اور روزے جو عورتوں کی مجبوری کے باعث قضا ہوتے ہیں ان کے بارے معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ رمضان کے روزے قضا ہوتے تو میں بعد میں پورے کر لیتی تھی اور نماز قضا بھی ادا کر لیتی تھی، پھر بھی اگر کوئی کفارہ وغیرہ ہو تو بتادیں۔ آپ سے ایک مسئلہ یہ بھی میں نے سنا ہے کہ حج سے پہلے کے تمام گناہ بندے کے حج کرنے کے بعد معاف ہو جاتے ہیں، میں نے 2002ء میں حج کیا جب سے لے کر آج تک اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں پوری پابندی کرتی ہوں نماز قضا وغیرہ بھی ادا کر لیتی ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ میری راہنمائی فرمائیں اور کوئی کفارہ وغیرہ ادا کرنا ہے یا نہیں جو بھی بہتر ہے مشورہ عنایت فرمائیں، (والدہ محمد ریکیس، 4/865 لیاقت آباد)

و، کراچی)۔

جواب:

عورتوں کا ایام مخصوصہ میں روزے رکھنا اور نماز پڑھنا حرام ہے ان دنوں میں نمازیں معاف ہیں ان کی قضاء بھی نہیں، روزوں کی قضاء اور دنوں میں فرض ہے۔ حدیث مبارک میں ہے: **عن معاذة قالت: سألت عائشة فقالت: ما بال الحائض تقضي الصوم، ولا تقضي الصلاة؟ فقالت: أحرورية أنت؟ قلت: لست بحرورية، ولكني أسأل۔ قالت: كان يصيبنا ذلك، فنؤمر بقضاء الصوم، ولا نؤمر بقضاء الصلاة۔**

ترجمہ: ”معاذہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ حائضہ عورت روزہ تو قضاء کرتی ہے نماز قضاء نہیں کرتی، حضرت عائشہ نے پوچھا کیا تو حروریہ (خوارج میں سے) ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں حروریہ نہیں ہوں محض جاننا چاہتی ہوں، آپ نے فرمایا کہ حیض کے ایام میں ہمیں روزوں کی قضاء کا تو حکم دیا جاتا تھا لیکن نماز کی قضاء کا حکم نہیں دیا جاتا تھا، (صحیح مسلم رقم الحدیث 747)۔“

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

(منہا) ان يسقط عن الحائض والنفساء الصلاة فلا تقضي هكذا في الكفاية۔

ترجمہ: ”(حیض و نفاس کے احکام میں ہے) کہ حیض اور نفاس والی عورت سے نماز سا قط ہو جائے گی اور اس پر اس کی قضاء بھی نہیں۔“ کفایہ میں اسی طرح ہے، ۔۔۔۔۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: (ومنہا) ان يحرم عليهما الصوم

ترجمہ: ”(حیض ونفاس کے احکام میں ہے) حیض ونفاس والی عورت پر (اس حال میں) روزے رکھنا حرام ہے، اور بعد میں وہ اسکی قضاء کرے گی ”کفایہ“ میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 38 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔“

حکم متفق علیہ ہے تمام مسلمانوں کا اسی پر اجماع ہے کہ حیض اور نفاس کی حالت میں عورت پر نماز اور روزہ واجب نہیں ہے۔ اور اس پر اجماع ہے کہ اس پر روزہ کی قضاء واجب ہے اور نماز کی قضاء واجب نہیں ہے، ان میں فرق یہ ہے کہ نمازیں زیادہ ہیں اور دن میں بار بار پڑھی جاتی ہیں اس کے برعکس روزے صرف سال میں ایک بار واجب ہوتے ہیں، یہ حکمت ہمیں معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ نے ایام حیض ونفاس میں خواتین کے لئے تخفیف فرمادی اور ان ایام کی فوت شدہ نمازوں کی قضا واجب نہیں فرمائی۔ باقی احکام شرعیہ ”تجدی“ ہوتے ہیں یعنی جیسے اور جس طرح شارع سے ثابت ہیں، انہیں قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا واجب ہے، اگر ان کی حکمت ہماری سمجھ میں آجائے تو یہ ہماری سعادت ہے اور اگر ہماری سمجھ میں نہ آئے تو یہ ہماری عقل و فہم کی نارسائی ہے۔

آپ نے جو لکھا ہے کہ ”جج سے پہلے کے تمام گناہ بندے کے جج کرنے کے بعد معاف ہو جاتے ہیں“، ادائیگی جج کے لئے جانے سے قبل کبیرہ گناہوں کی توبہ کی جائے، فرائض کی ادائیگی مثلاً قضا نمازوں کی ادائیگی یا اعزام، زکوٰۃ کی ادائیگی، حق العبد یعنی اگر کسی کا حق اس کے ذمے ہے، تو اس حق کی ادائیگی یا اس سے اس حق کو معاف کرائے۔

نماز قصر میں وطن کی اصطلاح

سوال: 29

زید کراچی سے حیدرآباد اپنی فیکٹری میں روزانہ آتا جاتا ہے، وہاں تین نمازوں کا وقت آتا ہے، آیا زید ان نمازوں میں قصر کرے گا یا نہیں؟ نیز بعض علماء نے کہا ہے کہ زید فیکٹری کے قیام کے دوران قصر نہیں کرے گا کیونکہ یہ وطن تریق ہے، آیا وطن تریق کی کوئی اصل ہے یا نہیں؟، (مولانا شبیر حسین، کراچی)۔

جواب:

کم از کم مسافت سفر ”جس کا سفر شروع کرنے سے ”قصر“ واجب ہو جاتی ہے، وہ مقدار سفر ہے، جو انسان اوسط رفتار سے یا اونٹ کی متوسط رفتار سے اپنی طبعی ضروریات و لوازمات (اس سے مراد مناسب آرام، کھانے اور دیگر حاجات کی تکمیل ہے) اور شرعی فرائض (یعنی نمازوں) کی ادائیگی کے ساتھ تین دن میں طے کرے۔ اس میں آرام کے وقفے کے ساتھ دن کا سفر اور رات کا قیام بھی شامل ہے، بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ مسافت کے پیمانے بھی بدلتے گئے اور پھر مسافت کو پہلے انگریزی میلوں اور بعد میں کلومیٹر سے ناپا جانے لگا، لہذا عہد حاضر کے علماء نے مسافت قصر کا اندازہ انگریزی میلوں سے قائم کیا۔ فقہاء کرام کے اقوال میں مفتی یہ قول اٹھارہ فرسخ ہے اور اٹھارہ فرسخ چھون میل شرعی ہیں، جو ایک لاکھ آٹھ ہزار گز یعنی ایکسٹھ انگریزی میل دو فرلانگ بیس گز ہیں اور یہ اٹھانوے اعشاریہ سات تین چار (98.734) کلومیٹر کے برابر ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ثم اختلفوا ففعل احد وعشرون، وقيل ثمانية عشر، وقيل خمسة عشر،

والفتوى على الثانى لانه الاوسط۔

ترجمہ: ”بعض فقہاء نے اکیس فرسخ قرار دیا ہے اور بعض نے اٹھارہ فرسخ قرار دیا ہے اور بعض نے پندرہ فرسخ قرار دیا ہے اور مفتی بہ اٹھارہ فرسخ کا قول ہے، (درمختار: جلد نمبر 2 ص: 526 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی)۔“

لہذا مفتی بہ قول کے مطابق تقریباً اٹھانوے (98) کلومیٹر کی مسافت کے بعد ہی سفر شرعی اور قصر کے احکام لاگو ہونگے۔

وطن کی دو قسمیں ہیں، وطن اصلی، وطن اقامت، علامہ علاء الدین ہسکفی درمختار میں لکھتے ہیں:

(الوطن الاصلی) هو موطن ولادته او تاهله او توطنه۔

ترجمہ: ”کسی شخص کا وطن اصلی اس کی جائے ولادت ہے یا جہاں وہ شادی کر کے اپنے اہل کے ساتھ رہے یا جسے وہ اپنے وطن کے طور پر اختیار کر لے۔“
اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قوله: (الوطن الاصلی) ویسمی بالاهلی و وطن الفطرة عن القهستانی، قوله: (اتاهله) ای تزوجه۔

ترجمہ: ”وطن اصلی“ کو ”وطن اہلی“ اور ”وطن الفطرة“ بھی کہا جاتا ہے، اور قہستانی سے منقول ہے کہ (درمختار کی عبارت میں) ”اتاہله“ سے مراد شادی کرنا ہے، (رد المحتار علی الدر المختار، ج: 2، ص: 535، 536، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

عبارة عمامة المشائخ ان الاوطان ثلاثة، وطن اصلی وهو موطن الرجل او البلد الذى

تأهل به و وطن سفر و قسیمی وطن اقامة و هو البلد الذی ینوی المسافر
 الاقامة فيه خمسة عشر يوما او اکثر و وطن سکنی و هو البلد الذی ینوی
 الاقامة فيه دون خمسة عشر يوما، و عبارة عامة المحققين من مشائخنا ان
 الوطن و طنان، وطن اصلی و وطن اقامة و لم يعتبروا وطن السکنی و طنا و هو
 الصحيح هکذا فی الکفاية۔

ترجمہ: ”عام علماء کی عبارت یہ ہے کہ وطن تین قسم کے ہیں، ایک وطن اصلی اور یہ اس
 کی جائے پیدائش یا وہ مقام ہے جہاں وہ شادی کر کے اپنے اہل کے ساتھ رہے، اور
 دوسرا وطن سفر اور اسے وطن اقامت بھی کہا جاتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی مسافر
 پندرہ دن یا اس سے زیادہ مدت کے لئے رہنے کا ارادہ رکھتا ہے، اور تیسرا وطن سکنی ہے،
 اور یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی مسافر پندرہ دن سے کم مدت کے لئے ٹھہرنے کا ارادہ کرتا
 ہے، اور ہمارے علماء میں سے عام محققین کا کہنا یہ ہے کہ وطن کی صرف دو ہی قسمیں
 ہیں، وطن اصلی اور وطن اقامت، اور وہ ”وطن سکنی“ کا اعتبار نہیں کرتے اور یہی قول صحیح
 ہے، اور کفایہ میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری ج: 1، ص: 143 مکتبہ رشیدیہ
 ، کوئٹہ)۔“

خلاصہ کلام یہ کہ زید فیکٹری میں رہتے ہوئے جو نمازیں جماعت کے ساتھ مقیم امام
 کے ساتھ ادا کرے گا انہیں پوری ادا کرے گا، اگر انفرادی طور پر پڑھے گا تو قصر کرے
 گا یعنی چار رکعتی نماز دو رکعت پڑھے گا، اور اسے چاہئے کہ حتی الامکان جماعت کے
 ساتھ نماز پڑھنے کا اہتمام کرے تاکہ جماعت کے اجر زائد کے ساتھ امام کی متابعت
 میں پوری نماز پڑھنے کا موقع ملے۔ وطن تریق، (یعنی جہاں انسان کا روزگار وابستہ
 ہو) کی الگ کوئی قسم اس معنی میں نہیں ہے کہ اس پر ”وطن اقامت“ سے ہٹ کر کسی

خاص حکم کا اطلاق کیا جاتا ہو۔

اذانِ جمعہ اور نماز کی سعی

سوال: 30

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”اے ایمان والو! جب تمہیں نماز جمعہ کے لئے بلایا جائے تو کاربار دنیا چھوڑ کر اس کے لئے سعی کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم جانو! اس آیت مبارکہ کی رو سے نماز جمعہ کے لئے سعی واجب ہے، ہمارے ہاں جمعہ کے دن دو اذانیں دی جاتی ہیں، اس سے کون سی اذان مراد ہے، پہلی یا دوسری، کیا عہد رسالت میں بھی دو اذانیں دی جاتیں تھیں۔ (یا سر رحمان، ضلع کوٹلی تحصیل نکیاں، آزاد کشمیر)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یا ایہا الذین امنوا اذنوا دی للصلاة من یوم الجمعة فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع۔ ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون۔ ترجمہ: ”اے اہل ایمان! جب جمعہ کے دن نماز (جمعہ) کے لئے اذان دی جائے، تو تم اللہ کے ذکر کی طرف چل پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لئے بہت بہتر ہے اگر تم جانتے ہو، (الجمعة: 9)۔“

قرآن مجید کی ایک مکمل سورت یوم جمعہ کے نام سے منسوب ”سورة الجمعة“ ہے، یہ دو رکوعات پر مشتمل ہے، اس کے دوسرے رکوع میں ”سعی جمعہ“ کا حکم ہے، ”سعی“ کی تفسیر میں چار اقوال ہیں: (1) دل سے نیت کرنا (2) نماز جمعہ کی تیاری کرنا یعنی غسل کرنا (3) اذان کی آواز پر لبیک کہنا (4) نماز کی طرف چل پڑنا، مگر بھاگتے ہوئے نہیں وقار کے ساتھ۔

امام فخر الدین محمد بن عمر ضیاء الدین عمر رازی متوفی 606ھ لکھتے ہیں:

”سعی“ کے معنی چل پڑنے کے ہیں، دوڑنے کے نہیں ہیں، نیت سے بھی سعی ہوتی ہے (یہ عمل قلب ہے)، اور کسی کام کی طرف متوجہ ہو جانے کا نام بھی ”سعی“ ہے، لیکن یہاں علماء کی ایک جماعت کے نزدیک ”سعی“ سے مراد عمل ہے، امام مالک اور امام شافعی کا یہی مسلک ہے۔

سورۃ اللیل، آیت: 4 میں ہے: ان سعیکم لشتی، ”تمہارا عمل مختلف ہے“۔

اور رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے: ”جب تم نماز کی طرف آؤ تو دوڑتے ہوئے نہ آؤ، بلکہ سکون (ووقار) کے ساتھ آؤ، اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب جمعہ کے لئے تشریف لاتے تو نرم روی سے تشریف لاتے، (تفسیر کبیر، ج: 10 ص: 542، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

ذکر اللہ کی تفسیر میں تین اقوال ہیں: (1) خطبہ میں امام کی نصیحت (2) نماز کا وقت (3) نماز۔ رہا یہ سوال کہ وہ کون سی اذان ہے، جس کے سننے کے بعد نماز جمعہ کے لئے سعی واجب ہو جاتی ہے، اور خرید و فروخت حرام ہو جاتی ہے؟۔

امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ انصاری قرطبی متوفی 1273ھ لکھتے ہیں: ”رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں باقی نمازوں کی طرح جمعہ کے لئے بھی ایک ہی اذان دی جاتی تھی، اور یہ اذان اس وقت دی جاتی تھی جب رسول اللہ ﷺ ممبر پر (خطبہ دینے کے لئے) بیٹھ جاتے تھے، حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور کوفہ میں حضرت علی کے دور میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا، جب مدینہ منورہ میں آبادی زیادہ ہو گئی تو حضرت عثمان نے وقت زوال (یعنی ظہر کے وقت کی ابتدا) سے ایک اذان کا اضافہ فرما دیا، یہ اذان مقام ”زوراء“ پر ان کے مکان پر دی جاتی تھی، جو بازار میں تھا اور منارے کی طرح

بلند تھا، لوگ (یہ پہلی اذان) سن کر چل پڑتے، پھر جب حضرت عثمان منبر پر بیٹھتے تو رسول اللہ ﷺ کے مؤذن (دوسری) اذان دیتے اور آپ خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں علامہ ماوردی نے (حضرت عثمان کی اضافہ کردہ) اس اذان اول کو بدعت قرار دیا ہے، لیکن حضرت عثمان نے شہر کے پھیلاؤ اور آبادی کی کثرت کی بنا پر ایسا کیا تا کہ لوگ تیار ہو کر خطبہ کے لئے پہنچ سکیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں بازار میں مسجد کی طرف جانے کے لئے اعلان کرنے کا حکم دیا تھا، تا کہ لوگ کاروبار چھوڑ کر مسجد کی جانب چل پڑیں اور جوں ہی لوگ مسجد میں جمع ہوتے (تو خطبے کے وقت) اذان دلاتے تھے، (الجامع لاحکام القرآن، ج: 18، ص: 100، مکتبۃ الغرالی، دمشق)۔

نوٹ: عہد رسالت مآب ﷺ میں چونکہ مدینہ منورہ کی آبادی محدود تھی، اس لئے اذان خطبہ سنتے ہی لوگوں کا پہنچنا آسان تھا۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی متوفی: 1270ھ اسی بات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ترجمہ: ”(کہ جب حضرت عثمان نے اذان اول کا اضافہ فرمایا) تو کسی نے آپ کو ملامت نہیں کیا، (یعنی اس سے ثابت ہوا کہ اس اذان اول کے اضافہ کو تمام صحابہ کرام نے تراویح کی جماعت کی طرح بدعت حسنہ تسلیم کر لیا تھا، کیونکہ اس کا مقصد، شریعت کی منشاء کا احسن و کامل طریقے سے حصول تھا)، روح المعانی، ج: 28، ص: 98، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

اسی مقام پر آگے چل کر علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

”ہمارے نزدیک صحیح ترین یہ ہے کہ (جس اذان کو سننے پر) سعی جمعہ واجب ہوتی ہے، اس سے مراد اذان اول ہے، کیونکہ اس کا مقصد نماز جمعہ کی تیاری کا اعلان

ہے۔“

علامہ محمد بن علی بن محمد حنفی متوفی 1088 ھ لکھتے ہیں:

”ووجب السعي اليها وترك البيع)----- (بالاذان الاول) في الاصح

وان لم يكن في زمن الرسول ﷺ بل في زمن عثمان“۔

ترجمہ: ”زیادہ صحیح یہ ہے کہ پہلی اذان کے بعد جمعہ کے لئے سعی کرنا واجب ہے، اگرچہ یہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نہیں تھی، حضرت عثمان کے زمانے میں شروع ہوئی۔“

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی متوفی 1252 ھ لکھتے ہیں:

”وَحَا صَلَهِ ان السَّعْيَ نَفْسَهُ فَرَضَ وَالْوَجِبَ كَوْنَهُ فِي وَقْتِ الْاَذَانِ الْاَوَّلِ“۔

ترجمہ: ”اس (عبارت کا) حاصل یہ ہے کہ فی نفسہ ”سعی جمعہ“ فرض ہے اور اس کا وجوب اذان اول کے وقت سے شروع ہوتا ہے“، آگے چل کر لکھتے ہیں: ”قال في“ شرح المنية): واختلفوا في المراد بالاذان الاول: فقليل الاول باعتبار المشروعية وهو الذي بين يدي المنبر لانه الذي كان اولاً في زمنه عليه الصلاة والسلام وزمن ابي بكر وعمر حتى احدث عثمان الاذان الثاني على ”الزوراء“ حيث كثر الناس۔ والاصح انه الاول باعتبار الوقت، وهو الذي يكون على المنارة بعد الزوال“۔

”شرح المنية“ میں کہا: فقهاء کا اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ اذان اول کونسی ہے، ایک قول یہ ہے کہ اس سے وہ اذان مراد ہے جو مشروعیت کے اعتبار سے اول ہے اور یہ وہ ہے جو منبر کے سامنے دی جاتی ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر اور حضرت

عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں یہی اذان اول تھی، یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جب لوگوں کی آبادی بڑھ گئی تو آپ نے مقام ”زوراء“ پر دوسری اذان شروع کرائی اور صحیح ترین قول یہ ہے کہ وقت کے اعتبار سے یہی (مقام زوراء والی اذان) اول ہے، جو زوال کے بعد منارہ پر دی جاتی تھی، (ردالمحتار، ج: 3، ص: 35، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

خلاصہ بحث یہ ہے کہ عہد رسالت ﷺ اور عہد شیخین (حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما میں جمعہ کے لئے ایک ہی اذان دی جاتی تھی جو امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت اس کے سامنے دی جاتی تھی، اور اسی وقت سے جمعہ کے لئے سعی واجب ہو جاتی تھی اور خرید و فروخت حرام ہو جاتی تھی۔ لیکن عہد عثمان رضی اللہ عنہ میں جب جمعے کے لئے ابتدائے وقت میں مقام ”زوراء“ پر پہلی اذان شروع ہوئی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر تکبر یا اختلاف ثابت نہیں ہے، لہذا یہ بدعت حسنہ قرار پائی۔

(3) اس پر اب تعامل ہے اور اسی سے جمعہ کے لئے سعی کا وجوب اور کاروبار کا ترک واجب ہو جاتا ہے، آبادی کے پھیلاؤ اور لوگوں کی کثرت کی وجہ سے اگر اذان ثانی سے سعی کے وجوب اور کاروبار کے ترک کرنے کا قول کیا جائے تو اکثر صورتوں میں جمعہ کے خطبہ واجب کا استماع (سننا) چھوٹ جاتا ہے اور بعض صورتوں میں نماز کی تکبیر تحریمہ یا ایک رکعت بھی چلی جاتی ہے۔ اور حدیث پاک میں ہے کہ امام جب خطبے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے تو مسجد کے دروازے پر فرشتے جن نورانی رجزوں میں آنے والے نمازیوں کے اسماء ترتیب کے ساتھ لکھتے ہیں اور اسی ترتیب کے مطابق ان کے اجر کے درجات ہیں، وہ رجز بند ہو جاتے ہیں اور دیر سے آنے والے نمازی نورانی رجزوں میں ناموں کے اندراج سے محروم رہ جاتے ہیں۔ لہذا اگرچہ اذان

ثانی کے ساتھ ”سعی جمعہ“ کے وجوب پر تو سب کا اتفاق ہے، لیکن ہمارے بعض فقہاء نے احناف نے اذانِ اول سے ”سعی جمعہ“ کے وجوب کے قول کو اصح (صحیح ترین) قرار دیا ہے، لوگوں کی سستی اور غفلت کو دیکھتے ہوئے عمل کے لئے یہی بہتر ہے، اگرچہ دوسرا قول بھی صحیح ہے۔

خطبہ جمعہ کے دوران بیٹھنے کی ہیئت

سوال: 31

خطبہ جمعہ وعیدین میں پہلے خطبہ کے دوران ہاتھ باندھ کر بیٹھنا اور دوسرے خطبہ میں ہاتھ کھول کر (یعنی بحالتِ تشہد) بیٹھنا، شرعی اعتبار سے اس کی کیا حقیقت ہے؟، (حافظ غلام مرتضیٰ سیالوی، ضلع انک)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: واذا شهد الرجل عند الخطبة ان شاء جلس محتباً او مترصاً او كما تيسر لانه ليس بصلاة عملاً و حقيقة كذا في المصنوعات - ويستحب ان يقعد فيها كما يقعد في الصلاة كذا في المعراج الدراية -

ترجمہ: ”جب کوئی شخص دورانِ خطبہ (مسجد میں) آئے تو (اسے رخصت ہے) چاہے تو اکڑوں بیٹھے (یعنی اس طرح کہ ایک تہبند میں ہو اور دونوں گھٹنوں کو دونوں ہاتھوں کے حلقے میں لیا ہوا ہو) یا آلتی پالتی مار کر (چار زانووں) بیٹھے یا جس ہیئت میں وہ آسانی محسوس کرے، کیونکہ خطبہ عملاً اور حقیقتہً نماز نہیں ہے، ”مضمرات“ میں اسی طرح ہے، اور مستحب یہ ہے کہ دورانِ خطبہ اسی طرح بیٹھے جیسے نماز میں (حالتِ تشہد) میں بیٹھتا ہے، ”معراج الدراية“ میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری،

جلد 1، ص: 148، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔ بعض لوگ خطبہ اولیٰ کو حالت تشہد میں ہاتھ باندھ کر بیٹھے ہوئے سنتے ہیں، یہ کہیں سے ثابت نہیں ہے۔ بس دونوں خطبوں کے دوران حالت تشہد میں بیٹھنا مستحب اور کسی بھی دوسری مناسب ہیئت پر بیٹھنا جائز ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ دو خطبوں کے درمیان امام و مقتدی بغیر ہاتھ اٹھائے یا ہاتھ اٹھا کر دعا کریں یا نہ کریں تو امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

مختصرًا بالجملہ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دعائے مذکور خطیب کے لئے مطلقاً اور سامعین کے لئے بالاتفاق جائز، اور مذہب امام شافعی قول امام ابی یوسف پر ان کے لئے زبان سے بھی قطعاً اجازت اور ارشاد امام کی ایک ترجیح پر مکروہ، دوسری پر جائز، ائمہ فتویٰ نے دونوں کی تصحیح کی، تو احد الصحیحین (یعنی دونوں صحیح روایتوں) پر دعائے مذکور امام و مقتدین سب کو دل و زبان ہر طرح سے باتفاق مذہبین حنفی و شافعی مطلقاً جائز و مشروع اور علماء تصریح فرماتے ہیں کہ جب ترجیح مختلف مکانی (برابر درجے کی ہو) ہو تو مکلف کو اختیار ہے کہ ان میں سے جس پر چاہے عمل کرے، اصلاً محل اعتراض و انکار نہیں، بحر الرائق و درمختار میں ہے: متنی کسان فی المسئلة قولان مصححان جاز القضاء والافتاء باحدهما۔ ترجمہ: ”جب کسی خاص مسئلے میں دو ایسے قول ہوں جن میں سے ہر ایک کو صحیح قرار دیا گیا ہو، تو ان میں کسی بھی ایک کے جواز پر فیصلہ دینا اور فتویٰ دینا دونوں جائز ہیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص: 490، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“

عیدین و نماز جمعہ میں خطبہ سننا واجب ہے، ہر وہ کام جو نماز میں منع ہے، دوران خطبہ بھی جائز نہیں، سماعت کے لئے توجہ اور یکسوئی لازم ہے۔ امام مسلم اپنی صحیح میں حدیث

دورانِ تُو نے اپنے ساتھی سے یہ کہا کہ: چپ رہو، تُو تُو نے لغوکام کیا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 934)۔“

عن علی قال: قال رسول اللہ ﷺ: من قال لصاحبه يوم الجمعة صه فقد لغا ومن لغا فليس في جمعته تلك شئ۔

ترجمہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے جمعے کے دن اپنے ساتھی سے کہا ”چپ رہو“ تو اُس نے لغوکام کیا اور جس نے لغوکام کیا اس کے لئے اس جمعہ میں کچھ اجر نہیں، (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:)۔“

عن ابن عباس قال: قال رسول اللہ ﷺ: من يتكلم يوم الجمعة والامام يخطب فهو كمثل الحمار يحمل اسفاراو الذي يقول له انصت ليس له جمعة۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے دن اُس وقت کلام کرے، جب امام خطبہ دے رہا ہو، تو وہ اس گدھے کی مانند ہے، جس پر کتابیں لدی ہوں، اور جو اس سے کہے ”چپ ہو جا“، اس کا جمعہ نہیں، (مسند امام احمد بن حنبل، جلد 1، ص: 230، مطبوعہ: دارالفکر، بیروت)۔“

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے دورانِ خطبہ جمعہ بات کرنے یا کوئی عمل کرنے سے متعلق سوال ہوا تو آپ نے جواب میں لکھا:

”عامہ کتب مذہب میں صاف تصریح ہے کہ جو فعل نماز میں حرام ہے، خطبہ ہونے کی حالت میں بھی حرام ہے، خلاصہ و عالمگیریہ و متن و شرح تنویر کی عبارات خزائن المفتیین بعینہا عبارتِ خلاصہ ہے اور اسی سے بحر و حاشیہ البحر للعلامة الشامی میں بہ نقل نہر

ماثور، وجیز کردری میں ہے: ما یحرم فی الصلوٰۃ یحرم فی الخطبة کالاکل والشرب
 حال الخطبة۔ ترجمہ: ”جو کچھ نماز میں حرام ہے، خطبہ میں بھی حرام ہے، مثلاً خطبہ کے
 دوران کھانا اور پینا۔“

شرح منیہ امام محمد ابن امیر الحاج حلبی میں ہے:

کما یکره الکلام باذواعه یکره ما یجری مسجراہ من کتابۃ ونحوها مما
 یشغل من سماعها حتی ان فی شرح الزاہدی ویکره لمستمع الخطبة ما یکره
 فی الصلوٰۃ کالاکل والشرب والعبث والالتفات۔

ترجمہ: ”جیسے ہر طرح کی گفتگو منع ہے ویسے ہی اس کے قائم مقام مثلاً کتابت وغیرہ
 جو خطبہ کے سماع میں خلل ڈالے حتیٰ کہ شرح الزاہدی میں ہے کہ خطبہ کے سماع کے
 لئے ہر وہ شے مکروہ ہے جو نماز میں مکروہ ہے مثلاً کھانا پینا، عبث فعل اور کسی طرف متوجہ
 ہونا وغیرہ۔ اسی طرح علامہ سید احمد مصری نے حاشیہ شرح نور الایضاح میں بحوالہ
 شرح الكنز للعلامة عمر بن نجیم وشرح القدوری لختار بن محمود سے نقل کیا، شرح نقایہ علامہ
 محمد قسستانی میں ہے: کما منع الکلام منع الاکل والشرب والعبث والالتفات
 والتخطی وغیرہا مما منع فی الصلوٰۃ کما فی جلابی۔ ترجمہ: ”جس طرح
 (دوران خطبہ کلام منع ہے) اسی طرح کھانا پینا عبث کام، کسی اور طرف متوجہ ہونا
 اور گردن پھلانگنا جو کہ نماز میں ممنوع ہیں جیسا کہ جلابی میں ہے۔ متن وشرح علامہ
 حسن شربلاہی میں ہے: (کرہہ لحاضر الخطبة الاکل والشرب) وقال
 الکمال یحرم (والعبث والالتفات) فیجتنب ما یجتنبه فی الصلوٰۃ۔ ترجمہ:
 ”(خطبہ میں حاضر شخص کے لئے کھانا پینا مکروہ ہے) کمال نے کہا حرام ہے (بے
 فائدہ کام اور کسی اور طرف متوجہ ہونا) پس ہر شے سے اجتناب کرنا چاہئے جس سے

نماز میں اجتناب کیا جاتا ہے۔ غنیۃ شرح منیہ للعلامة ابراہیم الحلی میں ہے :
 الاستماع والانصات واجب عندنا وعند الجمهور حتی اذہ یکرہ قراءۃ
 القرآن ونحوها ورد السلام وتشمیت العاطس وکذا الاکل والشرب وکل
 عمل۔

ترجمہ: ”خطبہ سننا اور اس کی طرف متوجہ ہونا ہمارے اور جمہور علماء کے نزدیک واجب
 ہے حتیٰ کہ اس کے دوران قرأت قرآن وغیرہ، سلام کا جواب، چھینک کا جواب مکروہ
 ہے اور اسی طرح کھانا پینا اور ہر عمل کا یہی حکم ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص:
 330, 331، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“

نماز جمعہ کے بعد طویل دعا

سوال: 32

جمعہ کی نماز کے فوراً بعد کچھ لوگ سنتیں پڑھنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور امام
 صاحب دعا مانگ رہے ہوتے ہیں اور جو لوگ نماز جمعہ کے فوراً بعد نکلنا چاہتے ہیں ان
 کے لئے بھی رکاوٹ بنتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے کیا حکم ہے؟ نیز امام صاحب جو
 اتنی لمبی دعا کرتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟، (یاسر رحمان، ضلع کوٹلی تحصیل نکیاں، آزاد
 کشمیر)۔

جواب:

وہ فرض نمازیں، جن کے بعد سنتیں ہیں، یعنی ظہر و جمعہ و مغرب و عشاء مختصر
 دعا کرنی چاہئے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ ”بعد نماز جمعہ
 انحراف قبلہ یعنی دائیں یا بائیں مڑ کر مناجات کرنا جائز ہے یا نہیں؟“۔
 آپ نے جواب میں تحریر فرمایا: ”امام کا بعد سلام قبلہ سے انحراف تو مطلقاً سنت ہے اور

اس کا ترک یعنی بعد سلام قبلہ رو بیٹھا رہنا امام کے لئے بالاجماع مکروہ ہے، جمعہ وغیرہ سب نمازیں اس حکم میں برابر ہیں اور بعد سلام دعا و مناجات بھی بالاجماع جائز ہے، مگر جس نماز کے بعد سنت ہے یعنی ظہر و جمعہ و مغرب و عشاء اس کے بعد طویل تاخیر کسی کیلئے بہتر نہیں اور اگر کرے تو منع بھی نہیں، مگر اس قدر نہ ہو کہ مقتدیوں پر گراں گزرے، عادتِ مسلمین یوں جاری ہے کہ امام بعد سلام جب تک دعا سے فارغ نہ ہو مقتدی شریک دعا رہتے ہیں اور اس سے قبل اُسے چھوڑ کر نہیں اٹھتے اور یہ اگرچہ شرعاً واجب نہیں مگر حسنِ ادب سے ہے۔ اقول و يمكن الاستيناس له بقوله عز وجل
 ”وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ“ فان فراغه من الدعاء يعد اذنامنه دلالة بذلك العرف جار۔

ترجمہ: ”(میں کہتا ہوں) اس پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے استدلال ممکن ہے ”اور جب وہ حضور علیہ السلام کے ساتھ کسی معاملہ میں جمع ہوتے ہیں، تو آپ کی اجازت کے بغیر جاتے نہیں“، کیونکہ دعا سے فراغت اذن ہی تصور ہوتا ہے اور اس پر عرف جاری ہے، تو ایسی حالت میں اتنی طویل دعا کہ بعض مقتدیوں پر ثقیل ہو بمطلقاً نہ کرنی چاہئے اگرچہ اس کے بعد سنت نہ ہو جیسے فجر و عصر، (فتاویٰ رضویہ جلد 8، ص: 356 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ: ”حدیث میں ہے حضور پُر نور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں: ان لربکم فی ایام دھرکم نفحات، فتعرضوا له لعله ان یصیبکم نفعہ منها فلا تشقون بعلمها ابدا۔ رواہ الطبرانی فی الکبیر عن محمد بن مسلمة رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ترجمہ: ”بیشک تمہارے رب کی طرف سے تمہارے ایام زندگی میں کچھ لحظات ایسے ہوتے ہیں، جن میں رحمتِ باری تعالیٰ کے جھونکے آتے ہیں، تو انہیں پانے کی

مدبیر کرو، شاید ان میں سے کوئی مبارک لمحہ تمہیں نصیب ہو جائے تو پھر کبھی بدبختی تمہارے پاس نہ آئے، اسے طبرانی نے کبیر میں محمد بن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

اور خود حدیث نے اُن اوقات میں سے ایک وقت ”اجتماع مسلمین“ کا نشان دیا کہ ایک گروہ مسلمان جمع ہو کر دعا مانگے، کچھ عرض کریں، کچھ آمین کہیں، کتاب المستدرک علی البخاری و مسلم میں ہے عن حبیب بن مسلمة الفهري رضي الله تعالى عنه و كان مستجاب الدعوات قال سمعت رسول الله ﷺ يقول لا يجتمع ملا فيدعوا بعضهم الا اجابهم الله۔

ترجمہ: ”حبیب بن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ مستجاب الدعوات تھے، فرماتے ہیں: میں نے حضور پر نور سید عالم ﷺ کو فرماتے سنا کہ جب بھی کوئی جماعت مسلمین جمع ہو اور ان میں سے بعض دعا کریں اور بعض آمین کہیں، تو اللہ عز و جل ان کی دعا قبول فرمائے گا۔

علماء نے مجمع مسلمین کو اوقات قبولیت دعا میں شمار کیا ہے۔ حسن حصین میں ہے: اجتماع المسلمین یعنی مسلمانوں کا اجتماع اوقات اجابت سے ہونا حدیث صحاح ستہ سے مستفاد ہے، علامہ علی القاری شرح میں فرماتے ہیں: ثم كل ما يكون الاجتماع فيه اكثر كالجمعة والعیدین وعرفة يتوقع فيه رجاء الاجابة اظهر۔ یعنی جس قدر مجمع کثیر ہوگا جیسے جمعہ وعیدین وعرفات میں، اسی قدر قبولیت دعا کی امید بہت زیادہ ہوگی، (فتاویٰ رضویہ جلد 8، ص: 522, 523 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

لہذا جہاں پہلے سے یہ امر معروف و معتاد ہے کہ جمعہ کے بعد اجتماعی دعا ہوتی ہے،

وہاں لوگوں کی اکثریت کا احترام کرنا چاہئے۔ آخر خطبہ جمعہ وعید کے وقت سنتیں یا نوافل پڑھنے کی ممانعت بھی اسی احترام کے سبب شروع ہے۔ اور اگر دعا کرنے والوں کے درمیان سے کوئی شخص کسی ضرورت کے تحت اٹھ کر جانا چاہے، تو اس کے لئے کوئی ممانعت نہیں ہے، البتہ اگر سنتیں وہیں پڑھنی ہیں تو اختتام دعا کا انتظار کر لے۔

کپڑا نکا کر چلنے یا گھسیٹے ہوئے چلنے کا حکم

نماز میں ”صفتِ ثوب، جز ثوب اور اسبابِ ازار“ کا حکم

محترم جناب مفتی صاحب روزنامہ ایکسپریس کی وساطت سے دواہم مسائل پیش کرنا ہوں، جن کی معاشرے میں اصلاح کرنا فرض عین ہے۔

سوال: 33

دورانِ نماز اور علاوہ نماز شلوار کو نیچے سے دوہرا اور پتلون پہنی ہو تو پانچوں سے دوہرا کرنا شرعی طور پر کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیونکہ ٹخنوں کو ڈھانپنا دوزخ کی طرف لے جاتا ہے، اگر شلوار یا پتلون لمبی ہو تو کیا کیا جائے حالانکہ اس کی نیت میں تکبر بھی نہیں ہے ازراہِ کرم حدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں، (حاجی عبدالشکور میر، راولپنڈی)۔

جواب:

نوٹ: اس مسئلے میں بعض حضرات بہت زیادہ حدت کرتے ہیں اور دوسروں سے نفرت اور تعلیٰ کرتے ہیں، یعنی اپنے تقوے اور پارسائی کا زیادہ ہی کچھ اظہار کرتے ہیں، خالص شرعی و دینی مسئلے میں توازن اور راہِ اعتدال کو چھوڑ دیتے ہیں، اس کے نتیجے میں بعض لبرل مزاج کے لوگ اسلام اور اہل دین پر طعن کرتے ہیں کہ ان کا

فہم اسلام فقط نماز میں شلوار و پانچے کی لمبائی چیک کرنے تک ہے، گرد و پیش میں جو اور بڑی برائیاں، ظلم و تعدی، استحصال، لوٹ کھسوٹ، ناجائز نفع خوری، رشوت خوری، حقوق انسانی کی پامالی، قتل و غارت اور دہشت گردی انہیں نظر نہیں آتی، نہ ہی وہ ان قومی اور معاشرتی جرائم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، خاص طور وہ دعوت و تبلیغ کی جماعتیں جنہوں نے نماز کو اسلام کا ایک اساسی رکن سمجھنے کے بجائے کل دین سمجھ لیا ہے اور دین کے باقی شعبان کی دعوت و تبلیغ تو جیہات اور ترجیحات کا محور نہیں ہیں۔

لہذا ہم نے مناسب سمجھا کہ ایک بار پھر اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو مع دلائل (احادیث و فقہ) تفصیل سے بیان کر دیا جائے، کسی شخص کو خود شارع بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے، کسی معاملے میں جو صحیح دینی مسئلہ ہے وہ بیان کر دینا چاہئے، اپنی طرف سے کسی مسئلے کی شدت یا حرمت میں اضافہ درست نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک شلوار کو نیفے کی جانب اڑ سنا، پتلون کے پانچے کی تھیں بنا کر نیچے سے موڑنا اور رکوع اور سجود میں ہونے کپڑوں کو سمیٹنا یا اوپر کو کھینچنا، اسی طرح آستھیوں کی تھیں بنا کر موڑنا یا جسے عرف عام میں آستین چڑھانا اور عربی میں ”تشمیر“ کہتے ہیں، تمام پر ”سکفِ ثوب“ کا اطلاق ہوتا ہے اور احادیث کی رو سے ممنوع ہے۔

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ، عن النبی ﷺ قال: ”وما اسفل من الکعبین من الازار ففی النار“۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ازار کا جتنا حصہ ٹخنوں سے نیچے ہو وہ جہنم میں ہے، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 5787)۔“

عن ابی ہریرۃ: ان رسول اللہ ﷺ قال: "لا ينظر الله يوم القيامة الى من جر ازاره بطرا"۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف قیامت کے روز نظر بھی نہیں فرمائے گا، جو ازارہ تکبر اپنی ازار (تہبند) کو گھسیٹ کر چلتا ہے، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 5788)۔"

عن ابی ہریرۃ قال: بينما رجل يصلي مسجلاً ازاره اذ قال له رسول الله ﷺ: "اذهب فتوضاً"، فذهب فتوضاً فقال له رجل: يا رسول الله، مالك امرته ان يتوضأ؟ قال: "انه كان يصلي وهو مسبل ازاره، وان الله جل ذكره لا يقبل صلاة رجل مسبل ازاره"۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں ایک شخص تہبند لٹکائے ہوئے نماز پڑھ رہا تھا، نبی ﷺ نے اس سے فرمایا: جا کر وضو کرو، اس نے جا کر وضو کیا، ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے اس کو وضو کرنے کا حکم کیوں دیا؟ آپ نے فرمایا: یہ شخص تہبند لٹکائے نماز پڑھ رہا تھا اور اللہ تعالیٰ تہبند لٹکانے والے کی نماز قبول نہیں کرتا، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: 638)۔"

تکبر کے بغیر یا اتفاقاً محض کے نیچے ازار لٹکنے کی رخصت کے متعلق احادیث:

عن سالم بن عبد الله، عن ابيه رضي الله عنه، عن النبي ﷺ قال: "من جر ثوبه خيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيامة"۔ قال ابو بكر: يا رسول الله، ان احد شقي ازارى يسترخى، الا ان اتعاهد ذلك منه؟ فقال النبي ﷺ: "لست ممن يصنعه خيلاء"۔

ترجمہ: "حضرت سالم بن عبد اللہ اپنے والد حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ

عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو تکبر کے باعث کپڑا گھسیٹے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف نظر نہیں فرمائے گا۔ حضرت ابو بکر عرض گزار ہوئے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! میری چادر کا ایک سرا غیر ارادی طور پر لٹک جاتا ہے۔ ماسوائے اس کے کہ ہمہ وقت ادھر متوجہ رہوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو تکبر کے باعث ایسا کرتے ہیں، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 5784)۔

عن ابی بکرۃ رضی اللہ عنہ قال: خسفت الشمس ونحن عند النبی ﷺ، فقال بحرثوبہ مستعجلاً، حتی اتی المسجد، وثاب الناس فصلی رکعتین فجعلی عنہا، ثم اقبل علینا، وقال: "ان الشمس والقمر ایتان من آیات اللہ، فاذا رأیتما شیئاً فصلوا، وادعوا للہ حتی یکشفہا"۔

ترجمہ: ”حضرت ابی بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سورج کو گرہن لگا اور ہم نبی کریم ﷺ کی خدمت میں موجود تھے کہ آپ جلدی سے کپڑا گھسیٹتے ہوئے اُٹھے یہاں تک کہ مسجد میں پہنچ گئے اور لوگ بھی جمع ہو گئے تو آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، جب تم انہیں گہن لگا ہو ادیکھو تو نماز پڑھو اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو، یہاں تک کہ وہ پورا نظر آنے لگے، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 5785)۔“

حدثنا شعبۃ قال: لقیت محارب بن دثار علی فرس، وهو یاتی مکانہ الذی یقضی فیہ، فسألتہ عن ہذا الحدیث فحدثنی فقال: سمعت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما یقول: قال رسول اللہ ﷺ: "من جرثوبۃ مُحیلة لم ینظر اللہ الیہ یومَ القیامۃ"۔ فقلت لمحارب: اذکر ازارہ؟ قال: ما خص ازاراً

ولا قميصا۔ تابعہ جبلة بن سحيم، وزيد بن اسلم، وزيد بن عبد اللہ، عن ابن عمر، عن النبی ﷺ۔ وقال الليث، عن زافع، عن ابن عمر: مثله۔ وتابعہ موسى بن عقیبة، وعمر بن محمد، وقدامة بن موسى، عن سالم، عن ابن عمر، عن النبی ﷺ: "من جر ثوبه خيلاء"۔

ترجمہ: "شعبہ کا بیان ہے کہ میں محارب بن وثار (قاضی کوفہ) سے ملا جبکہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر عدالت کی طرف جا رہے تھے، تو میں نے ان سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جواز راہ تکبر کپڑا گھسیٹ کر چلے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف نظر نہیں فرمائے گا، میں نے محارب سے پوچھا کہ کیا انہوں نے ازار کا ذکر کیا؟ فرمایا کہ ازار یا قمیص کی تخصیص نہیں کی۔ جبکہ بن حنیم زید بن اسلم اور زید بن عبد اللہ، حضرت ابن عمر نے نبی کریم ﷺ سے اسی کی روایت کی ہے۔ موسیٰ بن عقبہ، عمر بن محمد، قدامہ بن موسیٰ، سالم، حضرت ابن عمر نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی کہ جو اپنا کپڑا بطور تکبر گھسیٹ کر چلے گا، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 5791)۔"

عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ ﷺ: "من جر ثوبه خيلاء، لم ينظر الله اليه يوم القيامة"۔ فقال ابو بكر: ان احد شقي ثوبي يستر خفي، الا ان اتعاهد ذلك منه؟ فقال رسول اللہ ﷺ: "انك لست تصنع ذلك خيلاء"۔ قال موسى: فقلت لسالم: اذكر عبد اللہ: من جر ازاره؟ قال لم اسمعه ذكر الا ثوبه۔

ترجمہ: "حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا:۔ جواز راہ تکبر کپڑا گھسیٹے گا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا۔ حضرت ابو بکر کہنے لگے کہ میرے کپڑے کا ایک کونہ عموماً لٹک جاتا ہے، لہذا اب میں احتیاط کیا کروں گا، پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم ایسا ازراہ تکبر نہیں کرتے۔ موسیٰ بن عقبہ نے سالم سے دریافت کیا کہ کیا حضرت عبداللہ بن عمر نے ”من جواز راہ“ (یعنی جو شخص اپنی تہبند کو گھسیٹے) کہا ہے؟ جواب دیا: میں نے یہ الفاظ نہیں سنے، بلکہ میں نے تو یہ سنا کہ انہوں نے ”ثوبہ“ (یعنی مطلقاً کپڑا گھسیٹے ہوئے چلنے کی بابت) کہا ہے (صحیح بخاری رقم الحدیث: 3665)۔

عن ابن عباس قال: أمر النبي ﷺ أن يسجد على سبعة، ونهى أن يكف شعره و ثيابه۔ قال ابو الربيع: على سبعة أعظم، ونهى أن يكف شعره و ثيابه، الكفّين والركبتين والقدمين والجنبه۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سات (اعضاء) پر سجدہ کرنے کا حکم دیا اور نماز کی حالت میں بال سنوارنے اور کپڑوں کو موڑنے سے منع کیا گیا ہے، ابو الربیع کی روایت میں سات ہڈیوں پر سجدہ کرنے اور بالوں کو سنوارنے اور کپڑوں کو سمیٹنے کی ممانعت کا ذکر ہے، وہ سات ہڈیاں یہ ہیں، دو ہتھیلیاں، دو گھٹنے، دونوں قدم اور پیشانی، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1076)۔

اس حدیث میں ”کفّ ثوب“ سے ممانعت کا حکم ہے۔ ہمارے نزدیک کپڑوں کو نیچے کی جانب اڑنا، پتلون کے پانچے کی تہیں بنا کر نیچے سے اوپر موڑنا اور رکوع اور سجود میں جود میں ہوئے کپڑوں کو سمیٹنا یا اوپر کو کھینچنا سب اس کا مصداق بنتے ہیں، اسی طرح آستینوں کی تہیں بنا کر موڑنا یا جسے عرف عام میں آستین چڑھانا اور عربی میں ”تشمیر“ کہتے ہیں، اس پر بھی ”کفّ ثوب“ کا اطلاق ہوتا ہے اور مذکورہ بالا حدیث

مبارک اور دیگر احادیث کی روشنی کی رو سے ممنوع ہے۔

علامہ عینی لکھتے ہیں: من جرزازارہ من غیر قصد التخیل فانه لا باس به من غیر کراهة و كذلك يجوز لدفع ضرر يحصل له كان يكون تحت كعبه جراح او حكة او نحو ذلك ان لم يغطها تؤذيه الهوام كالذباب ونحوه بالجلوس عليها ولا يجد ما يسترها به الا زارہ او ردائه او قميصه وهذا كما يجوز كشف العورة للدواي وغير ذلك۔

ترجمہ: ”جس شخص نے بغیر قصد تکبر کے تہبند ٹخنوں کے نیچے باندھا اس میں کوئی کراہت نہیں ہے نہ کوئی حرج ہے، اسی طرح کسی ضرر کو دور کرنے کے لئے بھی ٹخنوں سے نیچے لباس لٹکانا جائز ہے، مثلاً اس کے ٹخنوں کے نیچے کوئی زخم ہو یا خارش ہو یا اگر وہ ٹخنوں کو نہ ڈھانپے تو اس پر مکھیاں اور حشرات الارض کے بیٹھنے کا خطرہ ہو اور لمبی قمیص یا لمبا تہبند اور کوئی چیز ڈھانپنے کے لئے میسر نہ ہو۔

علامہ عینی مزید لکھتے ہیں: انه لا حرج على من يجرزازارہ بغیر قصد كما ذكرنا ه فان قلت روى ابن ابی شیبہ عن ابن عمر انه كان يكره جرزازار علی کل حال قلت قال ابن بطلال هو من تشديداته والا فقد روى هو حديث الباب فلم يخف عليه الحكم۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ جب حضرت ابو بکر نے اپنے تہبند کے ایک جانب پھسل جانے کا ذکر کیا تو نبی ﷺ نے فرمایا: تم تکبر سے ایسا نہیں کرتے، (یعنی تم پر اس وعید کا اطلاق نہیں ہوتا)، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس شخص کا تہبند بلا قصد پھسل جائے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر یہ اعتراض ہو کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہر حال میں تہبند لٹکانے کو مکروہ کہتے تھے، اس کے جواب

میں علامہ ابن بطال نے کہا ہے کہ یہ حضرت ابن عمر کی تشدیقات (یعنی احتیاط کی بنا پر کسی مسئلے میں شدت کرنا) میں سے ہے ورنہ حضرت ابن عمر تو خود اس حدیث کے راوی ہیں ان سے یہ حکم کیسے مخفی ہو سکتا ہے، (عمدة القاری، جلد 1 ص: 296 مطبوعہ دارۃ الطباعة المنیر یہ، مصر)۔“

علامہ علی قاری علیہ رحمۃ الباری لکھتے ہیں: لدلالة ظواهر الاحادیث علیہا فان كان للخیلاء فهو ممنوع منع تحريم والا فممنوع تنزیہ۔

ترجمہ: ”بخاری کی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تکبر کے ساتھ کپڑا لٹکا کر چلنا مکروہ تحریمی ہے اور اگر تکبر کی نیت سے نہ ہو تو مکروہ تنزیہی ہے، (مرقات، جلد 8 ص: 239 مطبوعہ مکتبہ امدادیہ، ملتان)۔“

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں: اگر کوئی شخص تکبر، اسراف اور طغیان (سرکشی) کی نیت سے اپنے تہبند کو لمبا بناتا ہے اور اس کو گھیٹتا ہے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف لطف و عنایت کی نظر نہیں فرمائے گا۔ اس قید سے معلوم ہوا کہ اگر تہبند اس طرح نہ ہو تو حرام نہیں ہے لیکن مکروہ تنزیہی ہے، اور اگر کوئی عذر ہو مثلاً سردی ہو یا کوئی بیماری ہو (مثلاً ٹخنے کے نیچے کوئی زخم ہو جس پر کھیاں بیٹھتی ہوں ان سے زخم کو بچانے کے لئے ٹخنہ ڈھانپے) تو بالکل مکروہ نہیں ہے، (اشعة اللمعات، جلد 3 ص: 536، 537 مطبوعہ: مطبع تیج کمار لکھنؤ)۔“

مزید لکھتے ہیں: حرام وہ صورت ہے جب کوئی شخص عجب اور تکبر سے کپڑا لٹکائے،۔۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: طعام اور لباس میں توسیع، اسراف اور تکبر کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے اور اگر اس طرح نہ ہو تو پھر مباح ہے، (اشعة اللمعات، جلد 3 ص: 555، 555 مطبوعہ: مطبع تیج کمار لکھنؤ)۔“

علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں: فی الخلاصة ان یکره کذا فی شرح منیة المصلی ویدخل ایضاً فی کف الثوب تشمیر کمه کما فی فتح القدير وظاهره الاطلاق وفي الخلاصة ومنیة المصلی قید الکراهة بان یكون رافعاً کمیه الی المرفقین وظاهره انه لا یکره اذا کان یرفعها الی مادیونها والظاهر الاطلاق لصدق کف الثوب علی کل و ذکر فی المحتجبی فی کراهية تشمیه الکمین قولین -

ترجمہ: ”خلاصہ میں مذکور ہے کہ نمازی کا کپڑا موڑنا مکروہ ہے، اسی طرح ”شرح منیة المصلی“ میں ہے اور کپڑا موڑنے میں آستنیوں کا اڑنا بھی شامل ہے اسی طرح ”فتح القدير“ میں ہے اور یہ بظاہر مطلق ہے، لیکن ”خلاصہ“ اور ”منیة المصلی“ میں ہے کہ اگر آستنیوں کو کہنیوں تک چڑھا لیا تو مکروہ ہوگا اور کہنیوں سے کم تک آستین چڑھائی ہیں تو مکروہ نہیں ہوگا، لیکن تحقیق یہ ہے کہ ہر حال میں مکروہ ہوگا کیونکہ کپڑا موڑنے کا اطلاق ہر صورت پر آتا ہے اور ”مجتبی“ میں آستین چڑھانے کی کراہت کے بارے میں دو قول ذکر کئے گئے ہیں، (یعنی ایک کراہت کا اور دوسرا عدم کراہت کا)، (البحر الرائق، جلد 2، ص: 24، مطبوعہ طبعہ علمیہ، مصر)۔“

علامہ علاؤ الدین ہسکفی لکھتے ہیں: (و) کره (کفه) ای رفعه ولو لترا ب کمشمر کم أو ذیل (وعبثه به) ای بشوبہ۔

ترجمہ: ”اور کپڑے کا سمیٹنا یعنی اوپر اٹھانا مکروہ ہے، خواہ مٹی سے بچنے کے لئے ایسا کرے، جیسے آستین چڑھانا یا دامن کو اوپر اٹھانا اور کپڑے کے ساتھ کھیلنا۔“

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ای کمالو دخل فی الصلاة وهو مشمّر کمه أو ذیلہ، وأشار بذلك الی أن الکراهة لا تختص بالكف

وہو فی الصلۃ ، کما افادہ فی ”شرح المنیۃ“، لکن قال فی ”القنیۃ“: و اختلف فیمن صلی وقد شمر کعبہ لعل کان یعملہ قبل الصلۃ أو ہیئتہ ذلک ومنہ ما لو شمر للوضوء ثم عجل لادراک الركعة مع الامام۔ و اذا دخل فی الصلۃ كذلك وقلنا بالکراہۃ فهل الافضل إرخاء کعبہ فیہا بعمل قليل أو ترکہما؟ لم أرہ: والأظهر الأول بدلیل قوله الآتی: ”ولو سقطت قلنسوتہ فاعادتها أفضل“ تأمل۔

ترجمہ: ”یعنی جس طرح ایک شخص نماز میں داخل ہوتے وقت ہی آستین یا دامن چڑھائے ہوئے تھا، اس سے اس جانب اشارہ ہے کہ کراہت صرف اس صورت کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ نماز کے اندر آستین چڑھائے تو تب مکروہ ہے، جیسا کہ ”شرح المنیۃ“ سے بھی یہی مفہوم مستفاد ہوتا ہے۔ لیکن ”القنیۃ“ میں کہا ہے کہ: ”اس امر میں اختلاف رائے ہے کہ ایک شخص نے نماز پڑھی اور وہ (نماز میں داخل ہونے سے) پہلے ہی کسی کام کی بناء پر آستین چڑھائے ہوئے تھا یا اس کی ہیئت ہی ایسے ہے۔“ اور انہی میں سے ایک صورت یہ ہے کہ اس نے وضو کے لئے آستین چڑھائے، پھر امام کے ساتھ رکعت پانے کی خاطر عجلت کرے اور اسی حالت میں نماز میں داخل ہو جائے، تو ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی مکروہ ہے، تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اب نماز کے اندر عمل قلیل کے ذریعے آستینیں کھول دے یا اپنی حالت پر چھوڑ دے، میں نے کسی کتاب میں اس کا جواب نہیں پایا، لیکن زیادہ واضح بات پہلے والی بات ہے (یعنی یہ کہ عمل قلیل سے کھول دے)، اس کی دلیل علامہ حصکفی کے اس قول سے ملتی ہے کہ: ”اگر نمازی کی ٹوپی گر جائے تو اٹھا کر سر پر رکھ لینا ہی افضل ہے، غور کیجئے۔“

آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں کہ: وقید الکراہۃ فی ”المخلاصة“ و ”المنیۃ

”بأن يكون رافعاً كميته الى المرفقين - وظاهره أنه لا يكره الى مادونهما -
قال في ”البحر“: والظاهر الاطلاق لصدق كف الثوب على الكل -

ترجمہ: ”خلاصہ“ اور ”منیہ“ میں کراہت کو اس صورت کے ساتھ مقید کیا ہے کہ آستینیں کہنیوں تک چڑھائی ہوئی ہیں، اور اس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ کہنیوں سے نیچے تک چڑھانا، باعث کراہت نہیں ہے، لیکن ”البحر الرائق“ میں لکھا ہے کہ ظاہر یہی ہے کہ مطلقاً آستینیں چڑھانا (کہنیوں سے نیچے ہو یا اوپر) کراہت کا سبب ہے کیونکہ ”مسکت ثوب“ تمام صورتوں پر صادق آتا ہے۔ (رد المحتار جلد: 2، ص: 350، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

امام احمد رضا قادری سے پوچھا گیا ”آستینیں کہنی تک چڑھی ہوئی نماز پڑھنی مکروہ ہے یا نہیں؟“ جواب دیا: ”ضرور مکروہ اور سخت و شدید مکروہ ہے۔“ (فتاویٰ رضویہ، جلد 7، ص: 311، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔

مفتی محمد ادریس کاندھلوی دیوبندی لکھتے ہیں:

قوله من جرّازاره بطراً ای تکبراً وفرحاً وطغیاناً ویفهم ان جرّة بغير ذالك لا يكون حراماً لکنه مکروه کراهة تنزیه۔

ترجمہ: ”رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ: جو شخص تکبر، نشاط اور سرکشی کی نیت سے اپنا کپڑا زمین پر گھسیٹ کر چلا، (حدیث مبارک کے ان الفاظ سے) یہ مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنا لباس گھسیٹے ہوئے زمین پر چلتا ہے، لیکن اس کی نیت تکبر و سرکشی کی نہیں ہے، تو اس کا یہ عمل حرام نہیں ہوتا، بلکہ مکروہ تنزیہی ہوگا، (التعلیق الصبح، ج: 4، ص: 383)۔“

”مسکت ثوب“ کو بیشتر فقہاء کرام نے مکروہ تحریمی کہا ہے اور بقول علامہ ابن عابدین

شامی جو کراہت کی نفی کرتے ہیں وہ کراہت تحریمی کی نفی کرتے ہیں، کراہت تنزیہی سب کے نزدیک ثابت ہے، (منہ الخالق حاشیہ البحر الرائق ج ۲ ص ۲۴) اور اس حکم کراہت میں وہ تمام صورتیں شامل ہیں جو شروع میں ذکر کر دی گئی ہیں۔ نماز میں ہیئت لباس کے بارے میں اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے: لَیْسَیْ آدَمَ خُلُوْا زَیْنَتُکُمْ عِندَ کُلِّ مَسْجِدٍ۔

ترجمہ: ”اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنا لباس (زینت) اختیار کیا کرو، (الاعراف: 30)۔“

یعنی نماز باوقار لباس پہن کر پڑھنی چاہئے اور اوپر ”کف ثوب“ کی جتنی صورتیں بیان کی ہیں، یہ سب وقار کے منافی ہیں، یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ وضع اختیار کر کے کسی باوقار اور ذی وجاہت ہستی کے سامنے نہیں جاتا، چہ جائے کہ ”احکم الحاکمین“ کی بارگاہ میں حاضر ہو۔ اگر کوئی شخص ہاف کٹ آستین والی قمیص پہنے ہوئے ہے، یعنی ایسی قمیص جس کی آستین کی اصل وضع اور ساخت ہاف کٹ ہے، یعنی کہنیوں یا اس سے اوپر ہے، اس کو پہن کر نماز پڑھی جائے تو مکروہ نہیں ہوگی، کیونکہ نماز میں پہنچوں تک آستینوں کا رکھنا ضروری نہیں ہے (یعنی قباحات اس میں ہے کہ اپنی ساخت میں قمیص پوری آستین والی ہو اور پھر خلاف وضع آستین چڑھا کر نماز پڑھے)۔ عہد رسالت سے لے کر آج تک کے مسلمان احرام باندھ کر نماز پڑھتے ہیں اور احرام میں پوری کلائیاں ڈھکی ہوئی نہیں ہوتیں اور نہ انہیں ڈھکنے کا حکم دیا گیا ہے، نیز نبی ﷺ اور متعدد صحابہ کرام نے ایک کپڑا اپنے جسم پر لپیٹ کر بھی نماز پڑھی ہے اور اس صورت میں پوری کلائیوں کا ڈھکنا متصور ہی نہیں ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی اس مسئلے پر مفصل بحث کرتے ہوئے اپنی تحقیقی بیان میں

فرماتے ہیں: ہماری تحقیق یہ ہے کہ احادیث میں ”ہجرِ ثوب اور“إسبال ازار“ کے الفاظ ہیں۔ ”ہجرِ ثوب“ کا معنی ہے کپڑا گھسیٹنا اور ”إسبال ازار“ کا معنی ہے تہبند کا ٹخنوں سے نیچے ہونا۔ اگر کوئی مرد ہجرِ ثوب کرے یعنی اس کا تہبند یا شلوار کا پانچہ ٹخنوں سے بہت نیچا ہو حتیٰ کہ اس کے قدموں سے نیچے گھسٹ رہا ہو تو یہ بغیر تکبر کے بھی مکروہ تحریمی ہے، کیونکہ اس میں بغیر کسی ضرورت اور بغیر کسی فائدہ کے کپڑے کو ضائع کرنا ہے ہو یہ اسراف کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب کپڑا قدموں کے نیچے زمین پر گھسٹتا رہے گا تو نجاست کے ساتھ آلودہ ہوگا اور کپڑے کو محلِ نجاست میں ڈالنا بھی مکروہ تحریمی ہے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ اس میں عورتوں کے ساتھ مشابہت ہے، کیونکہ عہدِ رسالت میں عورتیں کپڑا گھسیٹ کر چلتی تھیں اور مردوں کے لئے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا بھی مکروہ تحریمی ہے اس لئے اگر ہجرِ ثوب بغیر تکبر کے ہو پھر بھی مکروہ تحریمی ہے۔ حافظ ابن عبد البر مالکی نے اس کو مذموم فرمایا ہے (تمہید جلد: 3، ص: 244)۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کو مکروہ تحریمی فرمایا ہے، (فتح الباری، جلد: 10، ص: 263)۔ اور اگر ”ہجرِ ثوب“ میں کپڑا گھسیٹنے کے ساتھ اظہارِ تکبر بھی ہو تو یہ شدید مکروہ تحریمی ہے بلکہ حرام ہے، اور اگر ”إسبال ازار“ ہو یعنی تہبند یا شلوار کا پانچہ ٹخنوں کے نیچے ہو لیکن اس کے قدم و قامت کے برابر ہو گھسٹ نہ رہا ہو تو اگر اس میں تکبر نہیں ہے صرف زیہنت کی وجہ سے ایسا کیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ صرف خلافِ اولیٰ ہے اور اگر اس کے ساتھ تکبر کرتا ہے اور اکڑا کڑا کر چلتا ہے اور اتراتا ہے تو پھر یہ تکبر کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ حرمت کی علت صرف تکبر ہے، اگر ایک مرد نصف پنڈلیوں تک تہبند باندھتا ہے اور اس کے ساتھ تکبر کرتا ہے اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں سے زیادہ متقی اور پرہیزگار سمجھتا ہے اور ان کو حقیر

سمجھتا ہے تو یہ بھی مکروہ تحریمی ہے بلکہ حرام ہے، اس لئے حرمت میں اصل تکبر ہے۔

ہماری اس تحقیق کی تائید حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی 852ھ کی اس عبارت میں ہے: ”اگر کسی شخص کا لباس بغیر تکبر کے ٹخنوں سے نیچے لٹک رہا ہو تو اس کا حال مختلف ہے اگر وہ کپڑا اس کے ٹخنوں کے نیچے لٹک رہا ہو لیکن وہ کپڑا پہننے والے کے قد اور اس کی قامت کے برابر ہو تو اس میں تحریم ظاہر نہیں ہوگی، خصوصاً جبکہ بلا قصد ایسا ہو (یعنی غیر ارادی طور پر تہبند یا شلوار پیٹ سے پھسل کر ٹخنوں سے نیچے لٹک گئی ہو)، جیسا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لئے اس طرح واقع ہوا، اور اگر کپڑا پہننے والے کے قد و قامت سے زائد ہو تو اس سے منع کیا جائے گا کیونکہ اس میں اسراف ہے اور اس کو حرام کہا جائے گا، اور یہ اس وجہ سے بھی ممنوع ہوگا کہ اس میں عورتوں کی مشابہت ہے اور یہ پہلی وجہ سے زیادہ قوی وجہ ہے، کیونکہ امام حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس مرد پر لعنت فرمائی ہے جو عورتوں کے لباس کی نوع کا لباس پہنتا ہے، اور یہ اس وجہ سے بھی ممنوع ہوگا کہ اس طرح کا لباس پہننے والا اس خدشے سے محفوظ نہیں ہوگا کہ اس کے لباس پر نجاست لگ جائے (کیونکہ اس کا لباس قدموں کے نیچے لٹک رہا ہے) اور اس ممانعت کی طرف اشارہ اس حدیث میں ہے جس کو امام ترمذی نے شاکل (رقم الحدیث: 121) میں اور امام نسائی نے سنن کبریٰ (رقم الحدیث: 9682, 9683) میں حضرت عبید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں ایک تہبند باندھے ہوئے جا رہا تھا اور وہ تہبند زمین پر کھسٹ رہا تھا کہ اچانک ایک شخص نے کہا: اپنا کپڑا اوپر اٹھاؤ اس میں زیادہ صفائی اور زیادہ بقا ہے، میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ نبی ﷺ تھے، میں نے کہا نیا رسول اللہ! یہ تو ایک سیاہ اور سفید دھاریوں والا تہبند ہے (یعنی اس معمولی کپڑے میں

تکبیر کرنے کا کوئی معنی نہیں ہے)، آپ نے فرمایا: کیا تمہارے لئے میری شخصیت میں نمونہ نہیں ہے؟، میں نے دیکھا تو آپ نے آدھی پنڈلیوں تک تہبند باندھا ہوا تھا (مسند احمد جلد 5 ص: 364) اور اس وجہ سے بھی ممنوع ہے کہ کپڑا گھسیٹنے میں تکبیر کی بدگمانی ہوتی ہے۔ قامت سے نیچے کپڑا لٹکانا کپڑا گھسیٹنے کو مستلزم ہے اور کپڑا گھسیٹنا تکبیر کو مستلزم ہے خواہ پہننے والے نے تکبیر کا قصد نہ کیا ہو اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، احمد بن منیع نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم تہبند کو گھسیٹنے سے بچو کیونکہ تہبند کو گھسیٹنا تکبیر سے ہے، (فتح الباری جلد 10 ص: 263, 264 مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور)، (تبیان القرآن جلد 4، ص: 331, 330, 323, 322 مطبوعہ: فرید بک اسٹال، لاہور)۔“

تسبیحات فرض کے فوراً بعد پڑھی جائیں یا سُنن و نوافل کے بعد؟

سوال: 34

کیا فرض نماز کے فوراً بعد تسبیحات وغیرہ پڑھنا افضل ہے یا پہلے بقیہ نماز مکمل کرنا افضل ہے؟، کیونکہ کچھ نمازی فرض نماز کے بعد تسبیحات وغیرہ پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں اور بقیہ نماز بعد میں ادا کرتے ہیں، اس طرح اگلی صف میں بیٹھے ہوئے نمازی جو پہلے نماز مکمل کر لیتے ہیں انہیں، واپس اپنے کام پر جانے کی جلدی ہوتی ہے، اس طرح جلدی جانہیں پاتے ہیں، (قاری محمد مختار یاقانی، مدرس دارالعلوم نعیمیہ)۔

جواب:

نماز کے بعد تسبیحات و اذکار کی فضیلت احادیث میں کثرت سے وارد ہوئیں ہیں: عن کعب بن عجرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: ”مُعَقَّبَات

لَا يَسْتَحِبُّ قَائِلُهُنَّ "يُسَبِّحُ اللَّهُ فِي دُبُرِ الصَّلَاةِ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، وَيُحَمِّدُهُ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، وَيُكَبِّرُهُ أَرْبَعًا وَثَلَاثِينَ"۔

ترجمہ: ”کعب بن عجرہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کچھ کلمات (نماز کے بعد بلا فاصلہ کہنے کے ہیں) جن کا کہنے والا نامراد نہیں رہتا، (ان کلمات میں) نماز کے بعد تینتیس مرتبہ ”سبحان اللہ“ کہنا، تینتیس مرتبہ ”الحمد للہ“ کہنا، چونتیس مرتبہ ”اللہ اکبر“ کہنا، (سنن نسائی، رقم الحدیث: 1348)۔“

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: یکرہ تاخیر السنة الا بقدر : اللهم أنت السلام الخ۔ قال المحلوی : لا بأس بالفصل بالأوراد ، واختاره الكمال ، قال المحلبي : ان أريد بالمكراهة التنزيهية إرتفع الخلاف - قلت : وفي حفظي حملة على القليلة ، ويستحب أن يستغفر ثلاثاً ويقرأ آية الكرسي والمعوذات ويسبح ويحمّد ويكبر ثلاثاً وثلاثين ؛ ويهلل تمام المائة ويدعوا ويختتم بسبحان ربك ۔

ترجمہ: ”سنتوں میں تاخیر“ اللهم أنت السلام“ (حدیث پاک میں روایت کردہ پورے کلمات یہ ہیں: اللهم أنت السلام و منك السلام، تباركت يا ذا الجلال والإكرام) کی مقدار سے زیادہ مکروہ ہے۔ حلوانی نے فرمایا: اذکار کے ساتھ فرائض و سنن میں فاصلے میں کوئی حرج نہیں، کمال نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ حلی کہتے ہیں: کہ اگر کراہت سے کراہت تنزیہی مراد ہے تو اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔ (قلت میں کہتا ہوں) اور مجھے یہاں تک یاد ہے کہ یہ (تنزیہی) قلیل فصل پر محمول ہے، اور مستحب یہ ہے کہ تین مرتبہ استغفار پڑھے، آیہ الکرسی اور معوذات (سورة الفلق وسورة الناس) تلاوت کرے اور ”سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر“ تینتیس، تینتیس مرتبہ پڑھے، اور

سوویں مرتبہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ پڑھے، اس کے بعد دعا کرے اور اختتام ”سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ پر کرے، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 2 ص: 218، 219، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (إِلَّا بِقَدَرِ اللّٰهُمَّ الْح) لِمَا رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: ”كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَقْعُدُ إِلَّا بِمَقْدَارٍ مَا يَقُولُ: اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ، تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ“ واما ما وَرَدَ مِنَ الْاَحَادِيثِ فِي الْاَذْكَارِ عَقِيبَ الصَّلَاةِ فَلَا دَلَالَةَ فِيهِ عَلَى الْاِيْمَانِ بِهَا قَبْلَ السُّنَّةِ، بَلْ يُحْمَلُ عَلَى الْاِيْمَانِ بِهَا بَعْدَهَا، لِأَنَّ السُّنَّةَ مِنْ لَوْاحِقِ الْفَرِيضَةِ وَتَوَابِعِهَا وَمُكْمَلَاتِهَا فَلَمْ تَكُنْ أَجْنَبِيَّةً عَنْهَا، فَمَا يَفْعَلُ بَعْدَهَا يُطْلَقُ عَلَيْهِ أَنَّهُ عَقِيبَ الْفَرِيضَةِ۔

ترجمہ: ”(یعنی مقدار: اللّٰهُمَّ الْح) کیونکہ مسلم اور ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ صرف ”اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ، تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ“ کی مقدار ہی بیٹھتے تھے، اور دیگر روایات میں جو نماز کے بعد اذکار کا ذکر ہے اس میں یہ دلالت نہیں کہ وہ اذکار سنتوں سے پہلے ہوتے تھے بلکہ (ان تسبیحات واوراد کے پڑھنے کو سنتوں کے بعد پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے)، کیونکہ سنتیں فرائض کے ساتھ لاحق ہوتی ہیں اور ان کے تابع ہوتی ہیں، اور ان (میں نا دانستہ طور پر کوئی کمی رہ جائے تو اس کی) تکمیل کا سبب ہیں، لہذا یہ فرائض سے بالکل الگ کوئی چیز نہیں ہیں، لہذا جو تسبیحات ان سنتوں کے بعد پڑھی جائیں، ان کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ عمل فرضوں کے بعد ادا ہوا، ((ردالمحتار

علی الدر المختار جلد 2 ص: 218، 219، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔
 وہ فرض نمازیں، جن کے بعد سنتیں ہیں، (یعنی ظہر و جمعہ و مغرب و عشاء) ان نمازوں
 کے بعد دعا بھی مختصر کرنی چاہئے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا
 کہ ”بعد نماز جمعہ انحراف قبلہ یعنی دائیں یا بائیں مڑ کر مناجات کرنا جائز ہے یا نہیں؟“
 آپ نے جواب میں تحریر فرمایا: ”امام کا بعد سلام قبلہ سے انحراف تو مطلقاً سنت ہے اور
 اس کا ترک یعنی بعد سلام قبلہ رو بیٹھا رہنا امام کے لئے بالاجماع مکروہ ہے، جمعہ وغیرہ
 سب نمازیں اس حکم میں برابر ہیں اور بعد سلام دعا و مناجات بھی بالاجماع جائز ہے
 مگر جس نماز کے بعد سنت ہے یعنی ظہر و جمعہ و مغرب و عشاء اس کے بعد طویل تاخیر کسی
 کیلئے بہتر نہیں اور اگر کرے تو منع بھی نہیں، مگر اس قدر نہ ہو کہ مقتدیوں پر گراں
 گزرے، عادت مسلمین یوں جاری ہے کہ امام بعد سلام جب تک دعا سے فارغ نہ ہو
 مقتدی شریک دعا رہتے ہیں اور اس سے قبل اُسے چھوڑ کر نہیں اٹھتے اور یہ اگرچہ شرعاً
 واجب نہیں مگر حسن ادب سے ہے۔ اقول ویمكن الاستیناس له بقوله عزّو جلّ
 ”وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ“ فَإِنِ فَرَغَهُ مِنَ
 الدُّعَاءِ يُعَدُّ إِذْنًا مِنْهُ دَلَالَةٌ بِإِلَافِكَ الْعُرْفِ جاز۔

ترجمہ: ”(میں کہتا ہوں) اس پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے استدلال ممکن ہے
 ”اور جب وہ حضور علیہ السلام کے ساتھ کسی معاملہ میں جمع ہوتے ہیں، تو آپ کی
 اجازت کے بغیر جاتے نہیں“، کیونکہ دعا سے فراغت اذن ہی تصور ہوتا ہے اور اس پر
 عرف جاری ہے، تو ایسی حالت میں اتنی طویل دعا کہ بعض مقتدیوں پر ثقیل ہو مطلقاً نہ
 کرنی چاہئے اگرچہ اس کے بعد سنت نہ ہو جیسے فجر و عصر، (فتاویٰ رضویہ
 جلد 8، ص: 356 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“

فرض کے بعد اذکار کے بارے میں یہ دو احادیث بھی ملاحظہ ہوں: قال رسول اللہ ﷺ من قرأ آية الكرسي دبر كل صلاة مكتوبة لم يمنعه من دخول الجنة الا الموت وزاد الطبرانی وقل هو الله احد۔

ترجمہ ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی اس کے لئے جنت میں جانے سے موت کے سوا اور کوئی چیز رکاوٹ نہیں ہے۔ اور طبرانی نے قل هو الله احد پڑھنے کی زیادتی بھی روایت کی ہے، (سنن نسائی، رقم الحدیث: ۱۰۰۰)۔

عن عقبه بن عامر قال امرني رسول الله ﷺ ان اقرأ المعوذات في دبر كل صلاة۔

ترجمہ ”حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں ہر نماز کے بعد قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس، (یہ سورتیں) پڑھا کروں، (سنن نسائی، رقم الحدیث: 1335)۔“

ان پر بحث کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

”امام ابن ہمام نے ان اذکار کی یہ تاویل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سنتیں پڑھنے کے بعد یہ اذکار پڑھا کرتے تھے اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ فرض کے بعد یہ اذکار پڑھتے تھے جیسا کہ صحیح مسلم کی (حدیث نمبر 1243) اور ابن حبان، نسائی اور طبرانی کی آیت الکرسی والی حدیث ہے علامہ ابن ہمام نے کہا سنتیں چونکہ فرض کے بعد پڑھی جاتی ہیں اس لیے جو ذکر سنتوں کے بعد ہو گا وہ فرض کے بعد ہی ہو گا۔ اس پر پھر اعتراض ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سنن اور نوافل گھر میں پڑھتے تھے پھر صحابہ کرام کو کیسے پتا چلا کہ رسول اللہ نماز کے بعد یہ ذکر

کرتے تھے۔ مثلاً صحیح مسلم میں ہے: حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کا سلام پھیرنے کے بعد باواز بلند پڑھتے تھے۔ لا الہ الا اللہ وحده لا شریک له له المملک وله الحمد وهو علی کل شیء قدیر لا حول ولا قوۃ الا باللہ لا الہ الا اللہ ولا نعبد الا ایاہ له النعمۃ وله الفضل وله الثناء الحسن لا الہ الا اللہ مخلصین له الدین ولو کرہ الکافرون۔۔۔۔۔ تو امام ابن ہمام تاویل ورتاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے حجرہ کے باہر سے ذکر کی آواز سن لیتے تھے۔ اس تاویل سے قطع نظر ابن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ کا ذہن اس اعتراض کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔۔۔ کہ صحابہ بھی تو اس وقت اپنے اپنے گھروں میں سنن اور نوافل پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ سنن ابن حبان میں جو روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی اس کے جنت میں جانے کے لئے موت کے سوا کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس روایت کے الفاظ ابن ہمام کی تاویل کا ساتھ نہیں دیتے۔ حضرت عائشہ نے جو روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَام کی مقدار تک بیٹھتے تھے یہ دوام واستمرار پر محمول نہیں ہے بعض اوقات آپ صرف اللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَام وَمِنْكَ السَّلَام پڑھنے تک بیٹھتے اور بعض اوقات اس سے زیادہ مقدار تک بیٹھتے اور ذکر کرتے رہتے۔ امت کی سہولت کے لئے آپ نے نہ کسی ایک ذکر کو معین کیا نہ کسی ایک مقدار کو معین فرمایا، یہی تو جیہہ آپ کی زندگی کے عام معمولات کے موافق ہے۔ بہر حال نمازی فرض نماز پڑھنے کے بعد آیت الکرسی پڑھے، تین مرتبہ استغفر اللہ الذی لا الہ الاہو۔ پڑھے اور کلمہ شریف کا ذکر کرے، کیونکہ ان کے پڑھنے پر بہت اجر و ثواب اور جنت کی بشارت ہے۔ نیز فرض کے بعد سنتیں پڑھنے میں اصل سنت یہ ہے کہ سنتیں گھر

میں پڑھی جائیں۔ دیگر احادیث سے بھی یہ ثابت ہے کہ فرض اور سنن میں فاصلہ ہونا چاہئے، اس لیے افضل یہی ہے کہ ان اذکار کو فرض کے بعد پڑھا جائے۔ فرض نماز کے بعد اذکار کے سلسلہ میں اس حکایت پر بھی عمل کرنا چاہئے۔

ابن قیم جوزی سند ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں ابو بکر بن محمد بیان کرتے ہیں کہ میں ابو بکر بن مجاہد کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اچانک وہاں شبلی آگئے، تو ابو بکر بن مجاہد نے اٹھ کر ان سے معاف کیا اور ان کی آنکھوں کے درمیان (پیشانی پر) بوسہ دیا، میں نے ان سے کہا یا سیدی آپ شبلی کی اس قدر تعظیم کر رہے ہیں، حالانکہ بشمول آپ کے تمام اہل بغداد کے خیال میں یہ دیوانہ ہے۔ ابو بکر بن مجاہد نے کہا میں نے شبلی کی اس طرح تعظیم کی ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے اس کی تعظیم کی تھی، کیونکہ میں نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی۔ آپ کی خدمت میں شبلی حاضر ہوا، آپ نے کھڑے ہو کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! آپ شبلی کو کیوں سرفراز فرما رہے ہیں؟، آپ نے فرمایا، یہ ہر فرض کے بعد یہ آیت پڑھتا ہے۔ ”لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ“ (یعنی سورہ توہہ کی آخری دو آیات)، اس کے بعد تین مرتبہ کہتا ہے ”صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْكَ يَا مُحَمَّد“۔ بعد میں میری شبلی سے ملاقات ہوئی، میں نے اس سے پوچھا تم درود کس طرح پڑھتے ہو؟، انہوں نے اسی طرح بتایا، (شرح صحیح مسلم، جلد: 2، ص: 194، 195)۔ ”جیسا کہ معلوم ہوا کہ جماعت فرض کے بعد سنتیں گھر پر پڑھنا افضل ہیں، تاہم مسجد میں بھی پڑھ سکتے ہیں، البتہ جماعت کے بعد مسجد میں دیر تک سنن و نوافل پڑھنے والے حضرات اس امر کا اہتمام ضرور کریں کہ مسجد سے باہر جانے والوں کے لئے راستہ موجود ہو اور انہیں نمازی کے آگے سے نہ گزرنا پڑے، اگر کہیں دیوار یا پلر ہے تو اسے مُترہ بنا کر کھڑے

ہو جائیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ فرائض کے بعد بعض نمازی جلدی سے آخری صف میں سنتوں یا نوافل کی نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور نماز ختم کر کے باہر نکلنے والے نمازیوں کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا کہ وہ نماز کی حرمت کو پامال کر کے اس کے آگے سے گزریں، اسی طرح بعض نمازی پچھلی صفوں میں دروازوں کے عین سامنے سنتوں یا نوافل کی نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور نمازی کے لئے پیچھے نکل کر جانے کا راستہ ہی نہیں رہتا، پس نمازیوں کو ان تمام امور کا خیال رکھنا چاہئے۔

نَفْسِ اسْلَام

WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿کتاب المساجد﴾

مسجد کی چھت پر بالغ طالبات کے در سے کا حکم

سوال: 35

اگر کوئی شخص مسجد کی چھت پر بالغ لڑکیوں کا مدرسہ قائم کرے، اور اس میں بالغ و نابالغ لڑکیاں تعلیم حاصل کریں۔ سوال یہ ہے کہ آیا مسجد کی چھت کو ایسے مدرسہ کے لئے وقف کرنا جائز ہے یا نہیں؟، ازراہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرما کر ثواب دارین حاصل کریں، (مولانا محمد بہرام خان نعیمی، جامع مسجد قادریہ، بلیر کالونی، کراچی)۔

جواب:

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ مسجد آسمان کی بلندی اور زمین کی گہرائی (تحت الثری) تک مسجد ہی ہے، علامہ علاء الدین ہسکمی لکھتے ہیں: قوله الى عنان السماء بفتح العين و كذا الى تحت الثرى كما فى البيروى عن الاستيعابى - ترجمہ: ”مسجد آسمان کی بلندی سے تحت الثری تک مسجد ہی ہے، جیسا کہ ”بیروى“ میں ”استیعابى“ کے حوالے سے منقول ہے، (رد المحتار على الدر المختار، جلد: 2، ص: 270-271، مطبوعہ: دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وسطح المسجد له حکم المسجد کذا فى الجوهرۃ النیرہ۔

ترجمہ: ”اور مسجد کی چھت مسجد ہی کے حکم میں ہے،“ جوہرہ نیرہ“ میں اسی طرح سے ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد: اول، ص: 38، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

مسجد کی چھت پر مدرسے کا قیام، وقف میں تبدیلی کرنا ہے اور مسجد مکمل ہونے کے بعد اس کے مصرف میں تغیر کرنا جائز نہیں ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا يجوز تغيير الوقف عن هيئته۔

ترجمہ: ”وقف کی حیثیت کو بدلنا جائز نہیں، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص: 490، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

علامہ علاؤ الدین ہسکفی لکھتے ہیں: اما لو تمت المسجدة ثم اراد البناء منع۔

ترجمہ: ”اگر کسی مسجد کی مسجدیت تمام ہو جائے پھر اگر اس میں مزید تعمیر کا ارادہ ہو (جس سے اس وقف کے مصرف میں تبدیلی ہوتی ہو) تو اسے روک دیا جائے گا، (رد المحتار علی الدر المختار جلد 6 ص: 428 دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

چونکہ مسجد کی چھت بھی مسجد ہی کے حکم میں ہے، اس لئے اس کی مسجدیت کا تبدیل کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، البتہ مسجد میں دینی درس و تدریس جائز ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: يجوز المدرس في المسجد وان كان فيه استعمال اللبود والبوارى المسبلة لاجل المسجد كذا في القنية۔

ترجمہ: ”اور مسجد میں درس و تدریس جائز ہے اگرچہ اس میں مسجد کی دریاں، نمندے جو مسجد کے لئے وقف ہیں، استعمال ہوں، ”قنیہ“ میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 5 ص: 320 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

البتہ مسجد کے آداب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، بچوں کا شور نمازیوں کی نماز میں خلل انداز نہ ہو، ورنہ اوقات نماز میں درس و تدریس کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔ بالغ طالبات کا مسجد کی چھت پر مدرسہ قائم کرنا بوجہ درست نہیں ہے، ایک تو یہ کہ ایسی طالبات اور ان کی معلومات کے فطری طور پر ایام حیض بھی آتے ہیں، اور ان ایام میں عورت

کا مطلقاً مسجد میں داخل ہونا منع ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

ولا يحل للجنب والحائض والنفساء الوقوف عليه۔

ترجمہ: ”اور جنبی، اور حیض و نفاس والی عورت کا مسجد کی چھت پر ٹھیکرنا جائز نہیں ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد: 2، ص: 370، مطبوعہ: دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

ورمختار محل مذکور: یحرم فیہ السؤال ویکرہ الاعطاء وانشاد ضالّة و شعر الامافیہ ذکر و رفع صوت بذكر الالمتفقہة و یمنع منه کل مؤذو لوبلسانہ۔

ترجمہ: ”مسجد میں سوال کرنا حرام اور سائل کو مسجد میں دینا مکروہ ہے، اور اسی طرح گمشدہ چیز کا مسجد میں اعلان کرنا۔ اور ایسے اشعار پڑھنا جن میں ذکر نہ ہو، اور فقہ کی تعلیم و تعلم کے علاوہ آواز بلند کرنا مکروہ ہے، اور ہر ایذا دینے والے کو مسجد سے منع کیا جائیگا اگرچہ زبان سے ایذا پہنچاتا ہو۔“ اور اگر ایسے نہ ہوں تو انہیں مسجد میں غیر اوقات نماز میں پڑھنا مضائقہ نہیں رکھتا جب کہ معلم بلا تنخواہ محض لوجہ اللہ پڑھاتا ہو ورنہ ہرگز جائز نہیں اگرچہ جوان اور بوڑھے ہی پڑھیں کہ اب یہ اور پیشوں کی طرح دنیا کماتا ہے اور مسجد میں اس کی اجازت نہیں۔ فتاویٰ عالمگیری جلد: 5، ص: 122، ”لو جلس المعلم فی المسجد والوراق یکتب فان کان المعلم یعلم للحسبة والوراق یکتب لنفسه فلا بأس به لانه قربة وان کان بالاجرة یکره الا ان یقع لهما الضرورة کنافی محیط السرخی۔“

ترجمہ: ”اگر معلم مسجد میں بیٹھ کر تعلیم دیتا ہے اور کاتب مسجد میں بیٹھ کر لکھتا ہے اگر تو

معلم ثواب کی نیت سے ایسا کرنا ہے اور کاتب اپنے لئے لکھتا ہے نہ کہ اجرت پر تو حرج نہیں کیونکہ یہ قربت و عبادت ہے، اور اگر اجرت کے لئے ہے تو بلا ضرورت ایسا کرنا مکروہ ہے، امام سرخسی کی محیط میں بھی ایسا ہی ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد: 5، ص: 122)“، (فتاویٰ رضویہ جلد: 16، ص: 459، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ”مسجد کے اندر علم دین کی تعلیم جائز اور اس کے جواز پر قرآن و حدیث شاہد، قال اللہ تعالیٰ و من اظلم ممن منع مسجد اللہ ان یذکر فیہا اسمہ وسعی فی خرابہا۔ حدیث میں ہے: خرج رسول اللہ ﷺ ونحن فی الصفۃ فقال ایکم یحب ان یغزو کل یوم الی بطحان او العقیق فیاتئین بناقتین کو ماوین فی غیر اثم ولا قطع رحم فقلنا یا رسول اللہ کلنا نحب ذالک قال افلا یغزو احدکم الی المسجد فیعلم او یقرأ ایتین من کتاب اللہ خیر لہ من ناقتین وثلاث خیر لہ من ثلاث واربع خیر لہ من اربع ومن اعدادہن من الابل رواہ مسلم عن عقبۃ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا، جو مساجد میں ذکر الہی کو روکے اور انہیں ویران کرنے کی کوشش کرے، حدیث میں ہے: ترجمہ: ”رسول اللہ ﷺ (اپنے حجرہ اقدس سے) نکلے اور ہم (اس وقت) صفہ میں تھے، تو آپ نے فرمایا: تم میں سے کون اس بات کو پسند کرے گا کہ ہر روز صبح بطحان یا عقیق کی طرف نکلے اور کسی گناہ یا قطع رحمی کے بغیر دو بلند کوہان والی اونٹنیاں لائے، تو ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! (بلاشبہ) ہم میں سے ہر ایک اس بات کو پسند کرے گا، (تو رسول

اللہ ﷺ نے) فرمایا: تو تم میں سے ہر شخص (ہر روز) صبح کے وقت مسجد کی طرف کیوں نہیں نکل پڑتا، تاکہ وہ کتاب اللہ کی دو آیتیں پڑھائے یا پڑھے، یہ (عمل) اس کے لئے دو بلند کوہان والی اونٹنیوں سے بہتر ہے اور تین آیتوں کا پڑھنا پڑھانا تین اونٹنیوں سے اور چار آیتوں کا پڑھنا پڑھانا چار اونٹنیوں سے اور ان سے زیادہ آیتوں کا پڑھنا پڑھانا اتنی ہی تعداد کی اونٹنیوں سے بہتر ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1842 مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز المکتبہ المکرمہ، اس حدیث کو امام مسلم نے عقبہ بن عامر سے روایت کیا ہے)۔“

فی نفسہ تعلیم سے مسجد کی کوئی بے حرمتی نہیں ہے، تعلیم کو احرام کے خلاف کہنا غلط ہے، البتہ اگر پڑھنے یا پڑھانے والے مسجد کی بے حرمتی کرتے ہوں تو ان کو اس سے منع کیا جائے اور روکا جائے، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ امجدیہ جلد اول ص: 256 مطبوعہ مکتبہ رضویہ، آرام باغ، کراچی)۔“

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: مسجد میں علم دین کی تعلیم جائز ہے، حضور اقدس ﷺ کے زمانہ پاک میں مسجد نبوی میں علم دین کی تعلیم دی جاتی تھی اور اس وقت سے لے کر اب تک دونوں حرم محترم میں علم دین کی تعلیم بلا تکثیر جاری ہے، حدیثوں سے اس کا جواز ثابت ہے، (فتاویٰ امجدیہ جلد اول ص: 269 مطبوعہ مکتبہ رضویہ، آرام باغ، کراچی)۔“

خلاصہ یہ کہ فی نفسہ مسجد میں دینی درس و تدریس جائز ہے، لیکن مسجد کے آداب کو ملحوظ رکھنا لازم ہے، اور جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں محیط سرخسی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ضرورت کی بنا پر اجرت کے عوض بھی مسجد میں تدریس جائز ہے، لیکن بالغ طالبات کے لئے مسجد کی چھت پر درس و تدریس کا انتظام کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں

کئی شرعی مفاسد کا احتمال ہے، اور مسجد کے وقف میں تبدیلی کر کے کسی بھی طرح کا مدرسہ قائم کرنا بہر صورت جائز نہیں ہے۔

مسجد کے قیام کے بعد اس کی حیثیت کو تبدیل کرنا

سوال: 36

ہمارے ہاں ایک مسجد موسوم (اڈہ لاریاں والی مسجد) کی جدید تعمیر کی گئی۔ مسجد کا ڈیزائن اس طرح بنایا گیا کہ عین مسجد کو جائے وضو بنا دیا گیا ہے۔ اور مسجد کے کچھ حصے کو دکان بنا دیا گیا ہے۔ از روئے شریعت ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟، (محمد جابر کھوڑ، ضلع اٹک)۔

جواب:

صورتِ مسئلہ میں جیسا کہ سوال سے واضح ہوتا ہے کہ جس جگہ وضو خانہ بنایا گیا، وہ پہلے مسجد تھی، مسجد ہمیشہ کے لئے مسجد ہی ہے اور اس کی مسجدیت کبھی باطل نہیں ہو سکتی۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ مسجد آسمان کی بلندی اور زمین کی گہرائی (تحت الثری) تک مسجد ہی ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

قوله الى عنان السماء بفتح العين و كذا الى تحت الثرى كما في البيري عن الاستيعجابي -

ترجمہ: ”مسجد آسمان کی بلندی سے تحت الثری تک مسجد ہی ہے ”بیری“ میں استیعجابی سے اسی طرح منقول ہے، (رد المحتار علی الدر المختار، جلد: 2، ص: 371-370، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ولا يجوز تغيير الوقف عن هيئته۔

ترجمہ: ”وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص: 490، مطبوعہ

مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ۔“۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: جو زمین متعلق مسجد ہے وہ مسجد ہی کے کام میں لائی جاسکتی ہے اور اس کے بھی اس کام میں جس کیلئے واقف نے وقف کی، وقف کو اس کے مقصد سے بدلنا جائز نہیں، شرط الواقف کنص الشارع فی وجوب العمل بہ۔ (واقف کی شرط وجوب عمل میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نص کی مثل ہے)، (فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص: 546 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔“۔

فتاویٰ عالمگیری کتاب الوقف باب الا میں محیط امام شمس الائمہ سرخسی سے ہے:

قیم المسجد لا يجوز له ان يبنى حوائت في حد المسجد او في فناءه لان المسجد اذا جعل حائوتا ومسكنا تسقط حرمة وهدا لا يجوز والفناء تبع المسجد فيكون حكمه حكم المسجد، ترجمہ: ”متولی کو مسجد کی حد یا مسجد کے فناء میں دکانیں بنانے کا کوئی اختیار نہیں، کیونکہ مسجد کو جب دکان یا رہائش گاہ بنا دیا جائے، تو اس کا احترام ساقط ہو جاتا ہے، جو کہ ناجائز ہے۔ اور فناء مسجد چونکہ مسجد کے تابع ہے لہذا اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو مسجد کا ہے، (فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص: 352 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔“۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز مسجد کے نیچے دکان بنانے کے مجوزین کی اس دلیل (کہ مسجد کے اوپر امام کے لئے بالا خانہ بنانا جائز ہے) کے جواب میں لکھتے ہیں: صورت مستفسرہ میں وہ دکانیں قطعی حرام، اور وہ بالا خانہ بھی قطعی حرام، ہاں وقت بنائے مسجد قبل تمام مسجدت نیچے مسجد کے لئے دکانیں یا اوپر امام کے لئے بالا خانہ بانی بنائے اور اسکے بعد اسے مسجد کرے تو جائز ہے، اور اگر مسجد بنا کر بنانا چاہے اگرچہ

مسجد کی دیوار کا صرف اسارا اس میں لے اور کہے میری پہلے سے یہ نیت تھی ہرگز قبول نہ کریں گے اور عمارت کو ڈھادیں گے، درمختار میں ہے: لو بنی فوقہ بیتا للامام لا یضر لانه من المصالح اما لو تمت المسجدیة ثم اراد البناء منع ولو قال عنیت ذالک لم یصدق، تاتارخانیہ فاذا کان هذا فی الواقف فکیف بغيره فیجب خدمه ولو علی جدار المسجد ولا یحوز اخذ الاجرة منه ولا ان یجعل شیئا منه مستغلا ولا سکنی بزازیة۔

ترجمہ: ”اگر واقف نے مسجد کے اوپر امام کے لئے حجرہ بنا دیا، تو حرج نہیں کیونکہ وہ مصالح مسجد میں سے ہے، لیکن تمام مسجدیت کے بعد اگر وہ ایسا کرنا چاہے، تو اس کو منع کیا جائے گا، اگر وہ کہے کہ میرا شروع سے ارادہ تھا تو اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی (تاتارخانیہ) جب خود واقف کا یہ حکم ہے تو کسی اور کو یہ اختیار کیسے ہو سکتا ہے لہذا ایسی عمارت کو گرانا واجب ہے اگرچہ صرف دیوار مسجد پر وہ استوار کی گئی ہو، اس کی اجرت لینا یا مسجد کا کوئی حصہ کرائے کے لئے یا رہائش کے لئے مقرر کرنا جائز نہیں (بزازیہ)، (فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص: 432, 433 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔“

صورتِ مسئلہ میں چونکہ ایک جگہ کی مسجدیت متحقق ہو چکی تھی، اسے عین مسجد قرار دیا جا چکا تھا اور بطور مسجد ہی وہ زیر استعمال رہی، اس لئے اب اس کی مسجدیت کو باطل کر کے اس کی جگہ وضو خانہ یا دوکانیں بنانا درست نہیں ہے، البتہ اسے مسجد کا حصہ قائم رکھتے ہوئے اور آداب مسجد کو ملحوظ رکھتے ہوئے درس و تدریس کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

منبر نبوی ﷺ کی سیڑھیاں

سوال: 37

سرکارِ دو عالم ﷺ کے منبر کی تین سیڑھیاں تھیں لیکن ایک دفعہ سرکارِ دو عالم ﷺ منبر پر چڑھے تو تین مرتبہ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے آمین کہا اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ منبر کی سیڑھیاں چار تھیں اور آپ ﷺ چوتھی سیڑھی پر بیٹھے ہوں گے، (سید عالم شاہ، جامع مسجد مصطفیٰ اعظمی نگر لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: رد المحتار میں ہے: منبرہ ﷺ کان ثلث درج غیر المسماة بالمستراح۔

ترجمہ: حضور ﷺ کے مقدس منبر کے تین زینے اس تخت کے علاوہ تھے جس پر بیٹھا جاتا ہے۔ حضور سید عالم ﷺ درجہ بالا پر خطبہ فرمایا کرتے، صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دوسرے پر پڑھا، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے تیسرے پر، جب زمانہ ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا آیا پھر اول پر خطبہ فرمایا سبب پوچھا گیا، فرمایا اگر دوسرے پر پڑھتا لوگ گمان کرتے کہ میں صدیق اکبر کا ہمسر ہوں اور تیسرے پر، تو وہم ہوتا کہ فاروق اعظم کے برابر ہوں، لہذا وہاں پڑھا جہاں یہ احتمال متصور ہی نہیں اصل سنت اول درجہ پر قیام ہے۔ ما فعلہ الصديق فكان تأدبا منه مع رسول الله ﷺ ما فعل الفاروق فكان تأدبا مع الصديق رضي الله تعالى عنهما۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور ﷺ کے ادب کی بنا پر ایسا کیا اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ادب کی خاطر۔ بلندی منبر سے اصل مقصود یہ ہے کہ سب حاضرین خطیب کو دیکھیں اور اس کی آواز سنیں جہاں یہ

حاجت بسبب کثرت حضار و دوری صفوف تین زینوں میں پوری نہ ہو تو زینے زیادہ کرنے کا خود ہی اختیار ہے اور بہتر عدد طاق کی مراعات فان اللہ وتر یحبہ وتر (اللہ تعالیٰ وتر ہے اور وتر کو پسند کرتا ہے) واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ رضویہ جلد 8 ص: 343, 344 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

محدث بریلوی امام احمد رضا قادری قدس سرہم العزیز کی تحریر سے واضح ہے کہ منبر نبوی ﷺ کیسیڑھیاں تین تھیں اور چوتھا تخت یا بیٹھنے کی جگہ تھی، خلیفہ اول و دوم نے ادب کو ملحوظ رکھا، حضرت ابو بکر منبر رسول پر اس جگہ بیٹھے، جہاں حضور ﷺ کے قدم مبارک ہوتے تھے اور پھر حضرت عمر حضرت ابو بکر کے قدموں کی جگہ بیٹھ گئے، یہ دونوں اکابر ادب و احترام کی وجہ سے اجر پائیں گے، تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان نے قیامت تک آنے والے خطباء حضرات کے لئے نسر (آسانی) کو ملحوظ رکھا، اور وہ بھی اس اخلاص اور نیک نیتی کا اجر پائیں گے، منبر کی سیڑھیاں تین سے زائد پانچ یا سات بھی بنائی جاسکتی ہیں، طاق عدد بہتر ہے۔

مسجد کی بالائی منزل پر جماعت

سوال: 38

ہماری مسجد جو کہ پچاس سالہ پرانی بنی ہوئی تھی اس کی جگہ نئی تعمیر تین منزلہ ہوئی ہے لیکن پہلے والے مصلیٰ پر ابھی نماز ہو رہی ہے ہم لوگ پہلی منزل پر نماز کی ادائیگی کرنا چاہتے ہیں۔ اس مسئلے میں آپ کی راہنمائی کی ضرورت ہے آیا اوپر نماز با جماعت نماز ادا کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے؟، (محمد اسلم، جنرل سیکریٹری جامعہ مسجد غوثیہ لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

مسجد کی عمارت مجتمع اجزاء مسجد کہلاتی ہے اور مسجد کے جمع اجزاء کا حکم یکساں ہے، جس طرح نیچے مسجد کے اندر نماز صحیح اور شروع ہے، اسی طرح فرسٹ فلور پر بھی نماز باجماعت جائز ہے، کیونکہ وہ بھی مسجد ہی ہے، لہذا صورت مسئلہ میں فرسٹ فلور پر نماز باجماعت پڑھنے میں از روئے شرع کوئی حرج نہیں ہے، البتہ فقہاء کرام کی تصریحات کی رو سے فقط امام کا اونچی جگہ کھڑا ہونا مکروہ تنزیہی ہے، لیکن اگر امام کے ساتھ کچھ مقتدی بھی اوپر کھڑے ہوں اور باقی امام سے نیچے ہوں تو ایسی صورت میں بلا کراہت نماز جائز ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ويكره ان يكون الامام وحده على الدكان وكذا القلب... وان كان بعض القوم معه فالاصح انه لا يكره الخ۔ ”(فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 108 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

صورت مسئلہ میں جو لوگ نیچے یا اوپر کی منزل میں امام کی اقتداء میں کھڑے ہوں گے، اگر ان کو امام کے انتقالات یعنی رکوع اور سجدہ میں جانے کا اس طرح تشہد میں بیٹھنے کا اور سلام پھیرنے کا کسی ذریعہ سے خواہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے یا مکمرین کے ذریعے علم ہو جاتا ہے، تو نیچے کھڑے ہو کر ان کا اقتداء کرنا درست ہے اور اگر ان کو امام کے انتقالات کا علم نہیں ہوتا تو پھر ان کا امام کی اقتداء کرنا، اس صورت میں صحیح نہیں، نماز جائز نہیں ہوگی۔

فنائے مسجد کا حکم

سوال: 39

عرض یہ ہے کہ ہماری مسجد میں ایک مدرسہ مسجد کمیٹی کے زیر انتظام دینی خدمات انجام دے رہا ہے، جس میں بچوں اور بچیوں کی دینی تعلیم کا علیحدہ علیحدہ انتظام ہے، مدرسے میں ایک خاتون معلمہ بھی ہیں جن کی کارکردگی سے کمیٹی مطمئن ہے اور سمجھتی ہے کہ مذکورہ خاتون سنیت کی ترقی و ترویج کے لئے اچھا کام کر رہی ہیں، ان کا کوئی مکان نہیں ہے، اور شوہر بھی بے روزگار ہے۔ انتظامیہ فنائے مسجد کے احاطے میں جہاں مدرسہ ہے، پہلے مسجد کا وضو خانہ بعد میں لائبریری اور پھر خادم کی رہائش رہی ہے، مدرسے کی اوپر والی منزل میں شروع سے بچوں کے مدرسے کی جگہ ہے، لیکن اب وہاں مؤذن صاحب کی رہائش ہے، جہاں اوپر مؤذن صاحب اور نیچے خادم کی رہائش ہو، وہاں پر معلمہ کو بھی رہائش کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ نہیں؟ اسی مدرسے کے ناظم، جن کا کوئی گھر نہیں ہے اور وہ اچھا کام کر رہے ہیں، اسی احاطے میں ان کو بھی رہائش کی جگہ دی جاسکتی ہے، (محمد غوث محی الدین، R-1043/15 فیڈرل پی ایریا، کراچی)۔

جواب:

یہاں سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ فنائے مسجد کیا ہے؟ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز "غنیۃ" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

فناء المسجد هو المكان المتصل به ليس بينه طريق ترجمہ: "فنائے مسجد وہ مکان ہے جو مسجد کے متصل ہو اور درمیان میں راستہ نہ ہو، (غنیۃ المستملی، فصل فی احکام المسجد ص: 614 سہیل اکیڈمی لاہور)۔ اور فنائے مسجد کی حرمت مثل مسجد ہے

، فتاویٰ عالمگیری کتاب الوقف باب الا میں محیط امام شمس الائمہ سرخسی سے ہے:

قیم المسجد لا يجوز له ان يبنى حوائت في حد المسجد اوفى فناءه لان
المسجد اذا جعل حائوتا ومسكنا تسقط حرمة و هذا لا يجوز والفناء تبع
المسجد فيكون حكمه حكم المسجد، ترجمہ: ”متولی کو مسجد کی حد یا مسجد کے
فناء میں دکانیں بنانے کا کوئی اختیار نہیں کیونکہ مسجد کو جب دکان یا رہائش گاہ بنا دیا
جائے تو اس کا احترام ساقط ہو جاتا ہے جو کہ ناجائز ہے اور فناء مسجد چونکہ مسجد کے
تابع ہے لہذا اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو مسجد کا ہے، (فتاویٰ رضویہ
جلد 16 ص: 352 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔“

دوسری غور طلب بات یہ ہے جیسا کہ آپ نے سوال میں تفصیل سے بتایا کہ: ”
انتظامیہ فناء مسجد کے احاطے میں جہاں مدرسہ ہے، پہلے مسجد کا وضو خانہ بعد
میں لائبریری اور پھر خادم کی رہائش رہی ہے، مدرسے کی اوپر والی منزل میں شروع
سے بچوں کے مدرسے کی جگہ ہے، لیکن اب وہاں مؤذن صاحب کی رہائش ہے،“ اس
سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ مقام پر بار بار تغیر و تبدل کی گئی جو کہ جائز نہیں، علامہ
نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ولا يجوز تغيير الوقف عن هيئته.

ترجمہ: ”وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص: 490، مطبوعہ
مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: جوزمین متعلق مسجد ہے وہ مسجد ہی کے
کام میں لائی جاسکتی ہے اور اس کے بھی اس کام میں جس کیلئے واقف نے وقف کی،
وقف کو اس کے مقصد سے بدلنا جائز نہیں، شرط الواقف كنص الشارع في
وجوب العمل به (واقف کی شرط وجوب عمل میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نص

کی مثل ہے) (فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص: 546 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔“

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز مسجد کے نیچے دکان بنانے کے مجوزین کی اس دلیل (مسجد کے اوپر امام کے لئے بالا خانہ بنانا جائز ہے) کے جواب میں لکھتے ہیں: صورتِ مستفسرہ میں وہ دکانیں قطعی حرام، اور وہ بالا خانہ بھی قطعی حرام، ہاں وقت بنائے مسجد قبل تمام مسجدیت نیچے مسجد کے لئے دکانیں یا اوپر امام کے لئے بالا خانہ بانی بنائے اور اسکے بعد اسے مسجد کرے تو جائز ہے اور اگر مسجد بنا کر بنانا چاہے اگرچہ مسجد کی دیوار کا صرف اسارا اس میں لے اور کہے میری پہلے سے یہ نیت تھی ہرگز قبول نہ کریں گے اور عمارت کو ڈھا دیں گے، درمختار میں ہے ولو بنی فوقہ بیتا للامام لا یضر لانہ من المصالح اما لو تمت المسجدیۃ ثم اراد البناء منع ولو قال عنیت ذالک لم یصدق تاتارخانیہ فاذا کان هذا فی الواقف فکیف بغیرہ فیحب ہدمہ ولو علی جدار المسجد ولا یحوز اخذ الاجرة منه ولا ان یجعل شیئا منه مستغلا ولا سکنی بزازیۃ۔ ترجمہ: ”اگر واقف نے مسجد کے اوپر امام کے لئے حجرہ بنا دیا تو حرج نہیں کیونکہ وہ مصالح مسجد میں سے ہے لیکن تمام مسجدیت کے بعد اگر وہ ایسا کرنا چاہے تو اس کو منع کیا جائے گا، اگر وہ کہے کہ میرا شروع سے ارادہ تھا تو اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی (تاتارخانیہ) جب خود واقف کا یہ حکم ہے تو کسی اور کو یہ اختیار کیسے ہو سکتا ہے لہذا ایسی عمارت کو گرانا واجب ہے اگرچہ صرف دیوار مسجد پر وہ استوار کی گئی ہو، اس کی اجرت لینا یا مسجد کا کوئی حصہ کرائے کے لئے یا رہائش کے لئے مقرر کرنا جائز نہیں (بزازیہ)، (فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص: 432, 433 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔“

مذکورہ بالا تمام عبارتوں سے واضح ہوتا ہے کہ فنائے مسجد، مسجد کے تابع ہے، اور اس کی

حرم مثل مسجد کے ہے لہذا اس کا حکم بھی مسجد کے حکم میں ہوگا، چونکہ پہلے بھی مسجد انتظامیہ نے خلاف شرع عمل کیا اور اسے برقرار رکھا اور اب پھر اسی غلطی کا اعادہ کرنے کا ارادہ ہے، مسجد یا مدرسے کی انتظامیہ اگر معلمہ یا ناظم مدرسہ کو رہائش دینا ہی چاہتے ہیں تو اپنی جیب سے انہیں کرائے پر مکان لے کر دے دیں مال وقف سے نہیں۔

چندہ جس مقصد کے لئے جمع کیا گیا ہے، اسے اس کے بجائے دوسرے مصارف پر

صرف کرنا

سوال: 40

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ستائیسویں شب کو ختم قرآن کے سلسلہ میں چندہ جمع کیا گیا اور اس چندہ کو مختلف جگہوں پر خرچ کیا گیا، مثلاً 8000 ہزار روپے کے بجلی، گیس وغیرہ کے بل ادا کئے گئے اور مسجد میں جمعہ کی نماز کے لئے ٹینٹ لگایا گیا، تو اس کا بھی کرایہ ختم قرآن سے نکالا گیا اور جمہدار کو 500 سو روپے ختم قرآن سے دیا گیا اور اعتکاف والوں کو پھول کے ہار پہنائے گئے۔ براہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل بتائیے، (حبیب اللہ چشتی، اورنگی ٹاؤن، کراچی)۔

جواب:

چندہ یا عطیہ جمع کرنے میں ہمیشہ یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ جس کام کے لئے جمع کیا گیا ہے صرف اسی کام میں خرچ کیا جائے، کسی دوسرے کام میں خرچ نہیں کیا جا سکتا اور اگر اس کام میں خرچ کرنے کے بعد جو رقم بچ جائے، تو جن لوگوں سے چندہ لیا گیا تھا، ان کو واپس لوٹا دیا جائے یا ان لوگوں سے اجازت لیکر اسے دوسرے کام میں خرچ کیا جائے۔

اگر محض ختم قرآن کے نام سے چندہ جمع کیا گیا تھا تو اس رقم سے دوسرے امور کی ادائیگی نہیں کی جاسکتی، ہاں اگر چندہ لیتے وقت، دینے والوں سے یہ اجازت لے لی گئی ہو کہ وہ اس رقم کے خرچ میں یہ اختیار دے دیں کہ جس نیک کام میں مناسب سمجھیں، عطیہ جمع کرنے والے اس رقم کو وہاں خرچ کرنے کے مختار ہوں گے تو اس صورت میں اس رقم کو دیگر مصارف میں صرف کیا جاسکتا ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے میلاد و ایصال ثواب کے لئے کئے جانے والے چندے میں سے فاضل چندے کے مصرف سے متعلق سوال ہوا، آپ نے جواب میں فرمایا: ”ایسے چندوں سے جو روپیہ فاضل بچے، وہ چندہ دہندگان کا ہے انہیں کی طرف رجوع لازم ہے، وہ دیگ وغیرہ جس امر کی اجازت دیں، وہی کیا جائے۔ ان میں جو نہ رہے اس کے عاقل بالغ وارثوں کی طرف رجوع کیا جائے، اگر ان میں کوئی مجنون یا نابالغ ہے تو باقیوں کی اجازت صرف اپنے حصص کے قدر میں معتبر ہوگی، صبی و مجنون کا حصہ خواہی نخواہی واپس دینا ہوگا، اور اگر وارث بھی معلوم نہ ہوں تو جس کام کے لئے چندہ دہندوں نے دیا تھا، اسی میں صرف کریں، وہ بھی نہ بن پڑے تو فقراء پر تصدق کر دیں، غرض بے اجازت مالکان دیگ لینے کی اجازت نہیں۔ در مختار میں ہے: ان لم یکن بیت المال معموراً او منتظماً فعلى المسلمین تکفینہ فان لم یقدر واسألوا الناس له ثوباً فان فضل شئ رد للمتصدق ان علم والا کفن به مثله والا تصدق به محتجی۔

ترجمہ: ”اگر بیت المال میں مال نہ ہو یا کوئی منتظم نہ ہو تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس کو کفن پہنائیں اور اگر کوئی قادر نہ ہو تو لوگوں سے چندہ لیا جائے اور کفن کے چندہ سے کچھ بچ جائے تو یہ چندہ دینے والا معلوم ہو تو اسے لوٹا دیا جائے ورنہ اس سے ایسے ہی

فقیر کو کفن پہنا دیا جائے، یہ بھی نہ ہو سکے، تو کسی فقیر کو صدقہ کر دیا جائے، مجتبیٰ۔

ردالمحتار میں ہے: (قوله والا كفن به مثله) هذا لم يذكره في "المجتبیٰ" بل زاد عليه في البحر عن التحنيس والواقعات قلت وفي مختارات النوازل لصاحب الهداية فقير مات فجمع من الناس الدراهم و كفنوه وفضل شئى ان عرف صاحبه يرد عليه والا يصرف الى كفن فقير اخر او يتصدق به۔

ترجمہ: ماتن کا قول کہ اسی جیسے فقیر کو پہنا دیا جائے، یہ عبارت مجتبیٰ میں مذکور نہیں بلکہ یہ "البحر الرائق" میں "تحنیس" اور "واقعات" کے حوالے سے مذکور ہے میں کہتا ہوں اور صاحب ہدایہ کی کتاب "مختارات النوازل" میں ہے کہ فقیر فوت ہوا تو لوگوں نے چندہ جمع کر کے اس کو کفن دیا اور چندہ بچ گیا، اگر اس زائد چندہ والے شخص معلوم ہو، تو اسے واپس کیا جائے، ورنہ اس کو کسی دوسرے فقیر کے کفن میں خرچ کیا جائے یا پھر صدقہ کر دیا جائے۔

اسی طرح اور کتب میں ہے:

ترجمہ: "قلت" (میں کہتا ہوں) ردالمحتار میں "مختارات" کی عبارت نقل کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ کسی فقیر کو کفن پہنانے یا صدقہ کرنے میں ترتیب مذکور نہیں ہے، جیسا کہ شرح میں ہے، اقول (میں کہتا ہوں) لیکن خانہ پھر ہند یہ میں ہے کہ اگر زائد چندے والا معلوم ہو، تو اسے واپس کیا جائے اور اگر معلوم نہ ہو تو پھر کسی اور محتاج کو کفن دیا جائے، اور اگر کسی کفن میں صرف کرنا مقدور نہ ہو تو فقراء پر صدقہ کیا جائے تو یہ عبارت ترتیب کے لئے نص ہے، اس میں شک نہیں کہ اس ترتیب کے اپنانے سے یقیناً عہدہ برآں ہو سکتا، پھر یہ اگرچہ وقف نہیں تو اس کے مشابہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ چندہ دینے والے مالک کی غرض کو پورا کرنا زیادہ محکم ہے، اسی لئے ہم نے

اس ترتیب کو قابل اعتماد قرار دیا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص: 134 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس مصرف کے لئے چندہ لیا گیا ہے، اسی پر خرچ کرنا شرعاً لازم ہے، اور اگر اس مصرف سے رقم بچ جائے تو بقیہ رقم یا تو چندہ دینے والوں کو واپس کر دی جائے ورنہ اگر چندہ دہندگان دستیاب نہ ہوں، تو اس رقم کو فقرا پر صدقہ کر دیا جائے۔

مسجد کا استعمال شدہ سامان کسی دوسری مسجد میں دینا

سوال: 41

ہماری مسجد میں لاتعداد قرآن پاک، صفیں اور مدرسہ میں قرآن پاک رکھ کر پڑھنے والی بچیں ہیں قرآن وحدیث کی روشنی میں ہمیں مشورہ دیں کہ آیا ہم یہ مسجد کا سامان کسی اور مسجد یا مدرسہ میں دے سکتے ہیں جہاں ان چیزوں کی ضرورت ہو؟، (انتظامیہ جامع مسجد نورانی۔ لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

مسجد میں پڑھنے کے لئے جو قرآن مجید کے نسخے رکھے جاتے ہیں، اگر کمیٹی کے لوگ چاہیں تو انہیں دوسری مسجد کو بھی دے سکتے ہیں، کہ وہ صرف اسی مسجد میں قرأت کرنے کے لئے موقوف نہیں ہوں گے علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں: انه لو وقف مصحفاً علی المسجد جاز ویقرء فی ذلک المسجد وفی موضع آخر ولا یکون مقصوراً علی ہذا المسجد فہذا یدل علی عدم تعیین المكان۔

ترجمہ: ”جب کوئی مصحف (قرآن مجید کا نسخہ) کسی مسجد کے لئے تلاوت کی غرض سے وقف کیا تو جائز ہے کہ اس مسجد والے اس قرآن کی اسی مسجد میں تلاوت کریں اور دوسری جگہ بھی تلاوت کر سکتے ہیں، صرف اسی مسجد کے لئے مخصوص نہیں ہوگا، پس یہ

تعیین مکان کی نفی پر دلیل ہے، مزید لکھتے ہیں کہ: **وَأَمَّا الْحَصِيرُ وَالْقُنَادِيلُ**
فَالصَّحِيحُ مِنْ مَذْهَبِ أَبِي يُوسُفَ أَنَّهُ لَا يَعُودُ إِلَى مَلِكٍ مَتَّخِذَهُ بَلْ يَحُولُ
إِلَى مَسْجِدٍ آخَرَ أَوْ يَبِيعُهُ قِيمَ الْمَسْجِدِ لِلْمَسْجِدِ -

ترجمہ: ”چٹائیاں اور قدیلیں اگر مسجد کے لئے بے کار ہو جائیں تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ وہ دینے والے کی ملک کی طرف نہیں لوٹیں گی بلکہ کسی دوسری مسجد کو دے دی جائیں گی یا متولی مسجد انہیں مسجد کے کام میں صرف کر دے، (البحر الرائق، جلد 5، ص: 381، ص: 421 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

لہذا جب ضرورت سے زائد قرآنی نسخے موجود ہوں تو ان کو کسی دوسری مسجد یا ایسی جگہوں پر جہاں پڑھنے والے زیادہ تعداد میں جمع ہو جاتے ہوں اور ان کو قرآن کی ضرورت ہے، تو دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اسی طرح چٹائیاں اور ڈیسک بھی اگر مسجد کے استعمال کے لئے کارآمد نہ ہوں، تو دوسری مسجد کو دیئے جاسکتے ہیں اور متولی مسجد انہیں فروخت کر کے دیگر مصالح مسجد کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

خزانچی کے گھر سے مسجد کی رقم کی چوری

سوال: 42

مسجد کمیٹی کے خزانچی یا دوسرا ذمہ دار جس کے پاس مسجد کا فنڈ موجود ہوتا ہے، اسکے گھر پر ڈکیتی پڑی اور ڈاکو مسجد کا فنڈ بھی لے گئے جو کہ تقریباً پچیس ہزار اور گھر کا دیگر سامان، T.V، کمپیوٹر، زیورات، موبائل وغیرہ لے گئے۔ اب کمیٹی کا ذمہ داریہ فنڈ مسجد کو دے گا یا معاف ہو جائے گا؟، (محمد توفیق، 11-C بلاک N تھانا ظلم آباد، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئلہ میں مذکورہ شخص (خزانچی یا ذمہ دار) کی حیثیت امین کی سی ہے اور مسجد کا مال اس کے پاس بطور امانت تھا لہذا اگر اس نے اس کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہیں کی تو اس پر کوئی ضمان نہیں اور صورتِ مسئلہ سے یہی ظاہر ہے کہ اس کی جانب سے کوئی غفلت نہیں پائی گئی۔ ہاں اگر حفاظت میں کسی قسم کی کوتاہی کی تو ضمان ہوگا جیسا کہ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: اگر متولی نے کوئی بے احتیاطی نہ کی تو اس پر تاوان نہیں لائنہ کالوصی امین فالقول قوله بیعین۔ (کیونکہ وہ (متولی) وصی کی طرح امین ہے تو قسم کے ساتھ اس کی بات مان لی جائے گی) اور اگر بے احتیاطی کی مثلاً صندوق کھلا چھوڑ دیا غیر محفوظ جگہ رکھا تو اس پر تاوان ہے لان الامین بالتعدی ضمین۔ (کیونکہ حد سے تجاوز (لا پرواہی اور بے احتیاطی) کی وجہ سے امین پر ضمان لازم ہوتا ہے) (فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص: 570 رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔“

لیکن یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ آیا قواعد وضوابط کی رو سے اتنی رقم خزانچی صاحب کو گھر میں رکھنے کا اختیار ہے اور انہیں اس کی اجازت ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر اس پر کوئی ضمان نہیں ہے، ورنہ یہ بلا اختیار اتنی رقم گھر میں رکھنا اس کی جانب سے تعدی (اختیارات و حدود سے تجاوز) میں شامل ہوگا اور اس پر ضمان آئے گا اور اگر یہ عمل پوری انتظامیہ کی اجازت سے ہے تو وہ سب اس ذمہ داری میں شریک ہوں گے۔

مسجد اور مسلک

سوال: 43

ہمارے علاقے کی جامع مسجد ابو ہریرہ واقع سیکٹر ۷ گلشن معمار 1996ء

میں ٹرسٹ ہوئی یہ مسجد مسلک حقہ اہلسنت وجماعت حنفی بریلوی کے نام سے ٹرسٹ ہوئی اس مسجد کا مکمل انتظام مسلک حقہ اہلسنت حنفی بریلوی کے زیر انتظام چلایا جاتا ہے چند دن پہلے مسجد انتظامیہ نے سائن بورڈ سے لفظ بریلوی مٹوا دیا ان سے جب پوچھا گیا تو ان کا جواب تھا کہ ہم نے بریلوی لکھ کر اپنے آپ کو بریلویت تک محدود کر لیا ہے لہذا ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے قول و فعل سے کسی کی دل آزاری نہ ہو، کیونکہ مسجد اللہ کا گھر ہے اس میں سب کو نماز پڑھنے کا حق ہے اس لئے لفظ بریلوی مٹا دیا گیا ہے۔ اب چونکہ لفظ بریلوی مٹانے پر تنازع شروع ہو چکا ہے، لہذا آپ سے التماس ہے کہ دلائل کی روشنی میں واضح فرمائیں کہ کیا مسجد انتظامیہ کا مذکورہ بالا موقف درست ہے، جبکہ یہ لفظ پہلے سے ٹرسٹ دستاویزات میں بھی تحریر شدہ ہے کیا اس کو دوبارہ لکھوا دیا جائے یا ضروری نہیں؟ مفصل جواب عنایت فرمائیں، (محمد آفتاب قادری، سیکٹر ۷ گلشن معمار، کراچی)۔

جواب:

ہمارے نزدیک دین اسلام کے صراطِ مستقیم کی صحیح تعبیر کا حامل مسلک اہلسنت وجماعت ہے، جو رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث مبارک سے مستفاد ہے جس میں آپ ﷺ نے فرقہ ناجیہ (یعنی آخرت میں نجات پانے والے مکتبہ فکر) کی توضیح کرتے ہوئے فرمایا کہ: ”ما انا علیہ و اصحابی“ یعنی فرقہ ناجیہ وہ کہلائے گا جو میرے اور میرے اصحاب کے طریق (حق) پر قائم و ثابت ہو، اس کو ہم ”اہل سنت و جماعت“ سے تعبیر کرتے ہیں، اب اہل سنت وجماعت میں چار مسلمہ مکاتب فکر ہیں، جنہیں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کہا جاتا ہے، پاکستان میں چونکہ غالب اکثریت حنفی مکتبہ فکر کی ہے، اس لئے امتیاز کے لئے ”سنی حنفی“ بھی لکھا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ ”اہل

سنت و جماعت“ یا ”سنی حنفی“ میں بھی پاکستان کے تناظر میں ایک ابہام رہ جاتا ہے، کیونکہ برصغیر پاک و ہند کے عرف میں سنی حنفی مکتبہ فکر کے دو گروہ ہیں، ایک کو عرف عام میں بریلوی کہا جاتا ہے، جو امام احمد رضا خان قادری حنفی بریلوی قدس سرہم العزیز کی طرف منسوب ہے کیونکہ اس وقت کے ہندوستان کے تناظر میں بعض کلامی و اعتقادی مسائل پر اختلاف ہوا اور بعض علماء کی عبارات سے توہین الوہیت و رسالت کا ابہام و تاثر پیدا ہوتا تھا، جس کی نشاندہی انہوں نے فرمائی اور متنبہ فرمایا، اس کے مقابل ایک مکتبہ فکر علماء دیوبند کی طرف منسوب ہو کر دیوبندی کہلایا۔ اب یہ تقسیم عرف جدید ہے اور عوام و خواص میں شائع و ذائع ہے۔ اور بعض مساجد کے ٹرسٹ کے اغراض و مقاصد یا انجمن اساسی دستاویزات میں بھی لکھ دیا جاتا ہے اور بعض جگہ مساجد کے بورڈز پر بھی لکھا ہوتا ہے اور یہ اس لئے کہ بعد میں فرقہ وارانہ تنازعات کا سد باب ہو سکے، جس مسجد کی بنیاد جس نے ڈالی ہے وہ اسی کے پاس رہے اور اسی کا استحقاق تسلیم کیا جائے، لہذا مستقبل کے تنازعات کو رفع کرنے، مسجد کو باہمی آویزش سے بچانے کے لئے پاکستان کے عرف عام کے تناظر میں بریلوی لکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ درس، تقریر اور خطابات میں ائمہ و خطباء کو مثبت انداز بیان اختیار کرنا چاہئے، اپنے مسلک کی حقانیت کو کتاب و سنت اور فقہ حنفی کے دلائل سے مزین کر کے بیان کرنے میں کوئی قباحہ نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے کی کراہت اور عذر کی بنا پر جواز کی صورتیں

سوال: 44

ہماری مسجد سے متصل جنازہ گاہ ہے، جس میں میت کو لانے کے لئے باہر سے دروازہ ہے اور نمازی حضرات کے لئے مسجد ہی سے دروازہ ہے، بعض اوقات

جنازہ گاہ بھر جاتی ہے اور بقیہ نمازی مسجد میں صف بنالیتے ہیں ایک صاحب کا کہنا ہے کہ مسجد میں نماز جنازہ نہ پڑھی جائے یہ گناہ کا کام ہے براہ کرم واضح فرمائیے کیا ایسی صورت میں دیگر شرکاء مسجد میں صف بنائیں یا نماز جنازہ سے محروم رہیں؟، (انتظامیہ جامع مسجد غوثیہ، آگرہ تاج کالونی لیاری، کراچی)۔

جواب:

فقہائے احناف کے نزدیک مسجد میں جنازہ رکھ کر نماز جنازہ پڑھنا بالاتفاق مکروہ ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

عن ابی ہریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: من صلی علی جنازۃ فی المسجد فلا شئی لہ۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے مسجد میں (رکھی ہوئی) میت کی نماز جنازہ پڑھی، اس کے لئے کوئی (اجر) نہیں ہے، (سنن ابوداؤد و رقم الحدیث: 3184)۔“ اس حدیث کو امام ابن ماجہ، امام عبدالرزاق، امام ابن ابی شیبہ اور امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔ فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ کراہت تحریمی ہے یا تنزیہی، علامہ ابن ہمام نے کراہت تنزیہی کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ یہ افضل اور اولیٰ کا خلاف ہے، یعنی مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا بھی مباح ہے لیکن افضل یہ ہے کہ خارج مسجد پڑھی جائے، (فتح القدیر، بحوالہ شرح صحیح مسلم، علامہ غلام رسول سعیدی، جلد: 2، ص: 1026)۔“

علامہ خوارزمی لکھتے ہیں: ”اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں ہے: من صلی علی جنازۃ فی المسجد فلا شئی لہ۔ اس حدیث میں ظرف (فی المسجد) کا تعلق اگر صلی کے ساتھ کیا جائے تو پھر مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہوگا (کیونکہ

ایسی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ جس نے مسجد میں کھڑے ہو کر میت کی نماز جنازہ پڑھی، خواہ میت مسجد میں رکھی ہو یا مسجد سے باہر، اگر نمازی مسجد کے اندر کھڑا ہے تو یہ نماز جنازہ بہر صورت مکروہ ہے) اور اگر ظرف (فی المسجد) کو جنازہ کی صفت بنایا جائے، تو پھر صرف اس وقت مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہوگا جب جنازہ مسجد میں رکھا ہوا ہو، دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کراہت کی علت یہ ہو کہ مسجد کو صرف فرض پڑھنے کے لئے بنایا گیا ہے، تو پھر مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے، اور اگر کراہت کی علت یہ ہو کہ مسجد (میں نماز جنازہ پڑھنے کی صورت میں مسجد) کے نجاست میں آلودہ ہونے کا خدشہ ہے، تو جب جنازہ مسجد سے باہر ہو تو پھر مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہوگا، شمس الائمہ نے مبسوط میں اسی طرف میلان کیا ہے، (کفایہ مع فتح القدیر، بحوالہ شرح صحیح مسلم، علامہ غلام رسول سعیدی، جلد: 2، ص: 291028،)۔“

شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی حنفی لکھتے ہیں: وَعِنْدَنَا اِذَا كَانَتِ الْجَنَازَةُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ لَمْ يَكْرَهُ اَنْ يَصْلِيَ النَّاسُ عَلَيْهَا فِي الْمَسْجِدِ اِنَّمَا الْكَرَاهَةُ فِي ادْخَالِ الْجَنَازَةِ لِقَوْلِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ جَنِّبُوا مَسَاجِدَكُمْ صِبْيَانَكُمْ وَمَحَانِيَكُمْ فَاِذَا كَانَ الصَّبِيُّ يُنْهَى عَنِ الْمَسْجِدِ فَالْمَيْتُ اَوَّلَى۔

ترجمہ: ”جب جنازہ مسجد سے باہر ہو، تو ہمارے نزدیک مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، کراہت صرف میت کو مسجد کے اندر داخل کرنے میں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بچوں اور پاگلوں کو اپنی مسجد سے دور رکھو، جب بچوں کو مسجد سے دور رکھنے کا حکم ہے، تو میت کو دور رکھنا اولیٰ ہے، (المبسوط جلد 2 ص: 68، مطبوعہ دارا لمعرفۃ، بیروت)۔“

علامہ سید طحطاوی لکھتے ہیں: نو کلام شمس الائمہ السرخسی یفیدان ہذا ہو

المنهـب حيث قال وعـنـدنا ان كانت الجنـازة خارج المسـجد لم يكره ان يصلي عليها في المسـجد ۔

ترجمہ: ”شمس الائمہ سرخسی کی (اس) عبارت سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ احناف کا مذہب (مختار) یہی ہے، کیونکہ انہوں نے کہا کہ اگر جنازہ مسجد سے باہر ہو تو ہمارے نزدیک مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح جلد 2 ص: 240 المکتبۃ النوشیہ، کراچی)۔“

علامہ علاء الدین ہسکفی لکھتے ہیں:

(و کرهت تحريمًا) وقيل (تنزيها في مسجد جماعة هو) ای المیت (فیہ) و حدة او مع القوم (واختلف في الخارجة) عن المسجد و حدة او مع بعض القوم (والمختار الكراهة) مطلقاً۔

ترجمہ: ”اور ایسی مسجد میں جہاں جماعت کا اہتمام ہو، (نماز جنازہ) مکروہ تحریمی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ مکروہ تنزیہی ہے، خواہ صرف میت مسجد میں رکھی یا میت اور نماز پڑھنے والے سب مسجد میں ہوں، جب صرف میت مسجد سے باہر رکھی ہو (اور نمازی مسجد کے اندر ہوں) یا میت کے ساتھ کچھ نمازی بھی مسجد سے باہر ہوں (اور کچھ نمازی مسجد کے اندر ہوں) تو اس صورت میں فقہاء کا اختلاف ہے، اور مختار قول یہ ہے کہ بہر صورت مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے، (یعنی میت اور سب نمازی مسجد کے اندر ہوں یا میت اور بعض نمازی مسجد سے باہر ہوں اور کچھ نمازی مسجد کے اندر ہوں مگر ظاہر ہے کہ کراہت صرف ان نمازیوں کے حق میں ہوگی، جو مسجد کے اندر کھڑے ہیں)۔ در مختار کی اس عبارت کے تحت علامہ ابن عابدین شامی نے طویل بحث کی ہے اور اس بحث کے دوران اس امر پر بھی کلام کیا ہے کہ حدیث پاک ”(من

صلیٰ علی جنازۃ فی المسجد فلا شئی لہ۔“ (یعنی جس نے مسجد میں میت کی نماز جنازہ پڑھی، اس کے لئے کوئی اجر نہیں) اور ایک روایت میں ہے ”فلیس لہ اجر“۔ اس حدیث میں ”فی المسجد“ میں تین احتمالات ہیں: (1) یہ کہ ظرف ”صلیٰ“ سے متعلق ہو (تو معنی یہ ہوں گے کہ: جس نے مسجد میں کھڑے ہو کر کسی میت کا جنازہ پڑھا تو اس کے لئے کوئی اجر نہیں)، (اس کی رو سے دونوں احتمالات یکساں ہیں، خواہ میت مسجد میں رکھی ہو یا خارج مسجد)، (2) یہ کہ ظرف ”فی المسجد“ میت سے متعلق ہو (تو معنی یہ ہوں گے کہ جس شخص نے کسی کی نماز جنازہ پڑھی، وہاں حالیکہ میت مسجد میں رکھی ہو تو اس کے لئے کوئی اجر نہیں، اس کی رو سے دونوں احتمالات کا یکساں حکم ہوگا، خواہ نماز پڑھنے والے مسجد میں کھڑے ہوں یا خارج مسجد۔ (3) یہ کہ ظرف (فی المسجد) ”صلیٰ“ اور ”میت“ دونوں کے ساتھ متعلق ہو، تو اس صورت میں جب نمازی اور میت دونوں مسجد میں ہوں گے، تو نماز جنازہ مکروہ ہوگی، اور اگر کوئی ایک (نمازی یا میت) خارج مسجد ہے تو نماز مکروہ نہیں ہے، (اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ شامی لکھتے ہیں: اور ان تمام صورتوں میں یہ مفہوم مذہب مختار کے خلاف ہے، (کیونکہ مذہب مختار یہ ہے) مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے، (رد المحتار علی الدر المختار، ج: 3، ص: 118، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وصلاتُ الجنائزۃ فی المسجد الذی تقام فیہ الجماعۃ مکروہۃ سواء کان المیت والقوم فی المسجد أو کان المیت خارج المسجد والقوم فی المسجد أو کان الامام مع بعض القوم خارج المسجد والقوم الباقی فی المسجد أو المیت فی المسجد والامام والقوم خارج المسجد،

هو المختار كذا في الخلاصة۔

ترجمہ: ”جس مسجد میں نماز باجماعت (باقاعدگی سے) ہوتی ہو، اس میں نماز جنازہ مکروہ ہے، خواہ (1) میت اور نماز پڑھنے والے سب مسجد میں ہوں، (2) یا میت مسجد سے باہر ہو اور نماز پڑھنے والے مسجد میں ہوں، (3) یا امام اور بعض نماز پڑھنے والے مسجد سے باہر ہوں اور باقی لوگ مسجد میں ہوں، یا میت مسجد میں ہو اور امام اور مقتدی مسجد سے باہر ہوں، یہی مذہب مختار ہے اور ”خلاصہ“ میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد: 1، ص: 165، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

اگر بارش ہو رہی ہو تو اس صورت میں مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

”ولا تکرہ بعذر المطر ونحوہ ہکذا فی الکافی۔“

ترجمہ: ”اور بارش یا اس جیسے دیگر عذار کی بنا پر مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، ج: 1، ص: 165، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

بعض تنگ شہری علاقوں میں مسجد کے باہر کھلی جگہ ہوتی ہی نہیں، جہاں نماز جنازہ پڑھی جاسکے، ایسی صورت میں بعض مقامات پر لوگ سڑکوں یا گلیوں کو بلاک کر کے وہاں پر جنازہ پڑھتے ہیں، جبکہ شارع عام اور دوسرے کی زمین پر بلا اجازت جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

”تکرہ فی الشارع وارض الناس كذا فی المصنعات۔“

ترجمہ: ”سڑک پر اور لوگوں کی زمین پر (بلا اجازت و منظوری) نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، (فتاویٰ عالمگیری، ج: 1، ص: 165، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

تو جس طرح ہمارے فقہائے کرام نے کہا ہے کہ بارش اور اس جیسے دیگر عذار کی بناء

پر مسجد میں نماز جنازہ مکروہ نہیں ہے، تو دیگر اَعذار میں جگہ کی تنگی یا کسی مقام پر کھلی جگہ کا بالکل نہ ہونا بھی اِن اَعذار میں شامل ہے، لہذا ایسی صورت میں مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے اور بعض مساجد میں محراب کے آگے میت، امام اور ایک یا چند صفوں کی لوگوں کے لئے جگہ ہوتی ہے، اور بقیہ لوگ مسجد کے اندر متصل صف بندی کرتے ہیں، مگر بناء عذر یہ بھی جائز ہے اور مکروہ نہیں ہے پھر سڑک پر سب کا حق ہے، اسے لوگوں کی آمد و رفت کے لئے بند کر دینا مستحسن نہیں ہے خواہ تقریبات کے لئے ہو، مجھے میرے استاد علامہ مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ ان کے استاد مکرم محدث اعظم پاکستان رحمہ اللہ تعالیٰ کو ہم ایک تنگ راستے پر لے جا رہے تھے اور ہم آگے سے لوگوں کو ہٹا کر راستہ بنا رہے تھے، آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو، راستے پر سب کا حق ہے۔ آپ نے اپنے محلے اور مسجد کی جو صورت حال بیان کی ہے کہ جنازہ گاہ موجود ہے اور جنازے کی نماز جنازہ گاہ ہی میں ادا کی جاتی ہے لیکن جگہ کی تنگی کے باعث کچھ نمازی محضاً مسجد میں صفیں بنا لیتے ہیں، جگہ کی تنگی کے عذر کی بنا پر یہ جائز ہے، البتہ جہاں مسجد سے باہر جنازہ گاہ یا کھلا میدان موجود ہو اور سب نمازی جنازہ گاہ میں سما جاتے ہوں، وہاں پر مسجد میں مطلقاً نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے اور جو مسجد صرف جنازہ گاہ کے طور پر بنائی گئی ہے، وہاں پر مطلقاً نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔

نامکمل وقف

سوال : 45

میری ملکیت ایک پلاٹ تھا جس کا K-D-A کے کاغذات کے مطابق ایک اور دعوے دار موجود تھا مطلب کہ پلاٹ متنازعہ تھا ہمارے علاقے میں مدرسے کی ضرورت تھی میں نے وقتی طور پر فی الحال کی نیت سے مدرسے والوں کو پلاٹ کی فائل

دی، گھر والوں کو خبر ہوئی تو زوجہ نے کہا کہ پلاٹ تو آپ نے بچی کے نام کرنے کی نیت سے لیا تھا اب میں فائل واپس مانگتا ہوں تو مدرسے کے منتظمین فتویٰ مانگتے ہیں، کہتے ہیں کہ وقف کی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاسکتی مگر میں حلفیہ کہتا ہوں کہ میں نے وقف یا حبہ نہیں کیا تھا صرف وقتی طور پر فائل دی تھی دوسری بات یہ کہ قانونی طور پر متنازعہ پلاٹ مسجد یا مدرسے کو نہیں دیا جاسکتا، برائے کرم رہنمائی فرمائیں میں کافی عرصے سے پریشانی کا شکار ہوں، (سید محفوظ علی، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

وقف یا حبہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ واقف (وقف کرنے والا) وقت وقف اس شے کا مالک ہو، جسے وہ وقف کر رہا ہے اگر وقت وقف مالک نہ تھا اور پھر مالک ہو گیا، جب بھی یہ وقف درست نہیں ہوگا۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں :

ومنها المملك وقت الوقف حتى لو غصب ارضاً فوقفها ثم اشترها من مالكها ودفع الثمن اليه أو صالح على مال دفعه اليه لا تكون وقفاً كذا في البحر الرائق۔

ترجمہ: ”(وقف کی شرائط میں سے) ایک شرط یہ بھی ہے کہ وقف کرتے وقت واقف اس شے کا مالک ہو یہاں تک کہ اگر کوئی (شخص کسی) زمین کو غصب کر کے وقف کر دے پھر اس کے مالک سے اس زمین کو خرید لے اور قیمت مالک کو ادا کر دے یا کچھ دینے پر مصالحت کر لی تو یہ وقف (درست) نہیں ہو سکتا، ”البحر الرائق“ میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص: 353 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

وقف کے لئے مخصوص الفاظ ہیں جن سے وقف صحیح ہوتا ہے، مثلاً میری یہ

جائیداد صدقہ موقوفہ ہے کہ ہمیشہ مساکین پر اس کی آمدنی صرف ہوتی رہے یا اللہ تعالیٰ کے لئے میں نے اسے وقف کیا۔ مسجد یا مدرسہ یا فلاں نیک کام پر میں نے وقف کیا یا فقراء پر وقف کیا۔ اس چیز کو میں نے اللہ کی راہ کے لئے کر دیا۔ صورتِ مسئلہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے تو یہ وقف نامکمل ہے محض فائل دینے سے وقف مکمل نہیں ہوتا، مدرسہ والوں کو چاہئے کہ آپ کی فائل واپس کر دیں، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

نفاذ اسلام

WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿کتاب الجنائز﴾

غسل میت سے پہلے ایصالِ ثواب یا قرآن خوانی

سوال: 46

اگر کسی کا انتقال ہو جائے اور لوگ فوری طور پر قرآن خوانی کرنا چاہیں تو کیا اس کی اجازت ہے؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جب تک میت کو غسل نہ دیا جائے، قرآن خوانی کا آغاز نہیں کیا جاسکتا۔ ازراہِ کرم رہنمائی فرمادیجیے، (سید عابد علی، کراچی)۔

جواب:

فی نفسہ زندہ یا مردہ کسی بھی شخص کے لئے کسی بھی وقت میں ایصالِ ثواب یا دعائے مغفرت کی ممانعت نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کا انتقال ہو گیا ہو تو غسل یا تدفین سے پہلے اس کے لئے دعائے مغفرت یا ایصالِ ثواب جائز ہے، اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ البتہ فقہاء کرام نے اس پر بحث کی ہے کہ میت سامنے رکھی ہو اور ابھی اسے غسل نہ دیا ہو تو اس کے سامنے اسی مقام پر تلاوت قرآن کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ فقہاء نے اس پر گفتگو کی ہے اور اس کی وجوہ پر بحث کی ہے۔ چنانچہ امام احمد رضا قادری قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: بلکہ جن کے نزدیک موت سے بدن نجس ہو جاتا ہے اور غسل میت اُسے نجاستِ حقیقیہ سے تطہیر کے لئے رکھا گیا ہے، وہ قبل غسل میت کے پاس بیٹھ کر تلاوت کو منع کرتے ہیں جب تک اسے بالکل ڈھانک نہ دیا جائے کہ نجاستِ منکفہہ کا قرب ہوگا، تنویر میں ہے:

کرہ قراءة القرآن عنده الى تمام غسله۔

ترجمہ: ”میت کو غسل دینے تک اس کے پاس قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے۔“ درمختار میں ہے:

عملہ الشربلالی فی امدادالفتاح تنزیہا للقرآن عن نجاسة الميت لتنجسه بالموت قبل نجاسة خبث وقيل حدث وعليه فينبغي جوازها كقراءة المحدث۔

ترجمہ: امدادالفتاح میں علامہ شربلالی نے اس کی یہ علت بیان فرمائی کہ قرآن مجید کو میت کی نجاست اور ناپاکی سے بچایا جائے، کیونکہ وہ (میت) موت کی وجہ سے ناپاک ہو جاتی ہے، پھر اس نجاست میں اختلاف ہے، چنانچہ بعض نے کہا کہ یہ نجاست خبث ہے جبکہ بعض کے نزدیک حدث ہے۔ لہذا اس بنیاد پر لازم ہے کہ میت کے پاس تلاوت قرآن مجید جائز ہو، جیسے بے وضو کا یاد سے قرآن پڑھنا۔

روالمختار میں ہے نو ذکر ان محل الکراهة اذا كان قريبا منه اما اذا بعد عنه فلا کراهة قلت والظاهر ان هذا ايضا اذا لم يكن الميت مسجی بشوب لیستر جميع بلذہ۔

ترجمہ: ”علامہ طحطاوی نے ذکر کیا کہ اس کراہت کا محل یہ ہے کہ جب (تلاوت کرنے والا) میت کے قریب بیٹھا ہو، لیکن جب وہ اس سے دور بیٹھا ہے، (اور قرآن مجید پڑھ رہا ہے) تو پھر کراہت نہ ہوگی، میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ یہ کراہت بھی تب ہوگی جب میت کسی ایسے کپڑے سے جو اس کے سارے جسم کو چھپائے ڈھانپی ہوئی نہ ہو، (فتاویٰ رضویہ جلد: 23، ص: 454 - 453، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس بحث کی استفادہ یہ ہے کہ فی نفسہ غسل میت سے پہلے میت سے ہٹ کر دوسری جگہ بیٹھ کر میت کے لئے ایصال

ثواب کرنے یا قرآن خوانی کی کوئی ممانعت نہیں ہے، ہاں اگر میت کے قریب بیٹھ کر تلاوت کریں اور میت کو کپڑے یا چادر سے ڈھانپ کر رکھ دیا گیا ہو، تب بھی حرج نہیں ہے، ہاں اگر میت کو کپڑے سے ڈھانپا ہوا نہیں ہے، کھلی ہے، تو اس میں فقہاء کرام کے دو اقوال ہیں، جو اسے بے وضو (محدث) پر محمول کرتے ہیں، ان کے نزدیک جائز ہے اور جو اسے نجس (نجاستِ حقیقی) پر محمول کرتے ہیں، ان کے نزدیک وہاں پر تلاوت مکروہ ہے۔

مصنوعی دانتوں کے ساتھ تدفین

سوال: 47

کسی شخص کے انتقال کے بعد تدفین کے وقت مصنوعی دانتوں (جو کہ فکس ہیں اور نکالے نہیں جاسکتے)، کے ساتھ دفن کیا جاسکتا ہے، (جمال سیکٹر 3-7D، مارٹھ کراچی)۔

جواب:

مسلمان میت کی تجھیز و تکفین، تدفین اور تدفین کے بعد اس کی قبر کی تکریم لازم ہے، کوئی ایسا عمل جس سے میت کو تکلیف ہو، نہ کیا جائے۔ مسلمان کی قبر کی تعظیم کا حکم احادیث مبارکہ میں جس قدر ہے اس سے مسلمان میت کی تعظیم و تکریم کا اندازہ ہوتا ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ مسلمان کی عزت زندہ و مردہ برابر ہے۔ محقق علی الاطلاق رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ فتح القدیر، جلد: 2، ص: 102، (مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر) میں فرماتے ہیں: توضیحہ الاتفاق علی ان حرمة المسلم میتاً کحرمتہ

حیاً۔ ترجمہ: اس بات پر اتفاق ہے کہ مردہ مسلمان کی عزت و حرمت زندہ مسلمان کی طرح ہے۔ (ت)۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں: کسر عظم المیت و اذاه ککسرہ حیاً۔ رواہ امام احمد و ابو داؤد و ابن ماجہ باسناد حسن عن أم المؤمنین عائشہ الصدیقة رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ ترجمہ: ”مردے کی ہڈی کو توڑنا اور اسے ایذا پہنچانا ایسا ہی ہے جیسا زندہ کی ہڈی کو توڑنا، اسے امام احمد و ابو داؤد و ابن ماجہ نے بسند حسن ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا۔“ یہ حدیث مسند الفردوس میں ان لفظوں سے ہے، المیت یؤذیہ فی قبرہ ما یؤذیہ فی بیتہ۔ ترجمہ: ”سید عالم ﷺ فرماتے ہیں: مردے کو قبر میں بھی اس بات سے ایذا ہوتی ہے، جس سے گھر میں اسے اذیت ہوتی۔ علامہ مناوی شرح میں فرماتے ہیں: افـسادان حرمة المؤمن بعد موته باقیۃ۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی حرمت بعد موت کے بھی ویسے ہی باقی ہے۔ سیدنا حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: اذی المؤمن فی موته کاذاه فی حیاته رواہ ابی بکر بن ابی شیبہ۔ مسلمان مردہ کو ایذا دینا ایسا ہے جیسے زندہ کو اسے ابو بکر بن ابی شیبہ نے روایت کیا۔ علماء فرماتے ہیں: المیت یتاذی بما یتاذی بہ الحی۔ کذا فی رد المحتار وغیرہ من معتمدات الاسفار۔

جس بات سے زندوں کو ایذا پہنچتی ہے، مردے بھی اس سے تکلیف پاتے ہیں، جیسا کہ رد المحتار وغیرہ معتمد کتب میں مذکور ہے۔ (ت) علامہ شیخ محقق رحمۃ اللہ علیہ اشعۃ اللمعات میں امام علامہ ابو عمر یوسف بن عبد البر سے نقل فرماتے ہیں: ازیں جاستفاد میگردد کہ میت متالم میگردد کتمیج انچہ متالم میگردد بدان حی و لازم اینست کہ متلد ذکر دو تمام انچہ متلد ذمی شود بدان زندہ، انہی اس جگہ یہ مستفاد ہوتا ہے کہ جن چیزوں سے زندہ

کو درد پہنچتا ہے، ان تمام سے مردہ کو بھی الم پہنچتا ہے، اور یہ لازم ہے کہ جن چیزوں سے زندہ کو لذت حاصل ہو ان سب سے میت کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے، انتہی (ت)۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 441-442، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا ”کاٹنا مرد کے بال بعد مرنے کے جائز ہے یا نہیں؟“ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

ما جائز ہے، فی الدر لا یسرح شعرہ ای یکرہ تحریما ولا یقص ظفرہ
الا المکسور ولا شعرہ ولا یختن، وفی رد المحتار عن النہر عن القنیۃ التریین
بعد موتہا و الامتشاط و قطع الشعر لا یحوز۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ترجمہ: ”در مختار میں ہے: میت کے بالوں میں کنگھا نہ کیا جائے یعنی یہ مکروہ تحریمی ہے، اور اس کے ناخن نہ تراشے جائیں، مکروہ جوڑنا ہوا ہے، نہ ہی بال تراشے جائیں، نہ ختنہ کیا جائے، رد المختار میں ”نہر“ سے، اس میں ”تھیہ“ سے منقول ہے، اس کے مرنے کے بعد زیہنت کرنا، کنگھا کرنا، بال کاٹنا جائز ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 91-92، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

نہ صرف میت کی تعظیم و تکریم لازم ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ قبور مسلمین کی تعظیم و ادب کا بھی حکم ارشاد فرماتے ہیں، چند احادیث ملاحظہ ہوں:

عن ابی ہریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: ”لأن یجلس احدکم علی جمرة
فتحرق ثیابه حتی یتخلص الی جلدۃ خیرلہ من أن یجلس علی قبر۔“

ترجمہ: ”ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ”تم میں سے کسی کا آگ پر بیٹھنا یہاں تک کہ وہ کپڑے جلا کر چمڑے تک پہنچ جائے، زیادہ بہتر ہے اس

سے کہ قبر پر بیٹھے، (ابو داؤد، رقم الحدیث: 3220، مطبوعہ مؤسسة الریان بیروت)۔“

عن عقبۃ بن عامر، قال: قال رسول اللہ ﷺ: لأن امشی علی جمرة أو سیف، أو اخصف نعلی برجلی، أحب الی من ان امشی علی قبر مسلم۔ وما أبالی اوسط القبور قضیت حاجتی، أو وسط السوق“

ترجمہ: ”عقبہ بن عامر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے زیادہ پسند ہے آگ یا تلوار پر چلنا یا پاؤں سے جوتے پر پیوند لگانا، بہ نسبت اس کے کہ قبر مسلم پر چلوں، اور مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ قبر کے وسط میں میری حاجت پوری ہوتی ہے یا بازار کے درمیان، (ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1568، مطبوعہ دار الفکر بیروت)۔“

صورتِ مسئلہ میں چونکہ مصنوعی دانت اس طور پر نصب کیے ہوئے ہیں جنہیں نکالا نہیں جاسکتا، اور انہیں نکالنے کی کوشش کرنا میت کو اذیت دینا ہے، اور میت کو اذیت دینا جائز نہیں ہے، لہذا مصنوعی دانتوں کے ساتھ میت کی تدفین جائز ہے۔

پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت

سوال: 48

کیا شریعت میں پوسٹ مارٹم کی اجازت ہے؟، اگر اجازت ہے تو قرآن پاک یا حدیث میں ہے اس کی کوئی مثال موجود ہے؟۔

سوال: 49

کیا شہید کا پوسٹ مارٹم کیا جاسکتا ہے؟، کیونکہ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ سر (چہرے) سے لے کر پیٹ تک اس کو کاٹتے ہیں، صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ گولی سے مرا ہے یا کسی چاقو سے یا گولی کتنی دور سے لگی ہے یا زخم کتنا گہرا ہے۔ اور اس کے

بعد قانون میں اتنا ہے کہ یہ میڈیکل رپورٹ صرف موت کا سبب جاننے کے لئے کی جاتی ہے، اور قانون میں صرف اس رپورٹ پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا یہ تو صرف گواہوں کی گواہی سے مشابہت کرنے کے لئے ہوتی ہے، کہ واقعی گواہان سچ بول رہے ہیں کورٹ میں۔

سوال: 50

کیا کسی بھی آدمی (مردہ) کو قبر سے نکال کر اس کا پوسٹ مارٹم کیا جاسکتا ہے، شریعت اجازت دیتی ہے؟ یہ سب اور آپ کو تو معلوم ہے کہ پاکستان میں میڈیکل رپورٹس کیسے دی جاتی ہیں، کیا اس کے باوجود بھی پوسٹ مارٹم کیا جاسکتا ہے؟، (منصور علی ایڈووکیٹ، ڈسٹرکٹ لاڈکانہ تحصیل میر و خان و لیج نیوٹھارو و دھو)۔

جواب:

آپ کے سوالات کا جواب دینے سے پیشتر مسلمان میت کی حرمت سے متعلق ہم چند حوالے نقل کرتے ہیں: مسلمان میت کی تجھیز و تکفین، تدفین اور تدفین کے بعد اس کی قبر کی تکریم لازم ہے، کوئی ایسا عمل جس سے میت کو تکلیف ہو، نہ کیا جائے۔ مسلمان کی قبر کی تعظیم کا حکم احادیث مبارکہ میں جس قدر ہے اس سے مسلمان میت کی تعظیم و تکریم کا اندازہ ہوتا ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

”علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ مسلمان کی عزت زندہ و مردہ برابر ہے۔ محقق علی الاطلاق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فتح القدیر، (جلد: 2، ص: 102، مکتبہ انوریہ رضویہ، سکھر) میں فرماتے ہیں: وتوضیحه الاتفاق علی ان حرمة المسلم میتاً کحرمته حیاً۔ ترجمہ: اس بات پر اتفاق ہے کہ مردہ مسلمان کی عزت و حرمت زندہ

مسلمان کی طرح ہے۔ (ت)۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں: کسر عظم السمیت و اذاہ
ککسرہ حیاً۔ رواہ امام احمد و ابوداؤد و ابن ماجہ باسناد حسن عن أم
المؤمنین عائشہ الصدیقة رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

ترجمہ: ”مردے کی ہڈی کو توڑنا اور اسے ایذا پہنچانا ایسا ہی ہے جیسا زندہ کی ہڈی کو
توڑنا، اسے امام احمد و ابوداؤد و ابن ماجہ نے سند حسن ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ
تعالیٰ عنہا سے روایت کیا۔“ یہ حدیث مسند الفردوس میں ان لفظوں سے ہے، السمیت
یغذیہ فی قبرہ ما یغذیہ فی بیتہ۔ ترجمہ: ”سید عالم ﷺ فرماتے ہیں: مردے کو قبر
میں بھی اس بات سے ایذا ہوتی ہے، جس سے گھر میں اسے اذیت ہوتی۔ علامہ مناوی
شرح میں فرماتے ہیں: افسادان حرمة المؤمن بعد موته بالقیۃ۔ اس حدیث شریف
سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی حرمت بعد موت کے بھی ویسے ہی باقی ہے۔ سیدنا حضرت
ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: اذی المؤمن فی موته کاذاہ فی حیاتہ
رواہ ابی بکر بن ابی شیبہ۔ مسلمان مردہ کو ایذا دینا ایسا ہے جیسے زندہ کو اسے ابو بکر
بن ابی شیبہ نے روایت کیا۔ علما فرماتے ہیں: السمیت یتاذى بما یتاذى به الحي
۔ کذا فی رد المحتار وغیرہ من معتمدات الاسفار۔

جس بات سے زندوں کو ایذا پہنچتی ہے، مردے بھی اس سے تکلیف پاتے ہیں، جیسا
کہ رد المحتار وغیرہ معتمد کتب میں مذکور ہے۔ (ت) علامہ شیخ محقق رحمۃ اللہ علیہ اشعۃ
اللمعات میں امام علامہ ابو عمر یوسف بن عبد البر سے نقل فرماتے ہیں: ازیں جا استفاد
میگردد کہ میت متالم میگرد و جمع انچه متالم میگرد و بدان حی و لازم نیست کہ
متلذذ گردد و تمام انچه متلذذی شود بدان زندہ، انہی اس جگہ یہ استفاد ہوتا ہے کہ جن
چیزوں سے زندہ کو درد پہنچتا ہے، ان تمام سے مردہ کو بھی الم پہنچتا ہے، اور یہ لازم ہے

کہ جن چیزوں سے زندہ کولذت حاصل ہو ان سب سے میت کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے، انتہی (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 442-441، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا ”کائنا مرد کے بال بعد مرنے کے جائز ہے یا نہیں؟“ اس کے جواب میں لکھتے ہیں: ”نا جائز ہے، فی السرا لا یسرح شعرہ ای یسکرہ تحریمہ ولا یقص ظفرہ الا العکسور ولا شعرہ ولا یختن، وفی رد المحتار عن النہر عن القنیۃ التزین بعد موتہا و الامتشاط و قطع الشعر لا یحوز۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔“

ترجمہ: ”در مختار میں ہے: میت کے بالوں میں کنگھانہ کیا جائے یعنی یہ مکروہ تحریمی ہے، اور اس کے ناخن نہ تراشے جائیں، مکروہ جو ٹوٹا ہوا ہے، نہ ہی بال تراشے جائیں، نہ ختنہ کیا جائے، رد المحتار میں ”نہر“ سے، اس میں ”قنیۃ“ سے منقول ہے، اس کے مرنے کے بعد زیہنت کرنا، کنگھا کرنا، بال کاٹنا جائز ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 92-91، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“

نہ صرف میت کی تعظیم و تکریم لازم ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ قبور مسلمین کی تعظیم و ادب کا بھی حکم ارشاد فرماتے ہیں، چند احادیث ملاحظہ ہوں:

عن ابی ہریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: ”لأن یجلس احدکم علی جمرة فتحرق ثیابه حتی یتخلص الی جلدۃ خیرلہ من أن یجلس علی قبر۔“

ترجمہ: ”ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ”تم میں سے کسی کا آگ پر بیٹھنا یہاں تک کہ وہ کپڑے جلا کر چمڑے تک پہنچ جائے، زیادہ بہتر ہے اس سے کہ قبر پر بیٹھے، (ابو داؤد، رقم الحدیث: 3220، مطبوعہ مؤسسۃ الریان بیروت)۔“

میت کے پوسٹ مارٹم کی ضرورت دو جگہ پیش آتی ہے، ایک ہے ضرورتِ تعلیم، اس کے لئے عام طور پر کسی لاوارث میت کو قبضے میں کرنے کے بعد میڈیکل کالج کے طلباء اس کے جسم پر آپریشن کی مشق کرتے ہیں اور اس کے جسم کے مختلف اعضاء پر طبی نوعیت کے تجربات کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارا نظریہ یہ ہے کہ سرجری کی مشق کے لئے جانوروں اور غیر مسلم اموات کو حاصل کرنا چاہئے اور مسلم اموات پر سرجری کی مشق کرنا جائز نہیں ہے اور غیر مسلم اموات کا حصول اس قدر دشوار نہیں ہوتا جس کی بنا پر مسلمان میت کی چیر پھاڑ کر کے اس کی بے حرمتی کی جائے۔

آج کل انسانی جان کو بچانے کے لئے سرجری اور آپریشن ایک ضروری طریقہ علاج ہے پتہ یا مثانہ میں پتھری کی صورت میں آپریشن کے ذریعے پتھری کو باہر نکالا جاتا ہے، اگر گردہ خراب ہو جائے تو اس کو آپریشن کر کے باہر نکال دیتے ہیں، بعض دفعہ عورت کے پیٹ میں بچہ آڑا یا ترچھا ہوتا ہے اور اگر آپریشن کے ذریعے ڈلیوری نہ کی جائے تو ماں اور بچہ دونوں مر جاتے ہیں، بعض دفعہ جسم کے کسی عضو میں کوئی ناسور ہو جاتا ہے اور باقی جسم کو اس کے زہر سے محفوظ رکھنے کے لئے اس عضو کو کاٹا پڑتا ہے، بعض حادثات میں جسم کی مختلف ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں اس موقع پر ہڈی جوڑنے کے لئے آپریشن ناگزیر ہوتا ہے اسی طرح بم کے ٹکڑوں اور گولیوں کو جسم سے نکالنے کے لئے آپریشن کی ضرورت پڑتی ہے۔

پوسٹ مارٹم کی دوسری وجہ جو بالعموم پیش آتی ہے وہ ہے مقدمہ کی تحقیق اور کسی بے قصور مسلمان کو قتل کی سزا سے بچانے کا مسئلہ مثلاً ایک شخص کو پولیس نے پستول سمیت پکڑ لیا اور اس پر الزام ہے کہ اس نے اپنے پستول سے فلاں شخص کو گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے، جبکہ ملزم یہ کہتا ہے کہ میں نے اس پر گولی نہیں چلائی اور تمام شواہد اور قرائن ملزم کے

خلاف ہیں، اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ مقتول کے جسم میں جو گولی ہے آیا وہ اس نمبر کی گولی ہے جو ملزم کے پستول میں ہے یا کوئی اور گولی ہے، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مقتول کے جسم میں ملزم کے پستول کی گولی ہے تو وہ قاتل ثابت ہو جائے گا اور اگر وہ گولی اس کے پستول کی نہیں ہے، تو وہ بری ہو جائے گا، ایسی صورت میں جبکہ پوسٹ مارٹم کے ذریعے کسی بے قصور کی جان بچانے کا مسئلہ ہو تو پوسٹ مارٹم کرنا صرف جائز ہی نہیں، بلکہ ضروری ہے اور فقہاء اربعہ کے مذاہب میں اس کی تائید موجود ہے۔

مذکورہ بالا مسئلے کی تحقیق انتہائی مفصل انداز میں شیخ الحدیث حضرت علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی نے اپنی تصنیف شرح صحیح مسلم (جلد دوم، ص: 830-823) میں کی ہے، جس کا خلاصہ ہم نے بیان کیا ہے۔ میت کو دفن کرنے کے بعد پھر قبر کو کھودنا جائز نہیں مگر جب کسی آدمی کے حق کے لئے کھودنا ہو مثلاً زمین مغصوب میں دفن کیا گیا یا دفن کے وقت کسی کا مال قبر میں گر پڑا تو ایسی صورت میں قبر کھودنے کی اجازت ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

(لا ینخرج منه) بعد اہمالہ التراب (الا) لحق آدمی، (کأن تكون الارض مغصوبة أو أخذت بشفعة) و یخیر المالك بین اخراجه و مساواته بالأرض۔ ترجمہ: ”(میت کو قبر سے نہیں نکالا جائے گا) مٹی ڈال دینے کے بعد (مگر) کسی انسان کے حق کی وجہ سے، مثلاً (زمین غصب کی ہو یا شفعہ کی وجہ سے لی گئی ہو) اور مالک کو اختیار ہوگا کہ مردے کو نکال دے یا قبر زمین کے برابر کر دے، (رد المحتار جلد 3 صفحہ 135، 136، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)۔“

تمام حوالہ جات کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ پوسٹ مارٹم کے ذریعے کسی بے قصور کی جان بچانے کا مسئلہ ہو تو پوسٹ مارٹم کرنا صرف جائز ہی

نہیں، بلکہ ضروری ہے (کیونکہ جب مسلمان میت کی حرمت اس قدر ہے جیسا کہ ہم نے اس فتویٰ کی ابتداء میں بیان کی ہے تو زندہ کی بدرجہ اولیٰ ہے) اور فقہاء اربعہ کے مذاہب میں اس کی تائید موجود ہے۔

جھوٹی قبر بنانا اور اس کی تعظیم کرنا

سوال: 51

ایک ایسی جگہ جہاں کسی بزرگ و ولی کی قبر نہ ہو اور نہ ہی وہاں کوئی دفن ہو، بس اتنا کہا جاتا ہو کہ یہاں کسی زمانے میں گذرتے ہوئے کسی قافلے کا ایک بچہ غائب ہو گیا تھا (یہ معلوم نہیں کہ یہ بچہ ہندو، سکھ یا عیسائی ہے، جن کا تھا) زندہ پیر کا نام دے کر عرس کرنا سنتیں چڑھانا، صدقات دینا اور مقدس جان کر حاضری دینا، درختوں کا نہ کاٹنا، وہاں کی خاک کو شفا یا ب سمجھنا وغیرہ وغیرہ، جائز ہے یا ناجائز؟۔ اب یہ جگہ محکمہ اوقاف کے پاس ہے عرس تو نہیں ہوتا، لیکن عورتوں اور مردوں کی حاضری جیسے معاملات جاری ہیں۔ اس صورت حال کو روکنا جائز ہے یا نہیں؟، (مولانا محمد جہانگیر صدیقی، علیمیہ مسجد، ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

جھوٹی قبر بنا کر اس کی تعظیم کرنا ناجائز ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا ”کسی ولی اللہ کا مزار شریف فرضی بنانا اور اس پر چادر وغیرہ چڑھانا، اور اس پر فاتحہ پڑھنا اور اصل مزار کا سا ادب و لحاظ کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔“ جواب میں لکھتے ہیں: فرضی مزار بنانا اور اس کے ساتھ اصل کا سا معاملہ کرنا ناجائز و بدعت ہے، مزید سوال ہوا کہ ”زید نے ایک قبر فرضی اور مصنوعی، جس کا پہلے سے کوئی وجود نہ تھا، بنا کر یہ بات مشہور کی کہ اس قبر میں امروہہ کے زین العابدین تشریف

لائے ہیں، مجھ کو خواب میں بشارت ہوئی ہے، ایسی روایات کا ذہبہ سے اس قبر کی عظمت لوگوں کے سامنے بیان کر کے قبر پرستی کی طرف بلانے لگا، حتیٰ کہ اس میں اس کو کامیابی ہونے لگی اور بہت سی مخلوق اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس قبر پر چادریں اور مرغ اور بکری اور مٹھائیاں، روپیہ اور پیسہ چڑھانے لگے، اور اپنی مرادیں اور منتیں اس قبر سے مانگنے لگے اور زید اس آمدنی سے متمتع ہوتا ہے، ایسے شخص کے واسطے شریعت کیا حکم لگاتی ہے؟“۔

آپ نے جواب دیا: ”قبر بلا مقبور (یعنی جس میں کوئی دفن نہ ہو) کی طرف بلانا اور اُس کے لئے وہ افعال کرنا گناہ ہے، اور جبکہ وہ اس پر مصر ہے اور باعلان اسے کر رہا ہے تو فاسق معطن ہے اور فاسق معطن کو امام بنانا گناہ اور پھیرنی واجب۔ اس جلسہ زیارت قبر بے مقبور میں شرکت جائز نہیں۔ زید کے اس معاملے سے جو خوش ہیں خصوصاً وہ جو مُمدِّ و معاون ہیں، سب گناہ گار و فاسق ہیں، قال اللہ تعالیٰ: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ، گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ بلکہ وہ بھی جو باوصف قدرت ساکت ہے، قال اللہ تعالیٰ: كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مَنكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ۔ وہ برے کام سے ایک دوسرے کو روکتے نہ تھے، کیا ہی برا کام وہ کرتے تھے۔

ایک اور سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: جھوٹا مزار بنانا اور اس کی تعظیم کرنا جائز نہیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9 ص: 425، 426، 427 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“۔

مردہ پیدا ہونے والے بچے کے کفن دفن، غسل دینے اور نام رکھنے کا مسئلہ

سوال: 52

اگر کوئی بچہ مسلمان کے گھر مردہ حالت میں پیدا ہو تو ایسی صورت میں اس کی

تدفین کے بارے میں کیا حکم ہے کیا اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا یا کسی الگ جگہ پر؟ اور اس کو غسل دینے اور نام رکھنے کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟
(طارق عزیز، دستگیر کالونی، کراچی)۔

جواب :

وہ بچہ جو ماں کے لپٹن سے مردہ حالت میں پیدا ہوا، یعنی دورانِ تولد یا بعد میں اس نے کوئی آواز نہیں نکالی، کوئی حرکت نہیں کی، سانس نہیں لیا، زندگی کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی، تو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، غسل دینا بہتر ہے، اسے معمول کا مسنون کفن دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بس پاک کپڑے میں لپیٹ کر مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دیا جائے، مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ دیگر قبور کی وجہ سے اس میت کے آثار کی بے حرمتی کی نوبت نہیں آئے گی۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وان لم يستهل ادرج فی خرقۃ ولم یصل علیہ ویغسل فی غیر ظاہر الروایۃ
وهو المختار کذا فی الہدایۃ۔

ترجمہ: ”اور اگر بچہ (مردہ پیدا ہوا اور) کوئی آواز نہیں نکالی، تو اسے پاک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیا جائے اور اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، (فقہ حنفی کی ظاہر الروایہ میں تو اسے غسل دینا ثابت نہیں ہے لیکن) غیر ظاہر الروایہ کی ایک روایت میں ہے کہ اسے غسل دیا جائے گا، اور یہی (قول) مختار ہے اور ”ہدایہ“ میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 159، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(والا) يستهل (غُسل و یُسمی) عند الثانی وهو الاصح، فیتقی بہ علی خلاف

ظاہر الروایۃ اکرم ابنی آدم کما فی ”ملتقى البحار“ و اذا ستبان بعض خلقه غسل وحشر وهو المختار۔

ترجمہ: اور اگر بچہ پیدا ہونے پر آواز نہ نکالے تو دوسری روایت کے مطابق اسے غسل دیا جائے اور نام رکھا جائے، یہی صحیح ترین ہے۔ اور بنی آدم کے اکرام کی خاطر ”ظاہر الروایۃ“ کے خلاف اسی پر فتویٰ دیا جائے گا، جیسا کہ ”ملتقى البحار“ میں ہے، رد المحتار علی الدر المختار، جلد: 3، ص: 122)۔“

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ ”اکثر دیکھا گیا مرا ہوا بچہ کسی کے ہاں پیدا ہوتا ہے، اس کو ہانڈی میں رکھ کر کورستان سے علیحدہ دفن کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ پکا مسان (یعنی اس سے بد فالی مراد لیتے ہیں) ہے، اس سے اہل ہنود کی طرح بچتے ہیں، یہ کیونکر ہے؟۔

آپ نے جواب دیا: ”یہ شیطانی خیال ہے اسے مسلمانوں کے کورستان ہی میں دفن کریں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9 ص: 390، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“
علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:

مسلمان مرد یا عورت کا بچہ زندہ پیدا ہوا یعنی اکثر حصہ باہر ہونے کے وقت زندہ تھا، پھر مر گیا تو اس کو غسل و کفن دیں گے اور اس کی نماز پڑھیں گے ورنہ اسے ویسے ہی نہلا کر ایک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیں گے اس کے لئے غسل و کفن بطریق مسنون نہیں اور نماز بھی اس کی نہیں پڑھی جائے گی، (بہار شریعت، جلد اول، ص: 335، 336، مطبوعہ مکتبہ امجدیہ، کراچی)۔“

﴿کتاب الزکوٰۃ﴾

زکوٰۃ کی رقم سے قرض کی ادائی

سوال: 53

ایک شخص جو کہ قرض دار ہے اور بینک سے سود پر رقم قرض لی ہے گھر گروی ہے کچھ اور لوگوں کا پیسہ بھی دینا ہے جو کہ لاکھوں میں ہے، ضروریات زندگی کی اشیاء گھر میں موجود ہیں۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ اگر کوئی قریبی رشتہ دار زکوٰۃ کی رقم سے اس کا قرض ادا کرنا چاہے تو کتنی رقم زکوٰۃ کی مد میں اسے دے سکتا ہے؟۔

سوال: 54

ایک شخص مختلف لوگوں سے قرض لیتا ہے اور پھر کچھ عرصے بعد اس کا انتقال ہو جاتا ہے اس کے گھر کے افراد وہ قرض چکانے کی استطاعت نہیں رکھتے کیا کوئی قریبی رشتہ دار یہ قرض زکوٰۃ کی رقم سے ادا کر سکتا ہے؟، (سعید غنی آرائیں، بلاک 5-E 62/10 نیو کراچی)۔

جواب:

ایسا قرض دار جس کے پاس ادائے قرض کے وسائل نہ ہوں اور قرض کی رقم اس کی موجودہ املاک سے زیادہ ہو اگر کوئی حسن سلوک کے طور پر اس کے قرض کی ادائیگی کرنا چاہے تو وہ اپنی استطاعت و صلاحیت کے مطابق کر سکتا ہے قرض کی رقم خواہ بینک کی ہو یا شخصی، قرض کے سلسلے میں برابر ہیں البتہ شخصی قرض میں سود نہیں ہونا چاہئے جبکہ بینک کے قرض میں سود دینا ہوتا ہے اس لئے یہ شخصی قرض سے بدتر ہوتا

ہے۔

زکوٰۃ کی رقم سے نادار کے قرض کی ادائی زکوٰۃ کی رقم حبہ یا قرض کہہ کر دینا

سوال: 55

کیا زکوٰۃ کی رقم ایسے عزیز کو دی جاسکتی ہے، جو اپنی قلیل تنخواہ کی وجہ سے مقروض ہے اور اس کی لڑکی کی شادی طے ہوگئی ہے، مگر شادی کا خرچہ نہ ہونے کی وجہ سے رکی ہوئی ہے، معلوم ہے کہ وہ شخص زکوٰۃ کی رقم لینے پر تیار نہیں ہوگا تو کیا اس کو بغیر بتائے، اس کے قریبی رشتہ دار زکوٰۃ کی رقم دے سکتے ہیں، کیا اس طرح زکوٰۃ کی ادائی ہو جائے گی؟، (واجد حسین، A-286/1 گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

زکوٰۃ کی صحیح ادائی کے لئے ضروری ہے کہ جسے زکوٰۃ دی جا رہی ہے، وہ مستحق زکوٰۃ ہو، صلاب نصاب نہ ہو، سید نہ ہو، تو ایسے شخص کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ مستحق زکوٰۃ وہ شخص ہے، جس کے پاس کم از کم نصاب کے مساوی بنیادی ضروریات سے فاضل مال موجود نہ ہو، نصاب شرعی کی مقدار یہ ہے 612.36 گرام چاندی یا اس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم، یا مال تجارت جو اس کی بنیادی ضروریات سے زائد ہو۔ قرابت دار اگر صلاب نصاب نہ ہوں بلکہ مفلس و نادار ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے۔

زکوٰۃ کی رقم سے اس کا قرض بھی ادا کیا جاسکتا ہے اور اسے یعنی مستحق زکوٰۃ شخص کو یہ بتائے بغیر بھی دی جاسکتی ہے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے، جبکہ اندیشہ ہو کہ خود داری کی بنا پر نہیں لے گا، بلکہ حبہ یا قرض کہہ کر بھی دی جاسکتی ہے اور دل میں یہ نیت ہو کہ واپس

نہیں لوں گا، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ومن أعطی مسکیناً دراهم و سماها
 هبة أو قرضاً ونوى الزكاة فإنها تُجزیه وهو الاصح هكنا فی البحر الرائق
 ناقلاً عن المبتغی والقنية ۔

ترجمہ: ”اور جو شخص کسی مسکین (مستحق زکوٰۃ شخص) کو کچھ درہم (زکوٰۃ کی مد میں) یہ
 کہہ کر دے کہ یہ ہبہ یا قرضہ ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی نیت کر لے تو یہ عمل ادائے زکوٰۃ
 کے لئے کافی ہے اور یہی قول صحیح ترین ہے ”بحر الرائق“ میں ”المبتغی“ اور ”قنیہ“ سے
 اسی طرح منقول ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 171، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

ادھار کی رقم سے زکوٰۃ کی ادائیگی

سوال: 56

میں نے زکوٰۃ کے پیسے رکھے تھے، جو ایک صاحب کو جو انتہائی
 مجبور تھے، ادھار میں دیدیے، سوال یہ پوچھنا ہے کہ کیا زکوٰۃ میں سے رقم بطور
 ادھار دی جاسکتی ہے۔ کیا سال گزرنے کے بعد جب ادھار دی ہوئی رقم مل جائے
 ، اس وقت زکوٰۃ دینے پر کوئی حرج تو نہیں؟، (محمد حامد علی، گلشن اقبال)۔

جواب:

اپنے مال میں سے زکوٰۃ کی رقم نکال کر اسے اپنے پاس الگ رکھنے سے
 زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، بلکہ اسے مستحق تک پہنچانا اور اسے اس کا مالک بنانا ضروری ہے،
 اور اگر اس رقم کو رکھے ہوئے سال گزر جاتا ہے، یا اسے آپ نے ادھار پر کسی کو دے
 رکھا ہے تو آپ جب آئندہ سال کی زکوٰۃ ادا کریں گے تو زکوٰۃ کی نیت سے الگ
 رکھی ہوئی یا کسی کو قرض دی ہوئی اس رقم پر بھی آپ کو زکوٰۃ ادا کرنی لازمی ہوگی۔ اور

اگر آپ نے گزشتہ کئی سالوں سے اس رقم کی زکوٰۃ ادا نہیں کی، تو مقدار واجب کو چھوڑ کر بقیہ رقم اگر نصاب کی مقدار کو پہنچتی ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے، مثلاً آپ کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں اور سال گزرنے پر ساڑھے بارہ ہزار روپے زکوٰۃ واجب ہوگئی اور اس سال آپ نے زکوٰۃ ادا نہیں کی تو آئندہ سال کی زکوٰۃ جب ادا کریں گے تو مقدار واجب یعنی ساڑھے بارہ ہزار کو چھوڑ کر بقیہ چار لاکھ ستاسی ہزار پانچ سو کی زکوٰۃ آپ پر واجب ہوگی۔ صورتِ مسئلہ میں زکوٰۃ کی نیت سے اپنے کل رقم میں سے جو پیسے آپ نے علیحدہ کئے اور پھر وہ رقم آپ نے دوسرے کو بطور قرض دے دی اب آپ آئندہ سال جب زکوٰۃ ادا کریں گے تو گزشتہ سال آپ کی رقم پر جتنی زکوٰۃ واجب تھی اس مقدار واجب کو چھوڑ کر بقیہ رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی، لہذا جو پیسے آپ نے قرض میں دیئے وہ کل رقم میں سے شمار نہیں ہونگے بلکہ قرض کی وصولیابی کے بعد گزشتہ سال کی زکوٰۃ کی مد میں ان کو خرچ کرنا واجب ہوگا۔

ہسپتال کے لئے زکوٰۃ کی رقم سے آلاتِ طب کی خریداری

سوال: 57

میرا ایک ہسپتال ہے اس میں غرباء، مساکین کا مفت علاج کیا جاتا ہے، آنکھوں کے علاج و آپریشن کا شعبہ بھی ہے۔ غیر مستحق افراد سے مناسب فیس اور خرچہ لیا جاتا ہے اس آمدنی سے بھی غرباء و مساکین کے علاج میں رقم خرچ کی جاتی ہے اب ہم ہسپتال میں آلات و مشینری وغیرہ کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں خصوصاً شعبہ امراضِ چشم میں۔ سوال یہ ہے کہ کیا زکوٰۃ کی رقم سے آلات و مشینری برائے ہسپتال خریدی جاسکتی ہیں؟، (اخلاق احمد، پشاور)۔

جواب:

محتاط صورت تو یہ ہے کہ آلات و مشینری زکوٰۃ کی رقم سے لے کر کسی بھی مستحق زکوٰۃ کی ملک کر دی جائے اور وہ اسے آپ کے ہسپتال کو ہبہ کر دے، پھر اسے آپ مستحق زکوٰۃ مریضوں، نصف فیس یا مکمل فیس دینے والے یا غیر مستحق زکوٰۃ مریضوں کے لئے بھی بلا فیس استعمال کر سکتے ہیں اور کسی سے پوری فیس بھی چارج کر سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

زکوٰۃ کی رقم سے مقامی بچوں کے لئے تعلیم القرآن کا مدرسہ چلانا

سوال: 58

میں اپنی سالانہ زکوٰۃ میں سے محلے کے دو مدرسے اس طرح چلاتا ہوں کہ محلے کے بچے پڑھنے کے لئے آتے ہیں، کوئی رہائشی یا مسافر طالب علم نہیں ہے۔ لڑکوں کو معلم قاری صاحب اور لڑکیوں کو معلمہ قاریہ صاحبہ پڑھاتی ہیں۔ ان دونوں کا ماہانہ وظیفہ، مدرسے کے لئے ڈیسکیں، پنکھا اور دیگر اخراجات زکوٰۃ کی رقم سے ادا کرتا ہوں، گذشتہ دو سال سے اسی مذکورہ بالا طرز پر یہ دو مدارس میں چلا رہا ہوں، کیا میری ادا کردہ زکوٰۃ درست ہے؟، (حافظ فہیم احمد، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ نے مصارف زکوٰۃ قرآن مجید کی سورۃ التوبہ: 60 میں متعین فرما دیئے ہیں اور وہ آٹھ ہدات ہیں:

(1) فقراء (2) مساکین (3) عاملین زکوٰۃ (4) مؤلفۃ القلوب (5) جن کی گردن کسی بڑے مالی بار تلمے دہی ہوئی ہو (6) جن پر کوئی بھاری تاوان آگیا ہو، جس سے گلو

خلاصی کی کوئی سبیل نہ ہو (7) جو اپنے آپ کو ہمہ وقتی اللہ کے دین کے لئے وقف کر چکے ہوں اور معاشی تنگ و دو کے لئے انہیں وقت میسر نہ ہو (8) جو مسافر کسی ایسے مقام پر گھر گئے ہوں کہ قوت لایموت دستیاب نہ ہو اور گھر سے رابطہ اور مالی معاونت کا حصول ممکن نہ ہو۔ زکوٰۃ کا مال صرف اس پر صرف کیا جاسکتا ہے جو قرآن مجید میں بیان کردہ ان مدت میں سے کسی ایک کے تحت مستحق زکوٰۃ قرار پاتا ہو۔ وہ مقامی شہری بچے جو مدارس یا مکاتب تعلیم القرآن میں حفظ و ناظرہ کی تعلیم پا رہے ہوتے ہیں اور جن کے والدین اور کفیل خود زکوٰۃ و صدقات ادا کرتے ہیں، ان پر بلا واسطہ یا بالواسطہ زکوٰۃ کی رقم صرف کرنا درست نہیں ہے، بالواسطہ اس طرح کہ ان کے معلم و مدرس کو اس لئے زکوٰۃ کی رقم میں سے تنخواہ دی جائے کہ وہ ان بچوں کو پڑھاتا ہے۔ ہاں البتہ اگر ایسا کوئی مدرس فی نفسہ مستحق زکوٰۃ ہے تو اسے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، عام ازیں کہ وہ بچوں کو پڑھائے یا نہ پڑھائے، اگر اسے زکوٰۃ غیر مشروط طور پر استحقاق کی بنا پر دی جا رہی ہو اور وہ رضا کارانہ طور پر رضائے الہی کے لئے قرآن مجید کی تعلیم دے رہا ہو، اسے اس پر شرط یا لازم نہ قرار دیا گیا ہو تو درست ہے۔ البتہ اگر زیر تعلیم بچے بھی ایسے لوگوں کے ہیں، جو نادار اور مستحق زکوٰۃ ہیں، تو ادارے کا سربراہ زکوٰۃ دینے والوں کا وکیل بن کر ان پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کر سکتا ہے۔

ترکے کی تقسیم سے پہلے کی مدت پر زکوٰۃ واجب نہیں

سوال: 59

ایک شخص کا قضاء الہی سے انتقال ہو گیا اور اس کی جائیداد اس کے شرعی ورثاء میں 2 سال کے بعد تقسیم کی گئی آیا تقسیم کے بعد گزشتہ دو سالوں کی زکوٰۃ ان کے ذمے

واجب الاداء ہے یا نہیں؟، (منور صدیقی، بلیر کراچی)۔

جواب:

واضح رہے کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے بعض شرائط ہیں، جب یہ تمام شرائط پائی جائیں تو اس مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر ان میں سے کل یا بعض شرائط نہ پائی جائیں، تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ وجوب زکوٰۃ کی شرائط میں سے ایک شرط ”ملک تام“ (Complete Ownership) ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: (ومنها الملك التام) وهو ما اجتمع فيه الملك واليد واما اذا وجد فيه الملك دون اليد كما الصداق قبل القبض او وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لا تجب فيه الزکوۃ كذا في السراج الوهاج۔

ترجمہ: ”(اور وجوب زکوٰۃ کی شرائط میں سے ایک ”ملک تام“ ہے) اور (ملک تام) اسے کہتے ہیں کہ جس میں ملکیت اور قبضہ دونوں پائے جائیں، لیکن جب ملکیت پائی جائے مگر قبضہ نہ پایا جائے، اس کی مثال (دین) مہر ہے، جو ابھی (بیوی کے) قبضے میں نہیں آیا، یا قبضہ پایا جائے مگر ملکیت نہ ہو، جیسے (عہد) مکاتب یا مقروض کے قبضے میں مال کا ہونا (کہ اس میں ملکیت نہیں ہے)، تو ان دونوں صورتوں میں اس مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، ”السراج الوهاج میں اسی طرح ہے“، (فتاویٰ عالمگیری جلد اول: ص: 172، مکتبہ رشید یہ کورنٹ)۔“

اور ملک تام متب ہی ہوگا، جبکہ اصل یعنی ”مالک مال“، مال پر قبضہ کر لے یا اس کا وکیل مال پر قبضہ کر لے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وقد مران المراد بالملك التام رقبة و يد۔

ترجمہ: ”اور تحقیق (پیچھے) گذر چکا ہے کہ (ملک) نام سے مراد یہ ہے کہ مملوک پر ملکیت بھی کامل ہو اور قبضہ بھی ہو، (رد المحتار علی الدر المختار جلد: 3، ص: 168، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

اور وجوب زکوٰۃ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مال نصاب حقیقہ یا تقدیر انامی ہو۔ اور نامی ہونا یہ ہے کہ اس کو مال تجارت سے بڑھا سکے اور تجارت قبضہ سے پہلے ہو ہی نہیں سکتی۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: (و منها کون النصاب نامیا) حقیقۃ بالتوالد و التناسل و التجارة أو تقدیرا بان یتمکن من الاستعناء بکون المال فی یدہ او فی ید نائبہ۔

ترجمہ: ”وجوب زکوٰۃ کی شرائط میں سے ایک نصاب کا نامی (بڑھوتری کے قابل) ہونا ہے، حقیقت میں تو نمو (Growth) یہ ہے کہ توالد و تناسل (جیسے جانوروں کی افزائش نسل ہوتی ہے) یا تجارت کے ذریعے ہو، یا تقدیر انموہو، کہ مال کا مالک اپنے مال میں نمو اور اضافے کی قدرت رکھتا ہو اور یہ تب ہو سکتا ہے جب مال اس کے (براہ راست) یا اس کے نائب کے قبضے میں ہو، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1: ص: 174، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

آگے چل کر لکھتے ہیں: وأما سائر الديون المقر بها فهي على ثلاث مراتب عند أبي حنيفة رحمه الله تعالى ضعيف وهو كل دين ملكه بغير فعله لا بد لا عن شيء نحو الميراث او بفعله لا بد لا عن شيء كالوصية او بفعله بدلا عما ليس بمال كالمهر وبدل الخلع والصلح عن دم العمد والدية وبدل الكتابة لازكاة فيه عنده حتى يقبض نصابا ويحول عليه الحول۔

ترجمہ: ”لیکن ایسے تمام قرضے جن کا اقرار کیا جا چکا ہو، امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ

کے نزدیک ان کے تین درجے ہیں، (ایک دسین) ضعیف، یہ وہ دین ہے جس کا وہ اپنے کسی فعل کے بغیر مالک بن گیا ہو، اور وہ مال کسی چیز کے بدلے میں اسے نہ ملا ہو، جیسے مال وراثت، یا اس کے فعل سے تو ہو لیکن کسی چیز کے بدلے میں نہ ہو، جیسے وصیت یا اسکے فعل سے تو ہو لیکن کسی مال کے بدلے میں نہ ملا ہو، جیسے مہر، بدل خلع، قتل عمد پر صلح کے عوض ملنے والا مال، دیت اور بدل کتابت، ایسے اموال میں امام اعظم کے نزدیک زکوٰۃ نہیں ہے، تا وقتیکہ کے وہ قبضے میں آجائے اور نصاب زکوٰۃ کے برابر ہو اور اس پر سال گزر جائے (بشرطیکہ وہ شخص پہلے سے صاحب نصاب نہ ہو)، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1: ص: 174، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ: کسی شخص کی وفات کے ساتھ ہی، اس کا مال ترکہ بن جاتا ہے اور حکماً اس مال کی ملکیت ورثاء کو منتقل ہو جاتی ہے، لیکن تقسیم وراثت سے پہلے ورثاء کا اس مال پر ”ملک تام“ (یعنی ملکیت مع قبضہ) نہیں ہوتا تا وقتیکہ تقسیم وراثت کے بعد وہ اس پر قبضہ کر لیں، لہذا صورتِ مسئلہ میں ترکے کی تقسیم سے پہلے سالوں کی زکوٰۃ اس مال پر واجب نہیں ہوگی۔

زکوٰۃ کی رقم سے ڈائلیس مشین کی خریداری

سوال : 60

عرض یہ ہے کہ ہم عزیزِ منیبہ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام فیڈرل ”بی“ ایریا میں ایک ڈائلیس سینٹر چلا رہے ہیں جہاں پر نا کارہ گردے کے مریضوں کا ڈائلیس کیا جاتا ہے اور اس سے زیادہ تر زکوٰۃ کے مستحق لوگوں کا ڈائلیس کیا جاتا ہے۔ جب کہ کچھ لوگ آدھے چارج یا پورے چارج دیتے ہیں ان کا بھی ڈائلیس کیا جاتا ہے۔

ہمیں کچھ صاحب ثروت حضرات زکوٰۃ کی مدد سے ڈائلیس مشین دینا چاہتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری رہنمائی فرمائیں کہ:

1۔ کیا زکوٰۃ فنڈ سے ڈائلیس مشین لی جائے یا نہیں؟

2۔ اگر مشین لی جائے تو اس پر پورے یا آدھے چارج دینے والے مریضوں کا علاج کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟، اگر چارج دینے والوں کا علاج زکوٰۃ فنڈ سے لی ہوئی ڈائلیس مشین سے نہیں کر سکتے تو برائے مہربانی شریعت اسلامیہ کے مطابق اسکا کوئی حل ہو سکتا ہے تاکہ عوام الناس کے فائدے کے لئے زکوٰۃ فنڈ سے خریدی ہوئی ڈائلیس مشین استعمال ہو سکے، (احمد عبدالشکور غشی)۔

جواب:

محتاج صورت تو یہ ہے کہ ڈائلیس مشین زکوٰۃ کی رقم سے لے کر کسی بھی مستحق کی ملک کر دی جائے اور وہ اسے آپ کے ڈائلیس سنٹر کو حبیہ کر دے، پھر اسے آپ مستحق زکوٰۃ مریضوں، نصف فیس یا مکمل فیس دینے والے یا غیر مستحق زکوٰۃ مریضوں کے لئے بھی بلا فیس استعمال کر سکتے ہیں اور کسی سے پوری فیس بھی چارج کر سکتے ہیں۔

دوسری صورت برسمیل تنزل یہ ہے کہ ائمہ احناف کے ہاں تو زکوٰۃ میں تملیک یعنی مستحق کو مالک بنانا شرط ہے لیکن اہلسنت کے دیگر ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تملیک شرط نہیں ہے۔ ہمارے مفسرین احناف میں سے علامہ خفاجی، علامہ شیخ زادہ، علامہ ابوسعود اور علامہ محمود آلوسی نے فقراء، مساکین، عالمین اور موقوفۃ القلوب کے لئے تو تملیک کی شرط کو برقرار رکھا ہے لیکن مکاتب غلاموں کی آزادی، مقروض افراد یا کسی تاوان یا جرمانے میں پھنسے ہوئے افراد، مسافروں اور ان لوگوں کے لئے جو ہمہ وقت اللہ کے دین

کے کسی کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے ہیں، جیسے مجاہدین فی سبیل اللہ یا دینی طلبہ، لیکن مستحق زکوٰۃ ہیں، ان کے لئے تملیک کو شرط لازم قرار نہیں دیا بلکہ ان کے مصالح پر خرچ کر سکتے ہیں، پس اگر ڈائلیسیس مشینیں زکوٰۃ فنڈ سے خریدی جائیں تو پھر ان مشینوں سے صرف مستحقین ہی استفادہ کر سکیں گے۔

علامہ قاضی شہاب الدین احمد بن محمد بن عمر خفاجی حنفی متوفی 1069ھ سورۃ التوٰبہ آیت نمبر 60، جس میں اللہ تعالیٰ نے مصارف زکوٰۃ کا بیان فرمایا ہے، اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: پہلے چار مصارف کے ساتھ ”لام“ اور آخری چار مصارف کے ساتھ ”فی“ ذکر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ پہلے چار مصارف میں ان کو زکوٰۃ سے ان کا حصہ ادا کر کے ان کو ان حصوں کا مالک بنا دیا جائے۔ اور آخری چار مصارف میں ان کو زکوٰۃ میں سے ان کے حصے کا مالک نہیں بنایا جائے گا، بلکہ ان کا حصہ ان کی فلاح اور ان کے مصالح میں خرچ کیا جائے گا، مکاتب کا مال اس کے مالک کو دیا جائے گا اور مقروض کا مال (اس کے حصے کی زکوٰۃ) اس کے قرض خواہ کو دیا جائے گا، اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنا بالکل واضح ہے، (عمنایت القاضی جلد 4 ص: 558، دارالکتب العلمیہ بیروت)۔

چونکہ گردے کی بیماری ایک خطرناک مہلک بیماری ہے، جو جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے، مریض کی بقاء حیات کے لئے ڈائلیسیس طبی طور پر ناگزیر ہے، اس لئے ہم نے اس میں دوسرے ائمہ کے قول کو اس اصول کی بنیاد پر اختیار کیا ہے کہ: ”ضرورت ممنوعات کو بھی مباح کر دیتی ہے“۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ اصول بھی پیش نظر رہے کہ: ”ضرورت کی بناء پر دی جانے والی رخصت یا جواز کو اس کے دائرے میں محدود رکھنا چاہئے“۔ ہم نے اس مسئلے میں بعض حنفی مفسرین کے بیان کردہ ٹیسر (آسانی)

والے قول کو نقل کیا ہے، لیکن فقہ حنفی کا مسلمہ اور مختار مسلک یہی ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک شرط ہے، لہذا ہماری بیان کردہ اس رخصت کو دوسرے مقامات یا مواقع کے لئے استعمال نہ کیا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

مقامی مدارس میں زکوٰۃ اور نقلی صدقات کا استعمال

سوال: 61

مسجد میں ایک مدرسہ ہے اور اس مدرسہ میں بچے اور بچیاں فی سبیل اللہ قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اس مدرسے میں نہ مستقل رہائش کا انتظام ہے نہ قیام کا اور نہ طعام کا، اس مدرسے کے اخراجات جس میں مدرسے کی دیکھ بھال اور استاد کی تنخواہ وغیرہ شامل ہے ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے درج ذیل میں سے کونسا پیسا استعمال کرنا درست ہے؟۔ چہ مقرر بانی کے ذریعے جو رقم حاصل ہوتی ہے زکوٰۃ اور فطرہ سے حاصل ہونے والی رقم صدقات و خیرات اور ہدیہ سے حاصل ہونے والی رقم، قرآن و سنت کی روشنی میں جواب دے کر میری ذہنی تشفی فرمائیں، (عبدالرؤف تاجی، لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

بعض جگہ مقامی طور پر مساجد میں یا بعض دینی، تبلیغی اور رفاہی تنظیموں کے تحت مکاتب تعلیم القرآن کا ایک نیٹ ورک قائم کیا گیا ہے، ان مدارس و مکاتب میں ان مقامی لوگوں کے بچے حفظ و ناظرہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں جو زکوٰۃ یا فطرہ ان اداروں کو دیتے ہیں، ان مدارس و مکاتب کے معلمین کے مشاہرے ادا کرنے کے لئے زکوٰۃ، فدیہ، فدیہ صوم، نذر، کفارہ کی رقوم جمع کی جاتی ہیں۔ ایسے مصرف کے لئے زکوٰۃ

لینا اور دینا جائز نہیں، کیونکہ یہ خود اپنی زکوٰۃ سے استفادہ کی بالواسطہ صورت ہے۔
ایسے مدارس میں چرم قربانی کی مد میں حاصل شدہ رقم، عام خیرات یعنی نفلی صدقات اور عطیات کی رقم صرف کی جاسکتی ہیں، اسی طرح کوئی نفلی طور پر ایصالِ ثواب کرنا چاہے تو وہ بھی کر سکتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

زکوٰۃ کی ادائیگی میں تملیک کی شرط

سوال: 62

اس خط کے ذریعے ایک اہم مسئلے پر آپ کی رائے کا خواستگار ہوں امید ہے کہ اپنے قیمتی وقت سے چند لمحات نکال کر مجھے اپنی رائے سے مستفیض فرمائیں گے۔ میں نے بہت سال پہلے اپنے ہر بچے کے نام پر یا اس کے لئے اپنے نام پر قسطوں میں پلاٹ لئے تھے، نیت خالصتاً یہ تھی کہ یہ پلاٹ بچوں کے بڑے ہونے پر ان کے حوالے کر دوں گا کہ اس پر مکان بنائیں یا اسے بیچ کر اس رقم سے کہیں اور مکان بنائیں یا حالات کے مطابق اس کا کوئی مصرف نکالیں، تین سوالات جو غور طلب ہیں وہ عرض کر رہا ہوں۔

۱۔ جو پلاٹ بچوں کے نام پر ہی خریدے ہوئے ہیں اور ان کے نام پر ہی سرکاری طور پر رجسٹرڈ ہیں، کیا مجھے یا بچوں کو ان پر زکوٰۃ دینا پڑے گی؟۔

۲۔ جو پلاٹ میں نے اپنے نام پر خریدے تھے، لیکن بچوں کے لئے ہی خریدے تھے اور سرکاری طور پر ان کو ان کے نام رجسٹری کروادی گئی ہے، کیا اس پر مجھے یا بچوں کو ماضی یا مستقبل میں زکوٰۃ دینا ہے؟۔

۳۔ جو پلاٹ ابھی تک میرے نام ہی ہیں لیکن مناسب وقت پر بچوں کے نام کر دیئے

جائیں گے، تو کیا ان پر ماضی یا مستقبل میں زکوٰۃ لازم ہے؟، (پروفیسر مبشر کریم کورا، E-131 فیئر 1 ڈیفنس، لاہور)۔

جواب:

صورتِ مسئلہ میں برصدق بیانِ سائل جو پلاٹ آپ نے بچوں کے نام کر دیئے ہیں اور انہیں کے نام پر رجسٹرڈ ہیں اور نیت یہی ہے کہ وہ اس پر اپنا رہائشی مکان بنائیں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ آپ کی ملکیت سے یہ خارج ہو چکے ہیں اور بچوں کی ملکیت ہیں۔ بچوں کے بالغ ہونے کے بعد بھی ان کی نیت یہی ہے کہ وہ ان پر مکان بنائیں گے تو ان پر ان کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، البتہ اگر ان کی نیت تبدیل ہوگئی اور ارادہ یہ ہوا کہ اسے بیچ دیں گے یا سرمایہ کاری کے طور پر رکھیں گے تو اس کے بعد انہیں ان پلاٹوں کی مروجہ مارکیٹ قیمت کے مطابق زکوٰۃ دینی ہوگی۔ جن مزید پلاٹوں کا آپ نے تذکرہ کیا ہے، جو خود آپ کے نام ہیں، اور جن کے بارے میں خود آپ نے لکھا ہے کہ مستقبل میں ان کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نیت ان پلاٹوں کے بارے میں فی الحال سرمایہ کاری کی نہیں ہے، لہذا اس صورت میں ان پلاٹوں کی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

فلا يصير للتجاره مع التردد الا بالنية۔

ترجمہ: ”کوئی مال نیتِ قطعیت کے بغیر تجارت کے لئے نہیں ہوگا، (فتاویٰ شامی، جلد: 2، ص: 10، مکتبہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)، واللہ اعلم بالصواب۔

زکوٰۃ کا استحقاق

سوال: 63

کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرع متین اس مسئلے کی ذیل میں، کیا خالہ خالو، ماموں ممانی کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟، (محمد رمیز، نارتھ کراچی)۔

جواب:

قراہت دار اگر صاحب نصاب نہ ہوں بلکہ مفلس و نادار ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے۔ تاہم اپنے اصول (یعنی ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی وغیرہ) اور فروع (یعنی بیٹا بیٹی، پوتا پوتی، نواسا نواسی وغیرہ) کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی، یہی حکم صدق و غطر فدیہ نذر اور کفارہ کی رقوم کا ہے۔ خالہ، خالو، ماموں، ممانی، بہویا داماد، سوتیلے باپ، سوتیلی ماں، دوسری ازواج سے شوہر کی اولاد یا شوہر کی اپنی بیوی کی کسی سابقہ شوہر کی اولاد (اگر صاحب نصاب نہ ہوں) کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔ البتہ بہن بھائی بشرط استحقاق ایک دوسرے کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

﴿کتاب الصوم﴾

دودھ پلانے والی ماں کے لئے روزے کا حکم

سوال : 64

میری بہو کی بچی کی عمر 3 ماہ ہے، پہلی بچی ہے، روزہ رکھنے سے بچی کی خوراک پوری نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی دوسرا دودھ پیتی ہے ماں کی صحت پہلے ہی کمزور ہے (100/60/80/60) BP رہتا ہے۔ رمضان المبارک کے بعد بھی روزوں کی قضا رکھنا مریضہ کے لئے مشکل ہے ایسی حالت میں کیا کیا جائے؟، (حاجی سید محمد، مرشد آباد نیریاں شریف آزاد کشمیر)۔

جواب :

عن انس بن مالک، قال: رخص رسول الله ﷺ للحبلى التى تخاف على نفسها، أن تفطر وللمرضع التى تخاف على ولدها۔
ترجمہ: ”حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے، ایسی حاملہ عورت کو، جسے (روزہ رکھنے کی صورت میں) اپنی جان تلف ہونے کا اندیشہ ہو اور ایسی دودھ پلانے والی عورت کو کہ جسے (روزہ رکھنے کی صورت میں) اپنے بچے (کی جان) کا خوف ہو، (عذر شرعی کی بنا پر رمضان المبارک کا) روزہ چھوڑنے کی رخصت عطا فرمائی ہے، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 1668)۔“
علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(أو حامل أو مرضع) أمّا كانت أو ظئراً على الظاهر (خافت بغلبة الظن على نفسها أو ولدها)

ترجمہ: ”یا حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت ہو، خواہ وہ بچے کی ماں ہو یا دودھ پلانے والی دائی، اسے اپنی یا بچے کی صحت کو نقصان پہنچنے کا غالب گمان ہو، ظاہر الروایہ کی رو سے، رمضان کا روزہ چھوڑنے کی رخصت ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 3 ص: 359 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

(ومنها حبیل المرأة وارضاعها) الحامل والمرضع اذا خافتا علی أنفسهما أو ولدهما أفطرتا وقضتا ولا كفارة علیهما کذا فی الخلاصة۔

ترجمہ: ”(اور ان بعض معذوروں میں سے ایک حمل والی اور دوسری دودھ پلانے والی عورت ہے) حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو رمضان کا روزہ عذر کی بنا پر چھوڑنے کی رخصت ہے، جب کہ ان دونوں کو خوف ہو اپنی جان یا بچے کا تو وہ افطار کریں گی یعنی روزہ نہیں رکھیں گی اور (بعد میں) اس کی قضا کریں گی اور ان دونوں پر کفارہ نہیں ہے جیسا کہ خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 207 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔“

پس مرضعہ کو چاہئے کہ اگر اس وقت روزے نہیں رکھ سکتی تو بعد میں اگر صحت درست رہے تو ان کی قضا کرے اور اگر بعد کو بھی نہیں رکھ سکتی تو ان روزوں کا فدیہ ادا کرے۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

بغلبة الظن بامارة أو تحجيرة أو باخبار طیب حاذق مسلم مستور۔

ترجمہ: ”غلبہ ظن، علامات، تجربہ یا مسلمان ماہر مستور الحال طیب کے بتانے سے ثابت ہوگا، (ردالمحتار علی المختار، ج 3، ص: 360-359، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

اگر تندرست شخص کو روزہ رکھنے سے بیمار پڑنے کا خدشہ ہو تو ان کے لئے (رمضان میں) روزہ نہ رکھنا جائز ہے، اور جب وہ روزہ رکھنے پر قادر ہو تو اس کی لازماً قضا کریں، جو بہت عمر رسیدہ ہو یا جس کو ایسا مرض لاحق ہو جس سے شفا کی امید نہیں ہے (جیسے زیا بیطس اور ہائی بلڈ پریشر) اور اس وجہ سے اس کو روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو اس کے لئے روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے اور اس پر ہر روزہ کے بدلے میں ایک مسکین کے طعام کا (تقریباً دو کلو گرام) فدیہ دینا لازم ہے، قرآن مجید میں ہے: نو علی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین ط

ترجمہ: ”اور جو لوگ روزہ کی بمشکل طاقت رکھتے ہوں، ان پر ایک مسکین کے طعام کا فدیہ لازم ہے، (البقرہ: 184)۔“
علامہ شامی لکھتے ہیں:

(قوله العاجز عن الصوم) ای عاجزاً مستمراً کمایاتی اما الولم یقدر علیہ لشدة الحر کان له ان یفطر ویقضیہ فی الشتاء۔

ترجمہ: ”اور جس شخص کو ایسا مرض لاحق ہو کہ جس سے شفا کی امید نہ ہو، جیسا کہ آگے آئے گا وہ (اس رخصت میں داخل ہے) (اور) اگر کوئی شخص گرمی کی شدت کی وجہ سے روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو تو اسے گرمیوں میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور سردیوں میں ان کی قضا رکھ لے گا، (رد المحتار علی الدر المختار، ج 3، ص: 359، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

عذر کی بنا پر روزے چھوڑنا

سوال: 65

سانس کے مریضوں کو وینٹولین کے پمپ استعمال کرنا پڑتے ہیں، ایسی

صورت میں روزہ رکھا جاسکتا ہے یا نہیں؟، (محمد اکبر، لیاقت آباد)۔

جواب:

اگر مریض اس اسٹیج پر ہے کہ پمپ کے استعمال کے بغیر مریض کا دن گزارنا مشکل ہے تو وہ معذور ہے، یہ آکہ استعمال کرے، روزہ چھوڑ دے، اور روزے کے بدلے میں فدیہ دے، کیونکہ اس آلے کے ذریعے ایک کیمیکل گیس یا سیال شکل میں انسان کے حلق سے اندر جاتا ہے، جس سے سکڑے ہوئے پھیپھڑے کھل جاتے ہیں اور تنفس یعنی سانس لینا آسان ہو جاتا ہے۔

غسل واجب ہو اور صبح صادق

سوال: 66

ماہ رمضان میں ایک شخص ایسے وقت بیدار ہوا کہ سحری کا وقت ختم ہونے میں انتہائی قلیل وقت باقی ہے، اور اس پر غسل جنابت واجب ہے، تو ایسے میں وہ شخص کیا کرے؟ پہلے سحری کرے یا غسل؟ آیا حالت جنابت میں روزہ درست ہوگا یا نہیں؟

جواب:

قرآن مجید میں (ماہ رمضان میں) طلوع فجر تک کھانے پینے اور عمل ازدواج کی اجازت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَالآن بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مِمَّا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔

ترجمہ: ”پس اب (چاہو تو) اپنی بیویوں سے مباشرت کرو، اور طلب کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھا ہو، اور کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ (ممتاز ہو کر) ظاہر ہو جائے

تمہارے لئے صبح کا سفید دھاگہ (رات کے) سیاہ دھاگے سے (یعنی صبح صادق شروع ہو جائے)، (البقرہ: 187)۔“

جب طلوع فجر تک ازواجی فعل میں مشغول رہنا جائز ہوا، تو حالت جنابت میں روزے کی نیت کرنا بھی جائز ہو گیا۔ صحیحین میں ام المؤمنین حضرت عائشہ اور ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ان رسول اللہ ﷺ کان یدرکہ الفجر، وهو جنب من أهله، ثم یغتسل ویصوم۔ ترجمہ: ”رسول اللہ ﷺ ازواج مطہرات سے قربت فرماتے اور (کبھی) حالت جنابت میں صبح صادق ہو جاتی، پھر آپ غسل فرماتے، اور روزہ رکھتے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1926)۔“

عن عائشة زوج النبی ﷺ قالت قد کان رسول اللہ ﷺ یدرکہ الفجر فی رمضان وهو جنب من غیر حلم فیغتسل ویصوم۔ ترجمہ: ”ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ماہ رمضان میں کبھی رسول اللہ ﷺ پراحتلام کے بغیر حالت جنابت میں صبح صادق آ جاتی آپ غسل فرماتے اور روزہ رکھتے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2486)۔“

عن عائشة رضی اللہ عنہا ان رجلاً جاء الی النبی ﷺ یستفتیہ وہی تسمع من وراء الباب فقال یا رسول اللہ ﷺ تدرکنی الصلوة وانا جنب فاصوم فقال رسول اللہ ﷺ وانا تدرکنی الصلوة وانا جنب فاصوم فقال لست مثلنا یا رسول اللہ قد غفر اللہ لك ما تقدم من ذنبك وما تأخر فقال واللہ انی لا رجوا ان اکون اخشاکم للہ واعلمکم بما اتقی۔

ترجمہ: ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک

شخص مسئلہ معلوم کرنے آیا دریاں حالیکہ وہ بھی دروازے کے پیچھے سے سن رہی تھیں، اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! (کبھی) حالت جنابت میں نماز فجر کا وقت آجاتا ہے، تو میں (اس وقت غسل کر کے پاک ہوتا ہوں) اور روزہ رکھتا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کبھی حالت جنابت میں مجھ پر بھی نماز فجر کا وقت آجاتا ہے، میں (غسل کر کے نماز پڑھتا ہوں) اور میں روزہ رکھ لیتا ہوں، اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! ہم آپ کی مثل کب ہیں! اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے ذنب کی قطعی مغفرت فرمادی ہے! آپ ﷺ نے فرمایا: بخدا مجھے یہ یقین ہے کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے خشیت رکھنے والا ہوں اور جن چیزوں سے بچنا چاہئے ان کا میں تم سب سے زیادہ عالم ہوں، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2489)۔“

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ومن اصبغ جنبا أو احتلم في النهار لم يضره كذا في محيط السرخسي -

ترجمہ: ”اور جس نے حالت جنابت میں صبح کی، یا دن میں احتلام ہو گیا تو یہ اس کے (روزے) کے لئے نقصان دہ نہیں، محیط سرخسی میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 200، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“ مذکورہ صورت میں چاہئے کہ پہلے اچھی طرح ہاتھ دھو کر، کلی وغیرہ کر کے سحری کرے اور بعد میں غسل کرے، پھر نماز پڑھے اور اس صورت میں اس کا روزہ درست ہوگا، لیکن لازم یہ ہے کہ غسل کرنے میں اتنی تاخیر نہ کرے کہ فرض نماز کا وقت جاتا رہے، اگر نماز قضا ہو گئی تو گناہ گار ہوگا۔

﴿کتاب الحج﴾

فلسفہ و روح حج

اسلام کی کامل روح تو یہ ہے کہ بندہ مومن کی زندگی مجسم عبادت بن جائے، اس کی چال ڈھال، رفتار و گفتار، نشست و برخاست، انفرادی و اجتماعی معاملات، حتی کہ ہر شعبہ زندگی اور ہر لمحہ حیات میں اللہ تعالیٰ کی مکمل بندگی اور اس کے رسول ﷺ کی کامل اطاعت کی جھلک نظر آئے۔ ہم نے جو زندگی کو دین اور دنیا کے نام سے دو خانوں میں تقسیم کر دیا ہے اس دورنگی اور دوئی کا خاتمہ ہو جائے۔ اگر انسان زندگی کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا اور اطاعت کے قالب میں ڈھال لے اور اس کا وجود اللہ کے بندوں کے لئے فیض رساں اور وسیلہ رحمت بن جائے تو اس کی معیشت، تجارت اور سیاست سب کچھ عبادت بن جائے گی۔ اور خوف خدا اور اخلاقی گرفت سے عاری زندگی جو انسانیت کے لئے باعث آزار بن گئی ہے، اس سے نجات مل جائے گی۔

لیکن اس عمومی اور جامع (Comprehensive) اور کامل (Perfect) تصور عبادت کے ساتھ اسلام نے رسمی عبادات (Rituals) کا ایک حکیمانہ اور مربوط نظام بھی عطا کیا ہے، جن کا حقیقی اور اعلیٰ مقصد بندہ مومن کے قلب میں اس جامع و کامل تصور عبادت کو ابھارنا ہے، یہ عبادات تین قسم پر مشتمل ہیں۔

(1) خالص بدنی عبادات: جیسے نماز اور روزہ، یہ بہر صورت ہر بندے کو خود ادا کرنی ہوتی ہیں اور ان میں نیابت (Assistance) کا کوئی تصور نہیں۔

(2) خالص مالی عبادت: جیسے زکوٰۃ فطرہ وغیرہ، ان میں نیابت چل جاتی ہے یعنی کوئی شخص دوسرے کا وکیل اور نمائندہ بن کی بھی ادا کر سکتا ہے۔

(3) مخلوط عبادت: یعنی جو بدنی بھی ہو اور مالی بھی، اس میں بھی اصل روح تو یہی ہے کہ بندہ خود ادا کرے لیکن اگر پر بنائے معذوری و مجبوری خود نہ ادا کر سکتا ہو تو اس کی نیابت میں اس کی خواہش اور مصارف پر دوسرا قابل اعتماد آدمی بھی کر سکتا ہے، اسے ”جج بدل“ کہتے ہیں۔

جج کا معنی و مفہوم: لغت میں جج کے معنی ہیں، کسی قابل تعظیم چیز کا قصد کرنا، اور اصطلاح شریعت میں عبادت کی غرض سے بیت اللہ کے قصد کو جج کہتے ہیں، بشرطیکہ اس میں مقررہ ارکان، شرائط، فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات کی ادائیگی کا پورا اہتمام کیا گیا ہو اور محرمات و مکروہات سے اجتناب کیا گیا ہو۔

جج کی اہمیت: جج کا سبب بیت اللہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بیت اللہ کا جج کرنا لوگوں پر اللہ کا حق ہے، جو بھی وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، جامع ترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص سفر کے خرچ اور سواری پر قادر ہو، جس کے ذریعے وہ بیت اللہ تک پہنچ سکے اور اس کے باوجود وہ جج نہ کرے، تو عملاً اس سے کوئی فرق نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے؟۔

امام بیہقی (Imam Baihaqi) نے حضرت ابو امامہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص جج کے لئے زاد راہ اور سواری کی استطاعت رکھتا ہو، کوئی شدید مجبوری، معذوری، بیماری یا کوئی ظالم بادشاہ رکاوٹ نہ بنے اور اس کے باوجود وہ جج نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کو اس سے کیا غرض کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔ قرآن وحدیث کی یہ وعید شدید (Strong Threats of Punishment) پر شکوہ اور بے نیازانہ انداز مخاطب یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کے نزدیک جج کی اہمیت کیا ہے اور بلا عذر کسی تارک جج کا

مقام اسلام کیا ہے؟ اور یہ کہ اس کا عمل یہود و نصاریٰ سے کچھ مختلف نہیں ہے۔
اسلام دین فطرت ہے: اسلام دین فطرت ہے اس کی تعلیمات عقل سلیم (Sane) کے عین مطابق ہیں، اسلام کی کوئی بھی تعلیم عقل و دانش سے متصادم نہیں ہے، لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی کوتاہ بینی، عقل نارسا اور فہم کی کمی کی بنا پر کسی امر الہی کی حکمت کو سمجھ نہیں پاتا لہذا اسے ہم ماورائے عقل (Beyond the Reach of Rationality) تو کہہ سکتے ہیں کہ خلاف عقل (Contrary to the Rationality) ہرگز نہیں۔

حج ایک کیفیت اور جذب و جنون کا نام ہے: حج میں بھی انسان کو سوچ اور فکر و آگہی کے ان مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، انسان سوچتا ہے کہ طویل مسافتیں طے کر کے اور مشقتیں برداشت کر کے اطراف عالم کے مسلمانوں کو ایک مقام پر جمع کرنے میں آکر کیا راز پنہاں ہے؟ سب لوگوں کا اپنا روایتی لباس اتار کر دو چادریں پہنا دینے میں کیا مصلحت ہے؟، آخر اس میں کیا حکمت ہے کہ لاکھوں انسان دیوانہ وار پتھر کی ایک عمارت کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں، دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑ رہے ہیں، ایک خاص دن اور تاریخ کو ایک خاص مقام پر پورا شہر آباد ہوتا ہے اور شام کو اجڑ جاتا ہے لاکھوں لوگ پتھروں کے علامتی ستون پر کنکریاں بربسا رہے ہیں، ایک خاص مقام پر ایک ہی دن لاکھوں لوگ جمع ہو کر لاکھوں جانوروں کی قربانی پیش کرتے ہیں، آخر کیوں؟۔ یہ سارے انداز یہ بتاتے ہیں کہ حج معمول کے شب و روز کا نام نہیں بلکہ معمول کی زندگی کو ترک کر کے مجاہدانہ انداز سے (Camp Life) گزارنے کا نام ہے، ایک محدود عرصے کے لئے لباس، رنگ، علاقیت، زبان اور نسب و نسل کے تمام امتیازات کو کلی طور پر ترک کر دینے کا نام ہے، یہ سب کچھ دراصل امام انبیاء، ابوالانبیاء، مرکز

السلسلہ، اولوالعزم رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام، ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی اہلیہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اداؤں کو اپنانے کا نام ہے، عالمی اسلامی اخوت، وحدت و اتحاد اور نظریاتی ہم آہنگی کے بھرپور مظاہرے کا نام ہے، اور اس عزم کے عملی اظہار کا نام ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے دین کا تقاضا ہوا تو ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا دینے کا عزم رکھتے ہیں اور حج اسی عزم مصمم کے اظہار کا نام ہے، اور اگر یہ ”روح حج“ ہمارے قلب و قالب میں صحیح معنوں میں اتر گئی تو ہم نے مقصد حیات پالیا، ورنہ محض مشقت سفر کے سوا اور حکم الہی کی ظاہری تعمیل کے سوا ہمارے ہاتھ کچھ نہ آیا۔۔۔ ایک دفعہ ایک حاجی، حج کر کے واپسی پر اللہ کے ایک محبوب و مقرب ولی سے ملنے چلا گیا۔ اللہ کے اس ولی نے اس سے سفر حج کی تفصیلات پوچھیں تو اس نے ایک ایک کر کے منا سک حج بیان کرنے شروع کئے، اللہ کے ولی نے کہا کہ دوست یہ بتاؤ جب پورے جذبے اور جوش و خروش کے ساتھ تم شیطان کو کنکریاں مار رہے تھے تو کیا تم نے اس شیطان کو بھی سگسار کیا تھا جو ”نفس امّارہ“ کی شکل میں تمہارے وجود کے اندر آسن جما ئے بیٹھا ہوا ہے؟ اس نے جواب دیا: نہیں ایسا تو نہیں ہوا۔ انہوں نے پوچھا کہ ”جب تم قربانی کے جانور کے گلے پر چھری چلا رہے تھے تو اس مرحلے پر کبھی تم نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح، میرے خالق و مالک کو میری جان کا نذرانہ بھی مطلوب ہوا تو میں اپنی جان و مال کی ہر قربانی دین اسلام کے لئے پیش کر دوں گا؟“ اس نے کہا: ایسا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔“ تو یہ سن کر اللہ کے نیک بندے نے کہا: ”پھر دوبارہ حج کرو تم نے درحقیقت حج کیا ہی نہیں۔ تو حج دراصل اس کیفیت عشق اور اللہ کی راہ میں اس وارفتگی اور جذب و جنوں کا نام ہے، جس کی روایت حضرت

ایرہیم واسماعیل علیہما السلام نے ڈالی ہے۔

کعبہ معبود نہیں، جہت عبادت ہے: جب ہم عین بیت اللہ کی چوکھٹ کے سامنے سجدہ کر رہے ہوں تب بھی بیت اللہ ہمارا مسجود و معبود نہیں ہوتا، مسجود و معبود تو صرف اور صرف اللہ کی ذات ہوتی ہے، بیت اللہ تو صرف ”جہت سجدہ“ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے غافلانہ اس میں حکمت یہ مستور رکھی ہے کہ کعبے کو اپنے انوار و تجلیات کا مرکز و مہبط (Focusing Point) بنا کر ہمیں اس کی جانب رخ کر کے نماز پڑھنے اور اس کے گرد طواف کرنے کا حکم دیا تا کہ ہم پر کعبہ کی برکات کے طفیل اس کی رحمتوں، برکتوں اور انوار و تجلیات کا نزول ہو، دوسری حکمت یہ ہے کہ ہماری عبادت کے لئے مرکز بیت، ایک نقطہ ارتکا ز توجہ (Point of concentration) ہوتا کہ ہم مختلف سمتوں کی جانب بھٹکنے سے محفوظ رہیں، اطراف عالم کے مسلمانوں میں ایک مثالی وحدت اور یک رنگی پیدا ہو جائے، چنانچہ رسول ﷺ نے اسی قبلے کو مومن کی شناخت اور پہچان کا وسیلہ قرار دیتے ہوئے فرمایا: ”جس نے ہماری طرح نماز پڑھی، ہمارے قبلے کی جانب عبادت میں رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا تو وہ ظاہری علامات کے اعتبار سے مسلم ہے۔“

حج زندگی میں تبدیلی کا فیصلہ کن موڑ اور نقطہ آغاز: اسلام یہ چاہتا ہے کہ حج مومن کی زندگی میں تبدیلی لائے بلکہ چاہے کہ یہ ایک فیصلہ کن موڑ (Turning Point) بن جائے، گناہوں کو ترک کر کے پاکیزہ زندگی گزارنے کا نقطہ آغاز ہو، بندہ اپنے رب سے شعوری طور پر ایک عہد و پیمان اور تجدید و وفا کا عزم کر کے، صرف سلا ہوا لباس ہی نہ اتارے بلکہ وہ لباس معصیت جس میں سر تاپا جکڑا ہوا ہے اسے بھی اتار رکھیں، صرف دو سفید چادروں پر مشتمل اجلا لباس ہی نہ پہنے بلکہ ایمان و یقین اور کر

دار کو بھی اتنا ہی مُصَفّی، مز کی اور مُنَوّر بنا دے، جس طرح اس نے وہ لباس پہنا ہے جو فطرت سے قریب تر، زیب و زینت اور بناؤ سنگھار کے تکلفات سے آزاد ہے، خود اپنے آپ، اپنی روح اور جسم کو بھی اسی فطرت سلیم کے سانچے میں ڈھال لے، جس پر خالق نے اسے پہلے روز تخلیق فرمایا تھا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ”ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی (Adherent of Mazdaism) بنا دیتے ہیں۔“ یعنی حج کا لباس بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو گناہوں کی ان آلودگیوں سے دور کر کے جو معاشرے نے اس پر تھونپ دی ہیں اور فطرت سے قریب تر بلکہ عین مطابق ہو جائے اسی حقیقت کو رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمایا: ”جس نے خالص اللہ کی رضا کے لئے حج کیا اور اس کے دوران نہ تو شہوت رانی (Abscentity) کی اور نہ ہی گناہ کیا تو وہ گناہوں سے ایسا پاک و صاف ہو کر لوٹے گا جیسے اپنی پیدائش کے دن گناہوں سے پاک تھا۔“ ایسے ہی کامل و مکمل حج کو رسول اللہ ﷺ نے حج مبرور (Accept into the Grace of Allah) قرار دیتے ہوئے فرمایا: ”حج مبرور کی جزا جنت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔“ اور اگر ہم نے حج سے یہ مقصد حاصل نہ کیا تو کیا ہم نے حج کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں، ایسی بے رخ عبادات صرف صو رتاً عبادات ہوتی ہیں، حقیقتاً نہیں جیسا کہ فرمان رسول ﷺ ہے: ”بہت سے روزے دار ایسے ہیں، جنہیں ان کے رزوں سے بھوک کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور بہت سے قائم اللیل (راتوں کو اٹھ کر عبادت کرنے والے) ایسے ہیں، جنہیں اپنی عبادتوں سے بیداری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“

حج بنیادِ طور پر مشقت کی عبادت ہے: حج بنیادِ طور پر مشقت و کلفت

(Hardship) کی عبادت ہے، حج کی یہ کیفیت آج سے ہزار سال پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے، ماضی میں سفر کی صعوبتیں، زادراہ کی دشواریاں، موسم کی ناگواریاں، سنگریزوں، نوکیلے پتھروں اور کانٹوں پر چلنا، پانی کی عدم دستیابی، وسائل کی کمی وغیرہ، آج مادی لحاظ سے تصورات و توقعات سے زیادہ راحتیں، آسائشیں بلکہ تعیشات موجود ہیں، لیکن مشقت کی روح آج بھی موجود ہے اس مشقت کا سب سے بڑا سبب انسانوں کا ہجوم، انسان کا آسائشوں اور تعیشات کا دلدادہ ہونا، محنت و مشقت کا عادی نہ ہونا، جذباتی ثار و قربانی کا فقدان، صرف اپنی ذات اور اپنے مفادات کا اسیر ہونا وغیرہ، چنانچہ آج طواف، سعی اور رمی جمرات اور منیٰ میں حادثات پہلے سے بدرجہا زائد ہوتے ہیں۔ حاجی جب حج سے واپس آتا ہے تو اس کے تجربات میں طرح طرح کے شکوہ، شکایات، معلمین کے نا روا سلوک کی حکایات اور اپنی اور سعودی حکومت کے عمال کی بد سلوکی کے سوا کچھ نہیں ہوتا یہ طرز فکر و عمل اس لئے ہے کہ ہم ذہنی طور پر اس عمل کے لئے تیار ہو کر نہیں جاتے کہ ہم ایک سپاہی کی طرح ”ہیمپ لائف“ میں جا رہے ہیں ہمیں ایک بڑی مشقت کے عمل سے گزرنا ہے۔ راحت و آرام اور تعیش ہمارا مقصود و مطلوب نہیں ہے اگر ہم ایسی سوچ لیکر جائیں تو پھر ہر بڑی تکلیف ہمیں چھوٹی نظر آئے، اور ہمیں یہ احساس ہو کہ اتنا بڑا اجر اسی تکلیف و مشقت کا صلہ و انعام ہے۔ پھر ہم معلم وغیرہ کی شکایات پر وقت صرف کرنے کے بجائے زیادہ وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ذکر و فکر میں گزاریں گے، اور کلفت کو اجر کا وسیلہ سمجھ کر اسے دل سے قبول کریں گے۔

قرع اندازی اسکیم پر جج

سوال: 67

عرض یہ ہے کہ سوئی صدرن گیس کمپنی کے افسران اپنی مرضی سے ہر ماہ ایک مقررہ رقم جج کنٹری بیوشن کے نام پر اپنی تنخواہ سے کٹواتے ہیں۔ ہر سال جج کی قرعہ اندازی ہوتی ہے، اور جس خوش نصیب کا نام قرعہ میں نکل آئے، اسے جج فنڈ سے جج پر بھیجا جاتا ہے۔ اس مرتبہ ایک ایسے افسر کا نام نکل آیا ہے، جو قادیانی ہے اور ہر ماہ ایک مقررہ رقم جج کنٹری بیوشن کے لئے اس کی تنخواہ سے کاٹی جاتی ہے (اور اس بارے میں ہمیں پہلے علم نہ تھا)۔ اس بارے میں شریعت اور قانون کیا کہتا ہے؟ کیا اس شخص کو جج کے لئے بھیج سکتے ہیں؟۔

کیا سعودی یا پاکستانی حکومت کی طرف سے ان کے جج کرنے پر کوئی قانونی پابندی ہے؟۔

کیا اس شخص کی رقم جج فنڈ میں شامل کی جاسکتی ہے۔ برائے مہربانی مسئلے کے حل کے جانب رہنمائی فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں، (اشفاق احمد، سوئی صدرن گیس کمپنی لمیٹڈ، گلشن اقبال روڈ، کراچی)۔

جواب:

اگر یہ کنٹری بیوشن سب شرکاء کی طرف سے رضا کارانہ ہے، کسی افسر کے دباؤ یا کسی اور سبب سے نہیں ہے۔ اور سب شرکاء کی اجازت ہے کہ ان کی جمع شدہ رقم سے جس ترتیب سے قرعہ اندازی میں لوگوں کا نام نکلتا ہے، انہیں جج پر بھیج دیا جائے، تو کوئی حرج نہیں اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، ایسے امور، جن میں تمام شرکاء کا استحقاق برابر ہو، کا فیصلہ از روئے قرآن و حدیث قرعہ اندازی سے ہو سکتا

ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَقُولُونَ أَقْلَامُهُمْ بِيَدِهِمْ يُكْفِلُ مَرِيْمَ۔

ترجمہ: ”اور آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ (قرعہ اندازی کے لئے) اپنے قلموں کو ڈالتے تھے کہ مریم کی کفالت ان میں سے کون کرے، (آل عمران: 44)۔“

البتہ قادیانی کو اس اسکیم میں شامل کرنا درست نہیں ہے، اگر ایسا کوئی شخص ہے تو اسے اسکیم سے الگ کر دیا جائے اور اس کی رقم اسے واپس کر دی جائے، کیونکہ قادیانی پاکستان میں آئینی طور پر اور شرعاً باجماع امت مرتد ہیں۔ وہ اگر سچ بول کر اپنے آپ کو غیر مسلم اور قادیانی لکھیں تو انہیں حج یا عمرے کا ویزا ہی نہیں مل سکتا، کیونکہ یہ سب مسلمانوں کے لئے ہے، اور اگر وہ کتمانِ حق کر کے، دھوکہ دہی اور فریب سے پاسپورٹ اور حج کی درخواست فارم میں اپنے آپ کو مسلم لکھیں تو یہ کذب صریح اور دھوکہ دہی ہے۔ حج فارم، شناختی کارڈ اور پاسپورٹ فارم سمیت تمام دستاویزات میں مسلمان کیلئے ختم نبوت کا اقرار اور قادیانی و لاہوری گروپ سے براءت کا حلفیہ اقرار نامہ لازمی ہے اور قادیانی اگر اپنے غیر مسلم ہونے کا اقرار کر کے پاسپورٹ بنائے، حج فارم بھرے، شناختی کارڈ فارم بھرے تو وہ شرعاً و قانوناً کسی بھی طریقے سے حج پر نہیں جاسکتا ہے اور اگر جھوٹا مسلم ہونے کا حلف نامہ بھرتا ہے تو صریح دغا باز ہے۔

اسقاطِ فرض کے لئے حج بدل سے متعلق ایک اہم مسئلہ

سوال: 68

ایک شخص دوسرے کی طرف سے حج کرتا ہو، کیا وہ صرف حج افراد کا احرام باندھے گا یا کہ حج تمتع اور قرآن بھی کر سکتا ہے؟، حج اور عمرہ کے موضوع پر ایک کتاب ہے، جس کا نام ہے: ”بیان مناسک حج و عمرہ“، اس کے صفحہ نمبر 39 پر لکھا ہوا ہے: ”جو

حضرات حج بدل کے لئے جارہے ہیں، وہ صرف حج افراد کا احرام باندھیں، دوسرا احرام نہ باندھیں، (یا سر رحمان، نکال آزاد کشمیر)۔

جواب:

حج بدل کی مجملہ شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ حج کرنے والا، جس کی طرف سے حج کر رہا ہے، اگر اس نے صرف حج افراد کرنے کا کہا ہے، تو اس پر ضروری ہے کہ وہ حج قرآن یا تمتع کا احرام نہ باندھے، اگر باندھے گا تو بھیجنے والے کا حج ادا نہ ہوگا۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

الرابع عشر: عدم المخالفة فلا أمره بالافراد فقرن أو تمتع ولو للميت لم يقع عنه ويضمن النفقة۔

ترجمہ: ”حج بدل کی چودھویں شرط یہ ہے کہ جو شخص حج بدل پر مامور ہے، وہ اپنے امر یعنی بھیجنے والے کے حکم کی مخالفت نہ کرے، اگر اس نے اسے حج افراد کا حکم دیا ہے اور حج بدل پر مامور شخص نے ”حج قرآن“ کیا یا ”حج تمتع“ کیا، خواہ وہ میت کی جانب سے ہو، تو وہ حج بھیجنے والے کی طرف سے واقع نہیں ہوگا، اور وہ حج بدل کرنے والا اس حج کے اخراجات کا خود ضامن ہوگا، (رد المحتار علی الدر المختار، جلد: 4، ص: 18، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

البتہ اگر ایک شخص نے کسی کو اپنی طرف سے عمرہ کرنے کے لئے بھیجا حج کے لئے بھیجا اور اس نے بھیجنے والے کی طرف سے پہلے عمرہ کر کے پھر اپنی طرف سے حج کیا یا بھیجنے والے کی طرف سے حج کرنے کے بعد پھر اپنی طرف سے عمرہ کیا، تو یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، جیسا کہ علامہ شامی لکھتے ہیں:

ولو أمره بالعمره فاعتمر ثم حج عن نفسه او بالاحج فحج ثم اعتمر عن نفسه جاز الخ۔۔۔ (رد المحتار على الدر المختار، جلد: 4، ص: 18، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

لہذا اگر بھیجنے والا خود اجازت دے کہ میری طرف سے ”حج تمتع“ کرو یا ”حج قرآن“ کرو تو پھر وہ مامور شخص اس کے حکم کی تعمیل میں حج تمتع یا حج قرآن کر سکتا ہے، اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

حج قرآن میں جنایت پر صورت مسئلہ کے مطابق ایک دم یا

ایک صدقہ لازم آئے گا یا دودو

سوال: 69

کیا قارن یعنی جو شخص اپنے میقات سے بیک وقت حج اور عمرے کا احرام باندھتا ہے اور پھر وہ احرام کے اندر رہتے ہوئے کسی ایسی جنایت کا ارتکاب کرتا ہے، جس سے دم لازم آتا ہے، تو کیا اس پر دو احرام کی وجہ سے دو دم لازم آئیں گے یا ایک ہی دم کافی ہوگا؟، اسی طرح ان امور میں جہاں بدنہ یا صدقہ لازم آتا ہے، ایک ہی بدنہ یا صدقہ کافی ہوگا یا دو دو لازم آئیں گے؟، (پروفیسر رضی الدین، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

علامہ علاء الدین ہسکفی لکھتے ہیں:

(ويجب دمان علي قارن حلق قبل ذبحه) دم للقران ودم للتاخير على
 ”المنهـب“ كما حرره المصنف قال: وبه ان يرفع ما تورثهـم بعضهم من
 جعل التمين للجنابة۔

ترجمہ: ”حج قرآن کا احرام باندھنے والے نے اگر قربانی سے پہلے حلق کر لیا (یعنی بال منڈھا دیئے) تو اس پر مذہب صحیح کے مطابق دو دم لازم آئیں گے، ایک دم قرآن اور ایک ذبح کو حلق سے مؤخر کرنے کے باعث دم لازم آئے گا، جیسا کہ مصنف (علامہ ترمذی) نے لکھا ہے، انہوں نے فرمایا: اور اس سے بعض لوگوں کا یہ وہم دور ہو گیا، جنہوں نے دونوں دم جنایت کے باعث لازم قرار دیئے ہیں۔“

اس کی تشریح میں کلام کرتے ہوئے علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وعن الثانی بأن التضاعف علی القارن انما یکون فیما اذا ادخل نقصا فی احرام عمرته، والا فلا یحب الا دم واحد، ولهذا اذا افاض القارن قبل الامام او طواف للزيارة جنبا او محدثا لا یلزمه الا دم واحد لانه لا تعلق للعمرة بالوقوف وطواف الزيارة۔

”قارن پر دو دم تب لازم آتے ہیں، جب اس کے عمرے کے احرام میں نقص لازم آیا ہو، ورنہ (عمرے کے بعد قارن پر بھی) صرف ایک ہی دم لازم آئے گا، لہذا جب قارن نے امام سے پہلے طوافِ افاضہ کیا یا بے وضو یا حالتِ جنابت میں طواف زیارت کیا، تو اس پر صرف ایک دم لازم آئے گا، کیونکہ عمرہ کا قوف عرفہ اور طواف زیارت سے کوئی تعلق نہیں ہے، (رد المحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 521، باب الجنایات، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)“،

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

مسئلہ: ”جہاں ایک دم یا صدقہ ہے قارن پر دو ہیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص: 762، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“

”جہاں ایک دم یا صدقہ ہے، قارن پر دو ہیں، (علمیہ کتب)، (بہار شریعت، جلد

ششم، ص: 499 مکتبہ رضویہ)۔

علامہ شامی نے البحر الرائق کے حوالے سے جو تفصیلی بحث کی ہے، اس کی روشنی میں قارن نے اگر عمرے کی ادائیگی کے دوران یا اس سے پہلے کسی جنایت کا ارتکاب کیا ہو تو اس پر صورت مسئلہ کی نوعیت کے مطابق دو دم یا دو صدقے لازم آئیں گے، اور اگر عمرے کی ادائیگی کے بعد اس نے جنایت کا ارتکاب کیا ہو تو صرف ایک دم یا ایک صدقہ لازم آئے گا، جہاں تک دم قرآن کا تعلق ہے، وہ اپنی جگہ ہے، اعلیٰ حضرت اور صدر الشریعہ رحمہما اللہ تعالیٰ کی عبارات سے اگرچہ بظاہر یہ تاثر ملتا ہے کہ قارن پر علی الاطلاق دو دم یا دو صدقے لازم آئیں گے، خواہ جنایت کا ارتکاب عمرے سے پہلے کیا ہو یا بعد میں، لیکن علامہ شامی کی مذکورہ وضاحت کی روشنی میں ان دونوں اکابر کے اقوال کو مطلق نہ سمجھا جائے بلکہ اس پر محمول کیا جائے کہ اگر جنایت کا ارتکاب عمرے کی ادائیگی سے پہلے یا عمرے کی ادائیگی کے دوران کیا ہو تو دو دم یا دو صدقے لازم آئیں گے، اور عمرے کی ادائیگی کے بعد ایک ہی دم یا ایک ہی صدقہ کافی ہوگا۔

دم کی ادائیگی حد و حرم میں

سوال: 70

ہم لوگ ابھی عمرہ کر کے آئے ہیں، وہاں میرے شوہر نے عمرہ مکمل کرنے سے پہلے احرام اتار دیا تھا۔ وہ فالج کے مریض ہیں، کچھ رہائش کا مسئلہ ہو گیا تھا، اس لئے ہم انہیں فوراً سعی نہیں کروا سکے، انہوں نے گرمی کی وجہ سے احرام اتار دیا تھا، دوسرے دن دوبارہ مسجد عائشہ سے احرام باندھ کر دوبارہ عمرہ مکمل کروایا، اب ہمیں اس کا کتنا دم دینا ہوگا، اور یہ دم حد و حرم ہی میں دینا ہوگا یا یہاں بھی ادا ہو سکتا ہے، (ہدایت اللہ، النور سوسائٹی، کراچی)۔

جواب:

عمرے کی ادائیگی میں سعی کرنا واجب ہے اور واجب کے ترک پر دم دینا واجب ہو جاتا ہے اور دم میں ایک بکری یا بھیڑ دی جائے گی۔

جنایت کا دم زمین حرم پر دینا ضروری ہے، دوسری جگہ ادا نہیں ہوگا۔ اور اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں، جب چاہے دے سکتا ہے۔

علامہ علاؤ الدین ہسکفی متوفی ۸۸۰ھ نے الدر المختار میں لکھا:

وَيَتَعَيَّنُ يَوْمُ النُّحْرِ اَيُّ وَقْتِهِ وَهُوَ الْاَيَّامُ الثَّلَاثَةُ بَدِيعِ الْمُتَعَةِ وَالْقُرْآنُ فَقَطْ فَلَمْ يَجْزِ قَبْلَهُ بَلْ بَعْدَهُ وَعَلَيْهِ دَمٌ وَيَتَعَيَّنُ الْحَرَمُ لَا مَنَىٰ لِلْكُلِّ۔

یعنی (قربانی کے لئے) متعین ہے یوم نحر اور اس کے لئے وقت صرف تین دن ہیں، واسطے تمتع اور قرآن والے کی قربانی کے۔ پس اس سے پہلے اور بعد جائز نہیں اور اگر کسی نے اس کے خلاف کیا تو اس پر ”دم“ ہے۔ اور دم زمین حرم میں کسی جگہ بھی دیا جاسکتا ہے اور اس کے لئے ”منیٰ“ مخصوص نہیں۔

در مختار کی درج بالا عبارت کے لفظ ”فقط“ پر علامہ شامی نے لکھا: لَا يَتَعَيَّنُ غَيْرُهُمَا فِيهَا۔

ترجمہ: ”ان دونوں (تمتع و قارن) کے علاوہ ان اوقات میں ذبح کرنا ضروری نہیں ہے، (رد المختار علی الدر المختار، جلد 4، ص: 35-36 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

احرام کی حالت میں دانت سے خون آنا یا بواسیر کا خون اور اس کا حکم

سوال: 71

احرام کی حالت میں دانت سے اور بواسیر کے مستے سے خون آنے پر کیا دم

دینا پڑتا ہے یا نہیں؟۔

2۔ حج کی ادائیگی کے بعد خاندان اور برادری کے افراد کو مدعو کر کے انہیں کھانا کھلایا جاتا ہے کیا حج کا یہ کھانا کھلانا ضروری ہے؟۔

3۔ حج کے دن والد اور والدہ نے کمزروہونے کی وجہ سے کسی دوسرے فرد کو رقم دیکر یہ فریضہ ادا کیا یہ صحیح یا اس پر دم دینا پڑے گا؟۔

4۔ والدہ صاحبہ نے حج کے دن قربانی کی ادائیگی کے بعد اپنے بالوں کی ایک پور کائی تھی اور احرام کھول دیا ان پر کم بال کاٹنے پر دم ہو گیا نہیں؟، (سید محمد علی D/3 ناتھ، کراچی)۔

جواب:

احرام کی حالت میں خون نکلنے سے دم واجب نہیں ہوتا، منہ یا دانتوں سے خون نکلا اگر تھوک پر غالب ہے تو وضو ٹوٹ جائے گا ورنہ نہیں، غلبے کی شناخت یہ ہے کہ اگر تھوک کا رنگ سرخ ہو جائے تو خون غالب سمجھا جائے اور اگر زرد ہو تو مغلوب۔ خون، پیپ یا زرد پانی جسم کے کسی بھی حصے سے نکل کر بہا اور بہنے میں ایسی جگہ پہنچنے کی صلاحیت تھی جس کا وضو یا غسل میں دھونا فرض ہے تو وضو جاتا رہا، مگر صرف چمکایا ابھرا اور بہنے کی صلاحیت اس میں نہیں تو وضو نہیں ٹوٹے گا، اسی طرح مسواک یا انگلی سے دانت صاف کرتے ہوئے یا دانتوں سے کوئی چیز کاٹی اور اس پر خون کا اثر پایا گیا یا ناک میں انگلی ڈالی اور اس پر خون کی سرخی آگئی مگر وہ بہنے کے قابل نہیں تو وضو نہیں ٹوٹا، ان تمام صورتوں کے باوجود محرم پر احرام کی حالت میں خون آنے پر کوئی دم واجب نہیں ہوگا۔

2۔ حاجی صاحبان کا خاندان اور برادری کے افراد کو مدعو کر کے کھانا کھلانا شرعاً ضروری

نہیں ہے، اگر کوئی شخص حج کے بعد شکرِ نعمت کے طور پر احباب کی دعوت کرتا ہے تو اس میں کوئی شرعی قباحت بھی نہیں ہے بلکہ عند اللہ اجر پائے گا، اگر محض نمود و نمائش مقصود ہے تو اجر آخرت سے محروم رہے گا، بہتر یہ ہے کہ دعوتوں میں امراء کے ساتھ نادار لوگوں کو بھی شریک کیا جائے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ولیمہ کے بارے میں فرمان ہے: **عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ اذہ کان یقول: شر الطعام طعام الولیمۃ، یدعی لہا الا غنیاء و یت ترک الفقراء، و من ترک الدعوة فقد عصی اللہ تعالیٰ و رسولہ ﷺ۔**

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ بُرا کھانا ولیمہ کا کھانا ہے جس میں مالدار لوگ بلائے جاتے ہیں اور فقراء چھوڑ دیئے جاتے ہیں اور جس نے دعوت کو ترک (یعنی بلا سبب انکار کر دیا) اس نے اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی کی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5177)۔“

3۔ رمی میں نائب مقرر نہیں کر سکتے ضعف اور کمزوری اس کے لئے مانع نہیں، لہذا ابو ٹھہے اور عورتیں آخری وقت میں جائیں رات میں رمی کرنا اگرچہ مکروہ ہے مگر عذر کی وجہ سے یہ کراہت باقی نہیں رہتی، رمی کسی وجہ سے نہ کر سکے تو دم دینا واجب ہے مگر ایک دن کی رمی ترک ہونے سے بھی ایک دم اور صرف ایک جمرہ کی رمی ترک ہونے سے بھی ایک دم اور تینوں دنوں کی رمی ترک ہونے سے بھی ایک دم لازم آئے گا، لہذا جب اگر ایسا عذر ہو جس کی وجہ سے رمی نہیں کر سکتا تو تیسرے دن دم دے گا اور یہ دم حد و حرم میں دینا ضروری ہے۔

4۔ عورتیں اپنے بالوں میں سے ایک پور کے برابر بال لے کر کاٹ دیں، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: **والتقصیر ان یا خد الر جل و المرأۃ من رؤس الشعر ربع الر**

اُس مقدار الانملہ کذا فی التبیین۔

ترجمہ: ”اور تفصیر یہ ہے کہ مرد اور عورت اپنے سر کے بال چوتھائی سر سے ایک پورے برابر لے لیں ”تیمین“ میں اسی طرح سے ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 231 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔“

دورانِ حج ناپاکی

سوال: 72

اگر کسی عورت کو دورانِ حج حیض آجائے تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟، (عادل، پشاور)۔

جواب:

اگر خاتون نے حج کا احرام باندھ لیا ہے، تو وہ محرمہ ہے، یعنی احرام میں داخل ہو چکی ہے۔ اب اگر دورانِ حج اسے حیض آجائے، تو وہ تمام مناسکِ حج معمول کے مطابق جاری رکھے گی، یعنی وقوفِ منی، وقوفِ عرفات، وقوفِ مزدلفہ، رمیِ جمار (یعنی شیطانوں کو کنکریاں مارنا)، قربانی اور احرام سے باہر آنے کا عمل دیگر حجاج کرام کے ساتھ جاری رکھے گی۔ اس دوران وہ دعائیں کر سکتی ہے، مگر تلاوت نہیں کر سکتی اور نماز بھی نہیں پڑھ سکتی۔ اسی طرح حیض سے فراغت تک طوافِ زیارت کو مؤخر کرے گی، حرم میں بھی نہیں جائے گی۔ اور چونکہ ”طوافِ زیارت“ میں تاخیر اس کی اپنی کسی بشری کوتاہی کی وجہ سے نہیں ہوئی، بلکہ یہ مانع یا ”عذر تاخیر“ اسے اللہ کی جانب سے پیش آیا ہے، اس لئے اس تاخیر کی بنا پر اس پر کوئی دم واجب نہیں ہوگا، لہذا جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تو غسل کر کے پاک ہو جائے اور ”طوافِ زیارت“ کر لے۔

حج و عمرہ کے مسائل

حج و عمرہ اور زیارتِ روضہ رسول ﷺ کے متعلق چند اشکالات کے جواب قرآن و سنت و فقہ حنفی کی روشنی میں عطا فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ جزاک اللہ، (سید محمد طاہر الحسن، مکان نمبر R-48 11-C-3 نارتھ کراچی)۔

سوال: 73

حرم کے رہنے والے عمرے کے لئے احرام کہاں سے باندھیں؟۔

جواب:

حدثنا همام وقال : اعتمر أربع عمر في ذي القعدة ، إلا التي اعتمر مع حجتها: عمرته من الحديبية ، ومن العام المقبل ، ومن الجعرانة حيث قسم غنائم حنين ، وعمره مع حجتها۔

ترجمہ: ”ہمام سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے چار عمرے کئے، سارے ذی القعدہ میں سوائے اس ایک کے جو اپنے حج کے ساتھ کیا۔ ایک عمرہ حدیبیہ والا، ایک اگلے سال تیسرا جعرانہ سے جبکہ خیمین کا مال غنیمت تقسیم کیا اور چوتھا عمرہ اپنے حج کے ساتھ، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 1780)۔“

أَنَّ عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَخْبَرَهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَهُ أَنْ يَرْدِفَ عَائِشَةَ وَيَعْمُرَهَا مِنَ التَّنْعِيمِ۔

ترجمہ: ”عبدالرحمن بن ابی بکر سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ عائشہ کو سواری کے پیچھے بٹھا کر تنعیم سے عمرہ کروالاد، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 1784)۔“

روالمختار میں علامہ ابن عابد بن شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں: (والتنعيم افضله)

هو موضع قريب من مكة عند مسجد عائشة، وهو اقرب موضع من الحل
 اى الاحرام منه للعمرة افضل من الاحرام لها من الجعرانة وغيرها من الحل
 عندنا، وان كان عليه السلام احرم منها، لأمره عليه الصلاة والسلام عبدالرحمن
 بان يذهب باخته عائشة الى التنعيم لتحرم منه۔

ترجمہ: ”(تنعيم سے احرام باندھنا افضل ہے) یہ وہ جگہ ہے، جو مکہ سے انتہائی قریب
 مسجد عائشہ کے نزدیک ہے اور حل سے قریب ترین جگہ ہے۔ یعنی عمرہ کے لئے تنعيم
 سے احرام باندھنا جعرانہ اور حل کے دیگر مقامات سے ہمارے نزدیک افضل ہے
 ، اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ سے بھی احرام باندھا ہے اور ہمارے اس موقف پر
 حجت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے کہ آپ نے عبدالرحمن بن ابی بکر کو حکم دیا کہ وہ اپنی بہن
 (ام المؤمنین) عائشہ کو

تنعيم لے جائیں تاکہ وہ وہاں احرام باندھیں، (رد المحتار علی الدر المختار،
 جلد 3 ص: 429 مطبوعہ: دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“
 مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں اگرچہ مسجد عائشہ (تنعيم) اور جعرانہ دونوں جگہ سے
 عمرے کا احرام باندھا جاسکتا ہے، لیکن مقام تنعيم (مسجد عائشہ) سے باندھنا افضل
 ہے۔

سوال: 74

کیا احرام کے لئے دو رکعت نفل ادا کرنا حدیث مبارک سے ثابت نہیں؟۔

جواب:

احرام کے لئے دو رکعت نفل پڑھنا سنت ہے اور حدیث مبارک سے ثابت
 ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

حدثني خصيف بن عبد الرحمن الجزري، عن سعيد بن جبير، قال: قلت لعبد الله بن عباس: يا أبا العباس، عجبت لاختلاف أصحاب رسول الله ﷺ في إهلال رسول الله ﷺ حين أو جب؟ فقال اني لأعلم الناس بذلك، انهما انما كانت من رسول الله ﷺ حجة واحدة، فمن هناك اختلفوا۔ خرج رسول الله ﷺ حاجاً، فلما صلى في مسجده بذي الحليفة ركعتين أو جب في مجلسه، فأهل بالحج حين فرغ من ركعتين، فسمع ذلك منه أقوام فحفظته عنه، ثم ركب فلما استقلت به ناقته أهل، وادرك ذلك منه أقوام، وذلك أن الناس انما كانوا يأتون أرسالاً، فسمعه حين استقلت به ناقته يهل، فقالوا: انما أهل [رسول الله] حين استقلت به ناقته، ثم مضى رسول الله ﷺ فلما علا على شرف البيداء أهل، وادرك ذلك منه أقوام فقالوا: انما أهل حين علا شرف البيداء۔ [قال سعيد:] وايم الله لقد أو جب في مصلاه، وأهل حين استقلت به ناقته، وأهل حين علا شرف البيداء۔ [قال سعيد:] فمن أخذ بقول عبد الله بن عباس أهل في مصلاه اذا فرغ من ركعتين۔

ترجمہ: ”خصيف بن عبد الرحمن بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ: ابوالعباس مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کا اس بات میں اختلاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کس جگہ سے احرام باندھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں اس مسئلے کو تمام لوگوں میں سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی حج کیا ہے اور اسی وجہ سے اختلاف ہوا۔ جب رسول اللہ ﷺ حج کے لئے تشریف لے گئے تو آپ نے مسجد

ذوالحلیفہ میں دو رکعت نماز پڑھی اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد اسی مجلس میں آپ نے تلبیہ کہہ کر احرام باندھ لیا اور کچھ لوگوں نے آپ سے یہ تلبیہ سنا اور اس کو یاد رکھا، پھر آپ اونٹنی پر سوار ہوئے، جب آپ اونٹنی پر صحیح طریقے سے بیٹھ گئے تو آپ نے تلبیہ کہا اور کچھ لوگوں نے اس موقع پر آپ سے سنا، اور اس (اختلاف یا غلط فہمی) کا سبب یہ ہے کہ لوگ گروہ درگروہ آرہے تھے، اور (کچھ لوگوں نے) اس وقت آپ سے تلبیہ سنا، جب آپ اونٹنی پر بیٹھ گئے تو انہوں نے (اپنے مشاہدے کے بنا پر) یہ کہا: رسول اللہ ﷺ جب اونٹنی پر بیٹھ گئے، تو آپ نے اس وقت تلبیہ پڑھی (یعنی احرام باندھا)، پھر جب آپ شرف البیداء پر پہنچے تو آپ نے تلبیہ پڑھی، اور کچھ لوگوں نے (پہلی بار) آپ سے اسی موقع پر تلبیہ سنی، تو انہوں نے یہ کہا کہ آپ نے شرف البیداء پر احرام کی نیت کی ہے اور (سعید نے کہا:) اللہ کی قسم آپ نے احرام کی نیت اس جگہ کی تھی جہاں آپ نے (دو رکعت) نماز پڑھی تھی اور پھر آپ نے اونٹنی پر سوار ہو کر بھی تلبیہ پڑھی اور شرف البیداء پر پہنچ کر بھی تلبیہ پڑھی۔ (سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ) جو شخص حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول پر عمل کرتا ہے وہ مسجد ذوالحلیفہ میں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد احرام باندھے (اور تلبیہ پڑھے)، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: 1768) "علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وصلی ندباً) بعد ذالک (شفعاً) یعنی رکعتین فی غیر وقت مکروہ و تجزیہ المکتوبۃ۔

ترجمہ: اور لباس احرام پہننے کے بعد نماز پڑھنا مستحب ہے یعنی دو رکعت وقت غیر مکروہ میں، اور (اگر وہ فرض کا وقت ہے تو) فرض بھی اس مقصد کے لئے کافی ہے۔

علامہ شامی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

(نہیں)۔ وفی الغایۃ انہا سنة۔ ”نہر“۔ وبہ جزم فی
 ”البحر“ و ”السراج“۔ قولہ: (بعد ذلک) ای بعد اللبس والتطیب
 ۔ ”بحر“ قولہ: (یعنی رکعتیں) یشیر الی ان الاولی التعبير بہما کما فعل فی
 ”الکنز“۔ لان الشفع یشمل الاربع۔ قولہ: ”وتجریہ المکتوبہ“ کذا فی
 ”الزیلعی“ و ”الفتح“ و ”النہر“ و ”اللباب“ وغیرہما و شہوہا بتحیۃ
 المسجد۔ وفی ”شرح اللباب“ انہ قیاس مع الفارق لان صلاة الاحرام سنة
 مستقلة كصلاة الاستخارة وغیرہما لا تنوب الفریضة منابہا، بخلاف تحیۃ
 المسجد و شکر الرضوء، فانه لیس لہما صلاة علی حدة کما حققہ فی
 ”فتاوی الحجة“۔ فتادی فی ضمن غیرہا ایضاً اہ۔

ترجمہ: ”(بطور نقل پڑھے) اور ”الغایۃ“ میں ہے کہ (بوقت احرام) دو رکعت پڑھنا
 سنت ہے، اور ”البحر الرائق“ اور ”السراج“ میں اسی قول کو قطعی قرار دیا ہے، علامہ
 ہسکفی کے قول: (اس کے بعد) کا مطلب یہ ہے کہ لباس احرام پہننے اور خوشبو لگانے
 کے بعد، ”البحر الرائق“ میں ہے کہ علامہ ہسکفی کے قول (یعنی دو رکعت پڑھے) سے
 مراد یہ ہے کہ نماز احرام کو کم از کم دو رکعت سے تعبیر کرنا اولیٰ (بہتر) ہے، جیسا کہ
 ”کنز الدقائق“ میں کیا ہے، کیونکہ دو رکعت چار کو بھی شامل ہے (یعنی اگر اس وقت
 چار رکعات پڑھ لیں) تو ان کے ضمن میں دو رکعات بطریق اولیٰ آجائیں
 گی (اور چار یا زیادہ سے ممانعت مقصود نہیں ہے)، اور علامہ ہسکفی کا یہ کہنا کہ
 ”اور فرض نماز کے ضمن میں بھی یہ دو گانہ احرام ادا ہو جائیں گی، جیسا کہ الزیلعی، فتح
 القدیر، النہر، اللباب میں ہے اور انہوں نے اس (دو گانہ احرام) کو (دو گانہ) تحیۃ
 المسجد سے تشبیہ دی ہے (جو تنگی وقت یا قیام جماعت کی صورت میں فرض کے ضمن میں

بھی ادا ہو جاتی ہے)، اور ”شرح اللباب“ میں ہے کہ یہ قیاس مع الفارق ہے، کیونکہ نماز استخارہ وغیرہ کی طرح نماز احرام مستقل سنت ہے، تو فرض نماز اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتی، بخلاف تحیۃ المسجد اور تحیۃ الوضوء کہ ان کے لئے مستقل بالذات نماز مسنون نہیں ہے، جیسا کہ ”فتاویٰ الحجۃ“ میں اس کی (خوب) تحقیق کی ہے کہ یہ نمازیں (تحیۃ المسجد اور تحیۃ الوضوء) دوسری نمازوں (فرض وغیرہ) کے ضمن میں بھی ادا ہو جاتی ہیں، (رد المحتار علی درالمختار جلد 3 ص 432: دار احیاء التراث العربی بیروت)۔

سوال: 75

کیا حجر اسود کو بوسہ دینے یا چھونے کے وقت حصول برکت کی نیت کرنا بدعت ہے؟۔

جواب:

استلام حجر اسود یعنی حجر اسود کو بوسہ دیتے وقت حصول خیر و برکت اور ثواب کی نیت کرنا بدعت نہیں بلکہ عین عبادت ہے کیونکہ حج و عمرہ کے ایک اہم رکن طواف بیت اللہ کے موقع پر حجر اسود کو بوسہ دینا سنت ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: من الاستلام فهو سنة بين كل شوطين كما في ”غاية البيان“ و ذكر في ”المحيط“ و ”الوالحیة“ - أنه في الابتداء والانتهاء سنة، وفيما بين ذلك أدب - ”بحر“ - ووفق في ”شرح اللباب“ بأنه في الطرفين أكد ما بينهما۔ ترجمہ: ”استلام حجر ہر دو چکروں کے درمیان سنت ہے، جیسا کہ ”غایۃ البیان“ میں ہے اور ”المحیط“ اور ”الوالحیۃ“ میں ہے کہ طواف بیت اللہ کی ابتدا اور انتہا کے موقع پر سنت اور درمیان کے چکروں میں آداب میں سے یعنی مستحب ہے، ”البحر الرائق“ (میں بھی اسی طرح ہے)، اور ”شرح اللباب“ میں بھی اسی کے موافق کہا کہ طواف کی

ابتدا وانہما میں حجر اسود کا استلام زیادہ مؤکد ہے، (رد المحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 453 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

تو جب حجر اسود کو بوسہ دینا عبادت حج و عمرہ کے ایک اہم رکن طواف بیت اللہ کے دوران ہر چکر کے موقع پر سنت یا کم از کم مستحب ہے، عبادت تو ثواب اور خیر برکت کے لئے ہوتی ہے، عبادت شروع اور بدعت دو متضاد چیزیں ہیں، بعض لوگوں کو شاید اس حدیث مبارک سے غلط فہمی ہوئی ہے:

عن عبد اللہ بن سرجس قال: رأیت الأصلع (یعنی عمر بن الخطاب) یقبل الحصر ویقول: واللہ انی لأقبلک، وانی اعلم انک حصر، وانک لا تضر ولا تنفع۔ ولو لا انی رأیت رسول اللہ ﷺ قبلک ما قبلتک۔

ترجمہ: ”عبد اللہ بن سرجس بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حجر اسود کو بوسہ دے رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے بخدا میں تجھے بوسہ دے رہا ہوں، حالانکہ میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، تو نفع دیتا ہے نہ نقصان، اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا، تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا، (صحیح مسلم رقم الحدیث: 3016)۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حجر اسود کو مخاطب کر کے یہ کہنا کہ: میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، تو نفع دیتا ہے نہ نقصان، اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا، تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا، اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ حجر اسود یا کوئی بھی مخلوق اپنی ذات سے نفع یا ضرر رساں نہیں ہے، جس مخلوق میں جو بھی کمال ہے اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے اور یہ بات انہوں نے اس تناظر میں فرمائی کہ عہد جاہلیت میں لوگ پتھر کے بتوں کی عبادت کرتے تھے اور انہیں بالذات نفع دینے

والا اور نقصان پہنچانے والا سمجھتے تھے، مزید یہ کہ وہ عقیدہ توحید کو لوگوں کے دلوں میں راسخ کرنا چاہتے تھے اور اعمال خیر و عبادات میں اتباع رسول کو اصل مقصود سمجھنے کے تصور کو لوگوں کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے اور یہ بات عیاں ہے کہ جب حجر اسود کو بوسہ دینا، اتباع رسول ہے، تو رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں ثواب بھی ہے، خیر و برکت بھی ہے اور اتباع سنت اسی نیت سے کرنی چاہئے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ کلمات سنے تو انہوں نے فرمایا: نہیں! یہ نفع بھی دیتا ہے اور نقصان بھی دیتا ہے، حضرت عمر نے پوچھا! اس کا ثبوت کس سے ہے، حضرت علی نے کہا! قرآن مجید سے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِذَا اخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتَ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ۔

ترجمہ: ”اور جب آپ کے رب نے بنو آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے ان کی جانوں پر اقرار کرایا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، سب نے کہا، کیوں نہیں!“۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا کیا اور ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور ان سے اقرار کرایا، اللہ ان کا رب ہے اور وہ اس کے بندے ہیں، اور ان سے اس کا عہد و پیمان لیا اور اس کو ایک کاغذ میں لکھ دیا اور پتھر کی دو آنکھیں اور ایک زبان تھی، اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا: منہ کھول، اس نے منہ کھولا، اللہ تعالیٰ نے وہ کاغذ اس کے منہ میں ڈال دیا اور فرمایا: جو تجھ سے وفا کرے قیامت کے دن اس کی کواہی دینا اور میں کواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، آپ نے فرمایا: قیامت کے دن حجر اسود کو لایا جائے گا اور جو شخص اس کی تعظیم کرے گا یہ قیامت کے دن اس کی کواہی دے

گا، پس اے امیر المؤمنین یہ ضرر بھی دیتا ہے اور نفع بھی دیتا ہے، حضرت عمر نے کہا: میں اس بات سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں کہ میں اس قوم میں رہوں، جس میں اے ابوالحسن تم نہ ہو، (شرح المؤمن طا جلد 2 ص: 287 مطبوعہ مطبع خیر یہ مصر، بحوالہ شرح صحیح مسلم جلد 3 ص: 498-499 مطبوعہ فرید بک اسٹال، لاہور)۔“

سوال: 76

رمی جمرات کیلئے حجاج کرام مزدلفہ سے کنکریاں اپنے ہمراہ جن کر منیٰ لے جاتے ہیں کیا یہ مشروع ہے؟ یا حد و حرم پاک میں کہیں سے بھی چنی جاسکتی ہے؟۔

جواب:

مزدلفہ سے منیٰ جاتے ہوئے تینوں دن جمرات پر مارنے کے لئے کنکریاں یہیں سے لے لی جائیں یا کسی اور جگہ سے لی جائیں مگر نہ نجس جگہ کی ہوں اور نہ مسجد کی نہ جمرہ کے پاس کی۔ جمرہ کے پاس کی کنکریاں اٹھانا مکروہ ہے کہ وہاں وہی کنکریاں رہتی ہیں جو مقبول نہیں ہوتیں اور مردود ہو جاتی ہیں، اور جو مقبول ہو جاتی ہیں وہ اٹھالی جاتی ہیں۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(و یکرہ) أخذھا (من عند الحمرة) لأنها مردود لحديث "من قبلت حجته رفعت جمرته" (و یکرہ) أن يلتقط حجراً واحداً فيكسره سبعين حجراً صغيراً۔

ترجمہ: اور جمرے کے پاس سے کنکریاں اٹھانا مکروہ ہے، اس لئے کہ وہ مردود ہوتی ہیں حدیث شریف میں ہے کہ ”جس کا حج قبول ہو جاتا ہے اس کی کنکریاں اٹھالی جاتی ہیں“، اس کی تشریح میں علامہ شامی لکھتے ہیں:

وما هي الا كراهة تنزيهه۔ ”فتح“۔ أشار الى أنه يجوز أخذه من أي موضع سواه۔ وفي ”اللباب“: يستحب أن يرفع من مزدلفة سبع حصيات ويرمي بها جمرۃ العقبة وان رفع من المزدلفة سبعين أو من الطريق فهو جائز، وقيل مستحب اه۔

ترجمہ: ”جمہ: ”جمہ کے پاس سے کنکریاں اٹھانا مکروہ تنزیہی ہے ”فتح القدیر“ میں اسی طرح ہے۔ اور اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ اس کے سوا کسی دوسرے مقام سے اٹھانا جائز ہے۔ اور ”اللباب“ میں ہے: مستحب ہے کہ جمہ سے سات کنکریاں اٹھائی جائیں اور جمرۃ عقبہ پر رمی کی جائے، اور اگر مزدلفہ ہی سے یا کسی اور راستے سے 70 کنکریاں اٹھالی جائیں تو یہ جائز ہے اور بعض علماء نے مستحب فرمایا ہے، (رد المحتار علی الدر المختار جلد 3 ص: 473، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“۔

سوال: 77

کیا تیسری رات بھی منیٰ میں گزارنا افضل ہے یا تیسرے دن (۱۲ ذی الحجہ) کو غروب آفتاب سے قبل منیٰ سے روانہ ہونا افضل ہے؟۔

جواب:

بارہویں کی رمی کر کے غروب آفتاب سے پہلے پہلے اختیار ہے کہ مکہ روانہ ہو جائے یعنی اس کی رخصت ہے، یہ افضل نہیں ہے، مگر غروب کے بعد جانا معیوب ہے اب ایک دن اور ٹھہرے اور تیرہویں کو دوپہر ڈھلے رمی کر کے روانہ ہو یہی افضل ہے۔ تیرہویں کی صبح ہو گئی تو بغیر رمی کئے جانا جائز نہیں اگر جائے گا تو دم واجب ہوگا۔

سوال: 78

اگر کوئی محرم بھول کر یا عدم علم کے سبب حالت احرام میں سلا ہوا کپڑا چند

جواب:

جی ہاں! دونوں ایک ہیں، علامہ شامی لکھتے ہیں:

(ثم طواف للزيارة) أى لفعل طواف الزيارة الذى هو ثانى ركنى الحج۔
قال فى "السراج" ويسمى الافاضة وطواف يوم النحر وطواف المغروض۔
ترجمہ: "(پھر طواف زیارت کرنا) یعنی طواف زیارت کرنا حج کا دوسرا اہم رکن ہے
اور "السراج" میں فرمایا: اس کا نام طواف افاضہ، طواف یوم النحر اور طواف فرض بھی
ہے، (رد المحتار علی الدر المختار: جلد 3 ص: 476 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی،
بیروت)۔"

سوال: 80

دس ذی الحجہ کے اعمال (ری جمرہ عقبہ، قربانی، حلق، طواف زیارت) میں
ترتیب قائم نہ رہ سکے تو کیا کفارہ لازم آئے گا یا شریعت کی طرف سے تقدیم
وتاخیر جائز ہے؟ نیز حج بیت اللہ ناقص تو نہ ہوگا؟۔

جواب:

دس ذی الحجہ کے اعمال حج میں ترتیب لازم ہے، خلاف ترتیب کرنے سے
(یعنی تقدیم و تاخیر سے) دم لازم آتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے امید ہے کہ دم ادا
کرنے سے حج ناقص نہیں رہے گا، علامہ ابوالحسن مرغینانی حنفی لکھتے ہیں:
"افعال حج کو ایک دوسرے پر مقدم کرنے کے حکم میں اختلاف ہے، جیسے سرمنڈانے
کو کنکریاں مارنے سے پہلے یا قربانی کو کنکریاں مارنے سے پہلے یا سرمنڈانے کو قربانی
سے پہلے کیا جائے، امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک یہ جائز ہے ان کی دلیل یہ
ہے کہ جو چیز فوت ہوگئی ہے اس کی تلافی قضا سے ہو جاتی ہے اور قضا کیساتھ کوئی اور

چیز لازم نہیں ہوتی، امام ابو حنیفہ کے نزدیک ترتیب کے خلاف کرنے سے دم لازم آتا ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”من قدم نسکا علی نسلک فعليه دم“ جس شخص نے حج کے ایک فعل کو دوسرے پر مقدم کر دیا اس پر دم لازم ہے۔“

علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ:

”امام ابو یوسف اور امام محمد کی دلیل یہ ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ نبی ﷺ حجۃ الوداع میں کھڑے ہوئے تھے، ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ میں نے لاعلمی میں سر منڈالیا، آپ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں، اب ذبح کرلو، ایک اور شخص نے کہا: میں نے لاعلمی میں کنکریاں مارنے سے پہلے قربانی کر دی، آپ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں، اب کنکریاں مار لو اور اس دن جس چیز کے بھی مقدم یا موخر کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے یہی فرمایا کہ اب کر لو کوئی حرج نہیں ہے، اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ حرج نہ ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس سے گناہ نہیں ہوگا اور حج فاسد نہیں ہوگا، یہ معنی نہیں ہے کہ اس پر کوئی جزا یا فدیہ نہیں ہے، کیونکہ کہنے والے نے یہ کہا کہ میں نے لاعلمی میں یہ کام کیا ہے، جس کا مفاد یہ ہے کہ کام کرنے کے بعد اس پر منکشف ہوا کہ یہ تقدیم یا تاخیر ممنوع تھی، اسی وجہ سے اس نے سوال کرنے سے پہلے اپنا عذر بیان کیا کہ میں نے لاعلمی کی بنا پر اس کو مقدم یا موخر کیا ہے، امام ابو یوسف اور امام محمد کی طرف سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ سائل نے جب یہ دیکھا کہ اس کی ترتیب رسول اللہ ﷺ کی ترتیب کے مخالف ہے اور اس نے یہ گمان کیا کہ یہ ترتیب معین ہے تو اس نے عذر پیش کر کے یہ سوال کیا اور نبی ﷺ نے جواب میں حرج کی نفی کر کے یہ ظاہر فرمایا کہ یہ ترتیب کرنا اس پر معین نہیں ہے بلکہ یہ ترتیب مسنون ہے نہ کہ واجب،

حق یہ ہے کہ جس طرح یہ احتمال ہے اسی طرح یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ترتیب واجب ہو اور نبی ﷺ نے اس کو جہل کی وجہ سے معذور قرار دیا ہو۔ آپ نے صحابہ کو افعال حج سکھنے کا حکم دیا اور جہل کی وجہ سے ان کو معذور قرار دیا، کیونکہ یہ فرضیت حج کا ابتدائی دور تھا، اور جب اس معاملے میں یہ دونوں احتمال موجود ہیں تو احتیاطاً ترتیب کے وجوب کے قول پر عمل کرنا چاہئے اور اس سے امام ابو حنیفہ کی دلیل مضبوط ہوتی ہے اور ان کی تائید حضرت ابن مسعود کے اس قول سے ہوتی ہے: من قدم نسكاً على نسك فعليه دم۔ (جس نے حج کی ایک عبادت کو دوسری پر مقدم کر دیا اس پر دم ہے) بلکہ یہ ایک مستقل دلیل ہے، ہدایہ کے بعض نسخوں میں حضرت ابن مسعود کی جگہ حضرت ابن عباس کا ذکر ہے اور یہ زیادہ معروف ہے۔ امام ابن ابی شیبہ نے یہ روایت ذکر کی ہے، ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں: من قدم شيئاً من حجه او اخره فليهرق دماً۔ ترجمہ: ”جو شخص اپنے حج میں کسی عبادت کو مقدم یا مؤخر کر دے وہ ایک قربانی دے“۔ اس کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن مہاجر ہے جس کو ضعیف کہا گیا ہے۔ امام طحاوی نے یہ روایت ایک اور سند سے بیان کی ہے جس میں یہ ضعیف راوی نہیں ہے وہ سند یہ ہے: حدثنا ابن مرزوق حدثنا الخصيب حدثنا وهيب عن ايوب عن سعيد بن جبير عن ابن عباس مثله۔ امام طحاوی کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ان راویوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے یہ روایت بیان کی ہے کہ ”کوئی حرج نہیں اب کرو“ اور یہ حدیث ان کے نزدیک اجازت اور اباحت پر محمول نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک اس پر محمول ہے کہ انہوں نے جہل اور لاعلمی کی وجہ سے بعض عبادات کو مقدم یا مؤخر کر دیا تھا، آپ نے ان کو معذور قرار دیا اور حج کی عبادات سکھنے کا حکم دیا، علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ: امام ابو حنیفہ کے نظریہ پر اس آیت سے بھی

استدلال ہے: فمن كان منكم مريضاً أو به أذى من رأسه ففدية - ”تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں تکلیف ہو تو وہ فدیہ دے۔“ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ جو شخص بیماری کے عذر کی بناء پر اپنے وقت سے پہلے سر منڈا دے تو وہ فدیہ دے تو جب عذر کے باوجود وقت سے پہلے سر منڈانے پر فدیہ لازم آتا ہے، تو وقت سے پہلے بلا عذر سر منڈانے پر تو بطریق اولیٰ فدیہ لازم آئے گا، (فتح القدیر جلد 3 ص: 55 مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، کجرات، انڈیا)۔ الغرض امام اعظم کے نزدیک رمی، قربانی (متمتع اور قارن کے لئے) اور حلق میں ترتیب واجب ہے، حج افراد والے پر چونکہ قربانی واجب نہیں ہے لہذا اس پر صرف دو امور (رمی اور حلق) میں ترتیب واجب ہے، البتہ طواف زیارت میں ترتیب واجب نہیں ہے، یہ خلاف ترتیب (یعنی رمی، قربانی اور حلق سے پہلے) بھی کیا جاسکتا ہے۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

فيجب في يوم النحر أربعة أشياء: الرمي، ثم الذبح لغير المفرد، ثم الحلق، ثم الطواف، لكن لا شئ على من طاف قبل الرمي والحلق، نعم يكره -

ترجمہ: ”پس نحر (قربانی) کے دن (یعنی دس ذی الحجہ کو) چار امور واجب ہیں: (1) رمی (یعنی بڑے شیطان کو کنکریاں مارنا)، (2) غیر مفرد (یعنی حج قرآن اور حج تمتع کرنے والے کے لئے) ذبح یعنی قربانی کرنا، (3) اور حلق کرنا (یعنی سر منڈانا یا بال کاٹنا، (4) طواف زیارت کرنا (اسے طواف افاضہ بھی کہتے ہیں)، لیکن کسی نے رمی اور حلق سے پہلے طواف کر لیا تو اس پر کوئی چیز (یعنی دم یا صدقہ) واجب نہیں ہے، ہاں! اس طرح کرنا مکروہ ہے۔۔۔۔۔ اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

والمحاصل أن الطواف لا يحب ترتيبه على شئ من الثلاثة، وإنما يحب ترتيب الثلاثة: الرمي ثم الذبح ثم الحلق، لكن المفرد لا ذبح عليه فيجب عليه الترتيب بين الرمي والحلق فقط۔

ترجمہ: ”اس کلام کا حاصل یہ ہے کہ طواف زیارت کی ترتیب ان تینوں چیزوں میں سے کسی چیز پر بھی واجب نہیں ہے، ترتیب فقط ان تین چیزوں کے درمیان واجب ہے، یعنی پہلے

”رمی“ کرے، پھر ”قربانی“ کرے اور پھر ”حلق یا قصر“ کرے، لیکن مفرد (یعنی جس نے صرف حج کا احرام باندھا ہو) پر چونکہ قربانی نہیں ہے، لہذا اس کے لئے صرف دو چیزوں یعنی رمی اور حلق کے درمیان ترتیب واجب ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 520، 521، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

سوال: 81

بعض احباب حج و عمرہ کی نیت سے وطن سے حجاز مقدس روانہ ہوتے ہیں، مگر احرام کے بغیر میقات سے گزرتے ہیں، پہلے چند دن جدہ یا ریاض یا وہاں کے دیگر شہروں میں اپنے عزیز واقارب کے گھر قیام کر کے پھر ان کے ہمراہ احرام باندھ کر عمرہ یا حج کی ادائیگی کے لئے جاتے ہیں، کیا ان کا یہ عمل مناسک حج و عمرہ میں نقائص کا سبب تو نہیں بنتا، اس تناظر میں کیا ان پر دم واجب ہوگا؟۔

جواب:

مکہ معظمہ جانے کا ارادہ نہ ہو بلکہ میقات کے اندر (یعنی حِلّ میں، جو حد و حرم کے اختتام اور میقات کے درمیان کا علاقہ ہے) کسی اور جگہ مثلاً جدہ جانا چاہتا ہے تو اسے احرام کی ضرورت نہیں پھر وہاں سے اگر مکہ معظمہ جانا چاہے تو بغیر

احرام جاسکتا ہے لہذا جو شخص حرم میں بغیر احرام جانا چاہتا ہے وہ یہ حیلہ کر سکتا ہے بشرطیکہ واقعی اس کا ارادہ پہلے مثلاً جدہ یا کسی اور مقام حل میں جانے کا ہو، نیز مکہ معظمہ حج اور عمرہ کے ارادے سے نہ جانا ہو مثلاً تجارت کے لئے جدہ جانا ہے اور وہاں سے فارغ ہو کر مکہ معظمہ جانے کا ارادہ ہے اور اگر پہلے ہی سے مکہ معظمہ کا ارادہ ہے تو پھر بغیر احرام نہیں جانا چاہئے۔ علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(قصد دخول مكة) یعنی المحرم (ولو لحاجة) غیر الحج، أما لو قصد موضعاً من الحل كخليص و جدة حل له معاوزته بلا احرام، فإذا حل به التحق بأهله فله دخول مكة بلا احرام۔

ترجمہ: ”حج کے علاوہ اپنی کسی ضرورت کے لئے مکہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا پھر ارادہ کیا، یا اگر حدود حل میں کسی مقام پر جانے کا ارادہ کیا، جیسے خلیص یا جدہ، تو پھر اس کے لئے میقات سے احرام کے بغیر گزرنا جائز ہے، جب وہاں اتر کر اپنے گھر والوں سے مل جائے، تو اب وہ احرام کے بغیر مکہ میں داخل ہو سکتا ہے، (رد المحتار علی الدر المختار جلد 3 ص: 427 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

بہت سے آفاقی لوگ، جیسے اہل پاکستان، جن کے عزیز واقارب سعودی عرب میں جدہ یا کسی اور مقام حل میں رہتے ہیں، جب حج یا عمرہ کیلئے جانا چاہتے ہیں، تو سہولت پسندی کی وجہ سے یہاں سے احرام باندھ کر نہیں جاتے ہیں، بلکہ پہلے جدہ یا کسی دوسرے مقام پر جاتے ہیں اور پھر وہاں سے اپنے عزیز واقارب کے ساتھ احرام باندھ کر جا کر عمرہ کر لیتے ہیں۔ ایسا کرنا ان کے لئے جائز ہے، افضل ہرگز نہیں ہے اور یقیناً اجر و ثواب میں کمی کا بھی باعث ہوگا۔ کیونکہ اگر وہ یہاں سے عمرے کی نیت سے سفر کر رہے ہیں تو بغیر احرام کے ان کا میقات سے گزرنا درست نہیں ہے۔

اور اگر وہ یہاں سے دوستوں عزیزوں کی ملاقات کی نیت سے جدہ یا کسی اور مقامِ حِلّ کا سفر کرتے ہیں تو یہاں سے ان کا یہ سفر عبادت میں شمار نہیں ہوگا، تاہم اس سے ان پر دم واجب نہیں ہوگا، البتہ یہ اجر میں کمی کا باعث ہوگا۔ اس لئے ہمارے نزدیک افضل یہ ہے کہ وہ یہاں سے احرام باندھ کر روانہ ہوں تو ان کا یہ پورا سفر اور کل مصارف سفر عبادت میں شمار ہوں گے، اور خدا نخواستہ کسی حادثہ ناگہانی کا شکار ہو گئے تو روزِ حشر حالتِ احرام میں اٹھیں گے، جیسا کہ حدیثِ پاک میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: بينما رجل واقف مع رسول اللہ ﷺ بعرفة، اذ وقع عن راحلته فرفقصته، أو قال فأقعصته، فقال رسول اللہ ﷺ: "اغسلوه بماءٍ وسدر، وكفنوه في ثوبين، ولا تحنطوه، ولا تحمروا رأسه، فإن الله يبعثه يوم القيامة ملبيا"۔

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ایک آدمی عرفات میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ کھڑا تھا کہ سواری سے گر پڑا جس نے اس کی گردن کچل دی یا وہ کچلا گیا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اسے پانی اور پیری کے پتوں سے غسل دو اور دو کپڑوں کا کفن دو، اسے خوشبو نہ لگانا اور نہ اس کا سر چھپانا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اسے اس حال میں اٹھائے گا کہ تلبیہ کہہ رہا ہوگا، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 1449)۔"

مزید یہ کہ اگر یہاں سے احرام باندھ کر عمرے یا حج کی نیت سے روانہ ہوئے ہیں اور درمیان میں ایک یا دو دن انہیں جدہ میں ٹھہرنا پڑے تو یہ سارا وقت بھی عبادت میں شمار ہوگا، احرام میں کوئی وزن تو نہیں اٹھانا، بس صرف احرام کی پابندیوں کا خیال رکھنا

سوال: 82

بعض حج گروپ اپنے گروپ کے افراد کو ۷، ذی الحجہ کو منیٰ اور ۸، ذی الحجہ کی شب کو عرفات میں قیام کراتے ہیں، بعض احباب کے استفسار پر یہ جواز پیش کرتے ہیں، اس عجلت سے ہم ٹریفک کے اژدھام اور سفر کے دیگر مصائب و مشکلات سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور ہر دو مقام پر جگہ بھی مناسب مل جاتی ہے، کیا از روئے شرع ان کا یہ عمل حج کے اعمال میں نقائص کا سبب تو نہ بنے گا؟۔

جواب:

۷، ذی الحجہ کو بعد نماز ظہر امام خطبہ پڑھتا ہے اس خطبے کو سننے، یوم الترویہ (۸، ذی الحجہ) کو آفتاب نکل آئے تو منیٰ کو روانہ ہو آفتاب نکلنے سے پہلے گیا تو بھی جائز مگر بعد میں جانا بہتر ہے زوال کے وقت بھی جاسکتا ہے مگر ظہر کی نماز منیٰ میں پڑھے، رات منیٰ میں ٹھہرے فجر پڑھ کر عرفات روانہ ہو۔

(و خطب الامام اولیٰ خطب الحج الثلاث سابع ذی الحجة بعد الزوال (و بعد (صلاة الظهر) و کرہ قبلہ (و علم فیہا العناسک فاذا صلی بمكة الفجر) یوم الترویہ (ثامن الشهر الی منی و مکث بها الی فجر عرفة ثم) بعد طلوع الشمس (راح الی عرفات) علی طریق ضب (و عرفات) کلها موقف الا بطن عرنة (فبعد الزوال قبل) صلاة (الظهر خطب الامام)۔

ترجمہ: (اور امام خطبہ پڑھے گا ۷، ذی الحجہ کو بعد زوال اور بعد نماز ظہر) اس سے پہلے مکروہ ہے (اور مناسک حج سیکھے پھر نماز فجر مکہ میں پڑھے، ۸ ذی الحجہ کو منیٰ روانہ ہو اور فجر تک عرفہ میں ٹھہرے پھر بعد طلوع آفتاب عرفات کو چلے پورا عرفات موقف ہے سوائے بطن عرنة کے پھر بعد زوال نماز ظہر سے پہلے امام خطبہ پڑھے گا، (رد المحتار علی

الدر المختار جلد 3 ص: 458 459 , مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت) ، علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:

”آج کل بعض مطوفوں نے یہ نکالی ہے کہ آٹھویں کو منیٰ میں نہیں ٹھہرتے سیدھے عرفات پہنچتے ہیں ان کی نہ مانے اور اس سنت عظیمہ کو ہرگز نہ چھوڑے، (بہار شریعت جلد اول، ص: 478 مکتبہ رضویہ آرام باغ، کراچی)۔“ ایک تو یہ ہے کہ کابلی، ہل پسندی اور سنت کو اہمیت نہ دیتے ہوئے قیام منیٰ کو ترک کر دیا جائے، یہ سوچ اور طرزِ عمل بلاشبہ اجر و ثواب میں کمی کا باعث بنے گا اور عبادت حج کے کامل و اکمل ہونے میں مانع اور حارج ہوگا، اگرچہ ادائے فرض ہو جائے گا، لیکن عبادت کا اجر کامل اور مرتبہ کمال کسی عبادت کے اندر فرض و واجب کے ساتھ سنن و مستحبات اور آداب کی کامل رعایت اور محرمات اور ممنوعات اور مکروہات سے اجتناب سے نصیب ہوتا ہے، تاہم اگر بندہ اپنی طرف سے پوری جدوجہد کرے مگر ٹریفک میں پھنس جانے یا منیٰ میں جگہ نہ ملنے کے باعث قیام منیٰ نہ کر سکا ہو تو اللہ تعالیٰ نیتوں کا حال جاننے والا ہے، لیکن چونکہ یہ سب ترک سنت اللہ کی طرف سے نہیں ہے بلکہ بندوں کی اپنی طرف سے ہے اسی لئے احتیاط پسند اور تقویٰ شعار علماء یہ کہتے ہیں کہ بندے کو حج کے اختتام پر حسبِ توفیق دم یا صدقہ دے دینا چاہئے تاکہ دانستہ یا نادانستہ یا مجبوری و مشکلات کے باعث عبادت میں کچھ کمی رہ گئی ہو تو اس کی تلافی ہو جائے۔“

سوال: 83

ایک کلمہ کو حضور ﷺ کی ذات مقدسہ کے بارے میں شفیع المذنبین کا عقیدہ رکھتے ہوئے، حضور ﷺ کی بارگاہ میں درخواست شفاعت پیش کرنا ہے، زید یہ کہتا ہے کہ اگر درخواست شفاعت پیش کی اور اس پر بھروسہ کیا تو باجماع امت کافر ہو گیا، نیز

حضور ﷺ سے کس طرح کا سوال کرنا شرک ہے؟

جواب:

چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے مازونین کی شفاعت کا قرآن مجید میں خود ذکر فرمایا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام و رسل عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام، اولیاء کرام، مقربین و مکرمین و محبوبین رضی اللہ عنہم اجمعین حتیٰ کہ از روئے حدیث حافظ و عامل قرآن اور نا تمام پیدا شدہ بچے کی شفاعت بھی از روئے حدیث ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

من ذالذی یشفع عنده الا باذنه۔

ترجمہ: ”کس کی مجال ہے کہ اس کی بارگاہ میں شفاعت کرے، مگر جسے وہ خود اذن شفاعت دے دے، (البقرہ: 255)۔“

ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ مازون الشفاعت ہیں اور احادیث مشہورہ سے آپ کی شفاعت کبریٰ ثابت ہے، اسی طرح سے بچے کی نماز جنازہ میں اسی ترتیب کے بعد جو بھی دعا پڑھی جاتی ہے، اس میں ہم سب پڑھتے ہیں:

اللهم اجعلہ لنا شافعاً و مشفعاً۔

ترجمہ: ”اے اللہ اس بچے کو ہمارے لئے شفاعت کرنے والا اور مقبول شفاعت بنا دے۔“

عن جابر؛ قال: سمعت رسول اللہ ﷺ يقول: ”ان شفاعتی يوم القيامة لاهل الكبائر من امتی۔“

ترجمہ: ”حضرت جابر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری شفاعت قیامت

کے دن میری امت کے گناہ کبیرہ والوں کے لئے ہے، (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 4310)۔“

اسی طرح حدیث پاک میں ناتمام بچوں کے بارے میں آیا ہے کہ جب ان کے ماں باپ کو جہنمی قرار دیا جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے عطا کردہ اذن سے بطور خاص احتجاج کرے گا، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: آیہا السقط المراغم ربہ! أدخل أبویک الجنة۔

ترجمہ: ”اے اپنے رب سے جھگڑنے والے ناتمام بچے، جا اپنے ماں باپ کو جنت میں لے جا، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 1608 مطبوعہ دار الفکر بیروت)۔“

حافظ قرآن کے بارے میں حدیث ہے:

عن علی قال: قال رسول اللہ ﷺ: من قرأ القرآن واستظهره فاحلّ حلاله وحرم حرامہ أدخلہ اللہ بہ الجنة وشفّعه فی عشرة من اهل بیتہ کلہم قد وجبت له النار۔

ترجمہ: حضرت علی سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: جس نے قرآن پڑھا اس کو یاد (حفظ) کیا، پس حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانا، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا اور اس کی شفاعت سے اس کے گھر والوں میں سے ایسے دس افراد جن پر جہنم لازم ہوگئی ہو جنت میں داخل فرمائے گا، (سنن ترمذی رقم الحدیث: 2905)۔“

عن عثمان ابن عفان قال: قال رسول اللہ ﷺ: ”یشفع یوم القيامة ثلاثة: الانبياء ثم العلماء ثم الشهداء۔“

ترجمہ: ”حضرت عثمان ابن عفان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا: قیامت کے دن تین جماعتیں شفاعت کریں گی، انبیاء پھر علماء پھر شہید لوگ، (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 4313)۔

سوال: 84

زید یہ کہتا ہے کہ زیارت روضۃ النبی ﷺ مشروع نہیں، جن احادیث سے دلائل پیش کئے جاتے ہیں، وہ ضعیف یا موضوع ہیں و نیز زائرین کے لئے مسجد نبوی ﷺ کی زیارت مستنون ہے، خواہ قبل از حج ہو یا بعد از حج؟۔

جواب:

زیارت روضۃ النبی ﷺ کے ثبوت میں جو روایات بیان کی جاتی ہیں وہ پیش خدمت ہیں:

عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ من حج فزار قبري بعد وفاتي كان كما زارني في حياتي -

ترجمہ: ”حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے حج کیا اور میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی گویا کہ اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی ہے، (سنن دارقطنی جلد 2 ص: 378 مطبوعہ دار نشر السنۃ لمٹان)۔“

اس حدیث کو امام بیہقی نے (السنن الکبریٰ جلد 2 ص: 246 مطبوعہ دار نشر السنۃ لمٹان)، حافظ ایشمی نے (مجمع الزوائد جلد 4 ص: 2 دارالکتب العربیہ بیروت)، علامہ علی متقی ہندی نے (کنز العمال جلد 5 ص: 135 مؤسسۃ الرسالۃ بیروت)، اور حافظ ویلی (فردوس الاخبار جلد 4 ص: 72 دارالکتب العربیہ بیروت) نے بھی ذکر کیا

ہے۔

عن حاطب قال: قال رسول الله ﷺ: من زارني بعد موتي، فكانما زارني في حياتي و من مات باحد الحرمين بعث من الامين يوم القيامة۔

ترجمہ: ”حاطب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے میرے وصال کے بعد میری زیارت کی اس نے گویا کہ میری زندگی میں میری زیارت کی اور جو شخص حرمین میں سے کسی جگہ فوت ہوا، وہ قیامت کے دن امن والوں میں سے اٹھے گا، (سنن دارقطنی جلد 2 ص: 378 مطبوعہ دار نشر السنۃ ملتان)۔“

اس حدیث کو علامہ علی متقی ہندی نے (کنز العمال جلد 5 ص: 136 مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ بیروت) بھی ذکر کیا ہے:

عن ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ من زار قبري و جبت له شفاعتي۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لئے میری شفاعت واجب ہوگئی، (سنن دارقطنی جلد 2 ص: 378 مطبوعہ دار نشر السنۃ ملتان)۔“

حافظ البیہقی نے (كشف الاستار عن زوائد البراج 2 ص: 57، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت) اس کو امام بزار کے حوالے سے ذکر کیا ہے:

عن ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ عليه وسلم من حج البيت ولم يزرني فقد جفائي۔

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے بیت اللہ کا حج کیا اور میری زیارت کے لئے نہیں آیا، اس نے مجھ سے بے وفائی کی، (فردوس الاخبار ج: 4 ص: 1 7 مطبوعہ دار الکتاب العربی، بیروت)۔“

اس حدیث کو علامہ علی متقی ہندی نے (کنز العمال جلد 5 ص: 136 مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ بیروت) بھی ذکر کیا ہے۔

نوٹ: مندرجہ بالا حوالہ جات شرح صحیح مسلم مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی جلد 3 صفحات 766 سے نقل کئے گئے ہیں، وہاں پر یہ بحث مفصل ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

ان روایات کے ضعف کا قول تو کیا گیا ہے، لیکن شیخ ابن تیمیہ اور ان کے متبعین کے سوا کسی نے انہیں موضوع قرار نہیں دیا، حج و عمرے کے موقع پر زیارت روضہ رسول اکرم ﷺ کو کسی نے واجب نہیں قرار دیا، بلکہ یہ احادیث رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں مسنون و مستحب امر ہے، اور چونکہ بعض روایات میں ترک زیارت پر وعید بھی آئی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنے ساتھ جفا قرار دیا ہے تو اس کا سنت ہونا زیادہ مؤکد قریب بہ واجب ہو جاتا ہے۔

کسی حدیث کو اگر ماہرین اسماء الرجال نے ضعیف قرار دیا ہو تو یہ ایک علمی اور فنی بحث ہے، اسے حدیث پر ترک عمل کا سہارا نہیں بنانا چاہئے، اور ویسے بھی علماء کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ ”فضائل اعمال میں ضعیف احادیث معتبر ہوتی ہیں“، اور کسی ایک موضوع پر متعدد ضعیف احادیث ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بنتی ہیں، اس کی ایک عملی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ ایک شخص آپ کو آکر ایک خبر سناتا ہے، آپ اسے زیادہ ثقہ اور معتمد نہیں سمجھتے، لیکن پھر مختلف جہات سے اس جیسے کئی افراد اپنے مشاہدے کی بناء پر وہی خبر سناتے ہیں تو آپ یقین کر لیں گے کہ یہ واقعہ ضرور ہوا ہوگا۔ اور ویسے بھی یہ بڑی جفا، شقاوت اور احسان فراموشی کی بات ہوگی کہ جس ذات والا صفات، خاتم النبیین رحمۃ اللہ علیہ کے وسیلے سے بیت اللہ کا عرفان ملا، عبادات حج و عمرہ نصیب

ہوئیں، دولتِ ایمان ملی، نعمتِ قرآن ملی، ان کے قریب جا کر، سلام عرض کئے اور زیارت و حاضری کا شرف حاصل کئے بغیر بندہ واپس آجائے۔

ہم لوگ تو ویسے ہی گنہگار ہیں، عصیاں شعار ہیں، اپنی بد اعمالیوں کے سبب خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہتے ہیں اور عبادتِ حج کا ایک مقصدِ جلیلِ تعمیلِ حکمِ باری تعالیٰ کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ہمارے گناہوں کی عفو و مغفرت کی کوئی صورت نکل آئے اور اس کی صورت اللہ جل شانہ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمائی ہے:

وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا ۝

ترجمہ: اور جب یہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے، تو یہ آپ کے پاس آجاتے، پھر اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول بھی ان کے لئے استغفار کرتے، تو یہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا، بے حد رحم فرمانے والا پاتے، (سورۃ النساء: 64)۔

بیشتر مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ اس آیہ مبارکہ کی رو سے جس طرح رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طاہری میں گنہگارِ امت کے لئے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعاءِ مغفرت کرنا اور رسول اللہ ﷺ کا ان کے لئے استغفار کرنا وسیلہٴ مغفرت تھا، اسی طرح آپ کے وصال فرمانے کے بعد آپ کے روضہٴ اقدس پر حاضری بھی وسیلہٴ مغفرت ہے، چنانچہ حافظِ عموالدین اسماعیل بن عمر بن کثیر متوفی 774ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عاصیوں اور گنہگاروں کو یہ ہدایت دی ہے کہ جب ان سے خطا اور گناہ ہو جائے تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور آپ کے پاس آ کر استغفار کریں، پھر رسول اللہ ﷺ سے یہ درخواست کریں کہ آپ بھی ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی درخواست کریں اور جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ

ان کی توبہ قبول فرمائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا اور بہت مہربان پائیں گے۔ مفسرین کی ایک جماعت نے ذکر کیا ہے ان میں الشیخ ابو منصور الصباغ بھی ہیں، انہوں نے اپنی کتاب الشامل میں عبتی کی یہ مشہور حکایت لکھی ہے کہ میں (رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد) نبی ﷺ کی قبر پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اعرابی نے آکر کہا السلام علیک یا رسول اللہ، میں نے اللہ عزوجل کا یہ ارشاد سنا ہے: وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَلَمُواْ اَنْفُسَهُمْ جَاؤْكَ الْاٰیَہ اور میں آپ کے پاس آگیا ہوں اور اپنے گناہ پر اللہ سے استغفار کرتا ہوں اور اپنے رب کی بارگاہ میں آپ سے شفاعت طلب کرنے والا ہوں، پھر اس نے عربی کے دو شعر پڑھے، جن کا ترجمہ یہ ہے:

اے وہ جو زمین کے مدفونین میں سب سے بہتر ہیں
جن کی خوشبو سے زمین اور ٹیلے خوشبو دار ہو گئے

میری جان اس قبر پر فدا ہو جس میں آپ ساکن ہیں اس میں عفو ہے اس میں سخاوت ہے اور لطف و کرم ہے

پھر وہ اعرابی چلا گیا، عبتی بیان کرتے ہیں کہ مجھ پر نیند غالب آگئی، میں نے خواب میں نبی ﷺ کی زیارت کی اور آپ نے فرمایا اے عبتی! اس اعرابی کے پاس جا کر اس کو خوشخبری دو کہ اللہ نے اس کی مغفرت کر دی ہے، (تفسیر ابن کثیر ج 2 ص: 329-328، الجامع لاحکام القرآن ج 5 ص: 265، البحر المحیط ج 3 ص: 694، مدارک التنزیل علی ہامش الحازن ج 1 ص: 399)۔

مفتی محمد شفیع متوفی 1396ھ لکھتے ہیں:

یہ آیت اگرچہ خاص واقعہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن اس کے الفاظ

سے ایک عام ضابطہ نکل آیا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور آپ اس کے لیے دعاء مغفرت کر دیں اس کی مغفرت ضرور ہو جائے گی اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضری جیسے آپ کی دنیاوی حیات کے زمانہ میں ہو سکتی تھی، اسی طرح آج بھی روضہ قدس پر حاضری اسی حکم میں ہے، اس کے بعد مفتی صاحب نے بھی عبتی کی مذکور الصدر حکایت بیان کی ہے، (معارف القرآن ج 2 ص: 460-459، مطبوعہ دارۃ المعارف، کراچی)۔

معروف دیوبندی عالم شیخ محمد سرفراز گلکھڑوی لکھتے ہیں:

عبتی کی حکایت اس میں مشہور ہے اور تمام مذاہب کے مصنفین نے مناسک کی کتابوں میں اور مورخین نے اس کا ذکر کیا ہے اور سب نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے، اسی طرح دیگر متعدد علماء کرام نے قدیم و حدیث اس کو نقل کیا ہے اور حضرت تھانوی لکھتے ہیں کہ مواہب میں بہ سند امام ابو منصور صباغ اور ابن النجار اور ابن عساکر اور ابن الجوزی رحمہم اللہ تعالیٰ نے محمد بن حرب ہلالی سے روایت کیا ہے کہ میں قبر مبارک کی زیارت کر کے سامنے بیٹھا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور زیارت کر کے عرض کیا کہ یا خیر الرسل، اللہ تعالیٰ نے آپ پر ایک نچی کتاب نازل فرمائی جس میں ارشاد ہے: وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا ۝ اور میں آپ کے پاس اپنے گناہوں سے استغفار کرتا ہوا اور اپنے رب کے حضور میں آپ کے وسیلہ سے شفاعت چاہتا ہوا آیا ہوں پھر دو شعر پڑھے۔ اور اس محمد بن حرب کی وفات 228ھ میں ہوئی ہے، غرض زمانہ خیر القرون کا تھا اور کسی سے اس وقت تکیر منقول نہیں، پس حجت ہو گیا (نشر الطیب ص 254) اور حضرت مولانا نانوتوی یہ آیت کریمہ لکھ کر فرماتے ہیں: ”کیونکہ اس میں کسی کی تخصیص نہیں، آپ

کے ہم عصر ہوں یا بعد کے امتی ہوں، اور تخصیص ہو تو کیونکر ہو آپ کا وجود تربیت تمام امت کے لئے یکساں رحمت ہے کہ پچھلے امتیوں کا آپ کی خدمت میں آنا اور استغفار کرنا اور کرانا جب ہی متصور ہے کہ قبر میں زندہ ہوں (آب حیات ص: 40) اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی یہ سابق واقعہ ذکر کر کے آخر میں لکھتے ہیں: پس ثابت ہوا کہ اس آیت کریمہ کا حکم آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بھی باقی ہے، (اعلاء السنن ج 10 ص: 330)۔

ان اکابر کے بیان سے معلوم ہوا کہ قبر پر حاضر ہو کر شفاعت و مغفرت کی درخواست کرنا قرآن کریم کی آیت کے عموم سے ثابت ہے، بلکہ امام سبکی فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اس معنی میں صریح ہے (شفاء السقام ص: 128) اور خیر القرون میں یہ کاروائی ہوئی مگر کسی نے انکار نہیں کیا جو اس کے صحیح ہونے کی واضح دلیل ہے، (تسکین الصدور ص: 365-366، ملخصاً، مطبوعہ دارہ نصرت العلوم کو جرانوالہ)۔

نوٹ: یہ تمام حوالہ جات تفسیر تبیان القرآن مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی جلد 2 صفحات 714 تا 716 سے نقل کئے گئے ہیں، وہاں پر یہ بحث مفصل ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ باری تعالیٰ سے طلب مغفرت کے لئے اور رسول اللہ ﷺ سے طلب شفاعت کے لئے روضہ رسول اور ختم المرسلین کی بارگاہ اقدس میں حاضری از سلف تا خلف متفق علیہ امر ہے اور رسول اللہ ﷺ اپنی حیات ظاہری کی طرح اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد بھی ہمارے حوال و اعمال کا مشاہدہ فرماتے ہیں، اذن باری تعالیٰ سے ہماری نصرت اور دستگیری فرماتے ہیں اور بارگاہ رب العالی میں ہمارے لئے عفو و مغفرت اور شفاعت کا وسیلہ کاملہ قطعہ ہیں۔

عمرے کی ادائیگی کے لئے محرم

سوال: 85

کوئی شخص اپنی ساس یا ساس کی والدہ (نانی ساس) کے ساتھ حج یا عمرے کی ادائیگی کے لئے جاسکتا ہے؟، (حافظ سلیم محمود، R-772 سیکٹر D/3-7 ناتھ کراچی)۔

جواب:

خواتین کیلئے حج و عمرے کی وہی شرائط ہیں، جو مردوں کیلئے، ہاں! ایک شرط زائد ہے کہ اسے سفر حج کے دوران اپنے شوہر یا کسی محرم کی رفاقت میسر ہو۔ محرم سے مراد نسب، رضاعت (دودھ شریک کا رشتہ) یا مصاہرت کے رشتے سے ایسے قریبی رشتہ دار ہیں، جن کے ساتھ اس عورت کا نکاح ہمیشہ کیلئے حرام ہو، جیسے باپ، چچا، ماموں، بیٹا، بھتیجا، بھانجا، داماد، خسر اور دودھ کے رشتے سے بھائی، باپ وغیرہ۔
امام علاؤ الدین ابی بکر بن مسعود لکھتے ہیں:

واما الذی یخص النساء فشرطان: احدهما: ان یکون معها زوجها او محرم لها فان لم یوجد احدهما لا یحب علیها الحج۔

ترجمہ: اور عورتوں کے لئے دو شرطیں خاص ہیں، ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اس کا شوہر یا اس کا محرم اسکے ساتھ ہو، پس اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو نہ پائے تو اس پر حج واجب نہیں، دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ثم صفة المحرم أن یکون ممن لا یجوز له نکاحها علی التأیید اما بالقربة أو الرضاع أو الصهرية لأن المحرمة الممعة بمنة تزیل التهمة فی المخلوة، ولہذا قالوا: ان المحرم اذا لم یکن مأموناً علیہ لم یجز أن تسافر

ترجمہ: ”محرم وہ شخص ہے جس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکاح حرام ہو، خواہ حرمت نکاح رشتہ قرابت کی وجہ سے ہو یا رشتہ رضاعت کی وجہ سے ہو یا رشتہ سسرالی کی وجہ سے (مثلاً داماد)، کیونکہ دائمی حرمت سے خلوت میں تہمت کا اندیشہ زائل ہو جاتا ہے، اسی لئے فقہاء کرام نے کہا ہے کہ اگر محرم بھی قابل اعتماد نہ ہو (یعنی اس سے آبرو محفوظ نہ ہو) تو اس کے ساتھ بھی عورت کا سفر پر جانا جائز نہیں ہے، (بدائع الصنائع، جز ثانی، صفحہ 87، 188 مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، کجرات ہند)۔“

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

(القسم الثانی المحرمات بالصہریۃ) وہی اربع فرق (الاولی) امہات الزوجات و جداتہن من قبل الاب والام وان علون۔

ترجمہ: ”(دوسری قسم سسرالی رشتے سے محرمات کے بیان میں) اور وہ چار قسموں پر ہیں (ان میں سے ایک) بیوی یا بیویوں کی مائیں اور دادیاں، نانیاں، (خواہ وہ باپ کی طرف سے ہوں یا ماں کی طرف سے) اگرچہ اوپر تک ہوں، (فتاویٰ عالمگیری جلد اول ص 274 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔“

لہذا داماد ساس یا ساس کی والدہ (نانی ساس) کے ہمراہ حج یا عمرے کے سفر پر جاسکتا ہے، کیونکہ وہ سسرالی رشتے کی بناء پر اس کا محرم ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

حج سے تمام گناہوں کا معاف ہو جانا

سوال : 86

آپ سے ایک مسئلہ یہ میں نے سنا ہے کہ حج سے پہلے کے تمام گناہ بندے کے حج کرنے کے بعد معاف ہو جاتے ہیں، میں نے 2002ء میں حج کیا جب سے

لے کر آج تک اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں پوری پابندی کرتی ہوں نماز قضاء وغیرہ بھی ادا کر لیتی ہوں، (عذرا جہاں، کورنگی)۔

جواب :

آپ نے جو لکھا ہے کہ ”جج سے پہلے کے تمام گناہ بندے کے جج کرنے کے بعد معاف ہو جاتے ہیں“، ادائیگی جج کے لئے جانے سے قبل کبیرہ گناہوں کی توبہ کی جائے، فرائض کی ادائیگی مثلاً قضا نمازوں کی ادائیگی یا ادائیگی کا عزم، زکوٰۃ کی ادائیگی، حق العبد یعنی اگر کسی کا حق اس کے ذمے ہے تو اس حق کی ادائیگی یا اس سے اس حق کو معاف کرائے۔ حدیث مبارک میں ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے جج کیا اور فحش کلام نہ کیا اور فسق نہ کیا تو گناہوں سے ایسا پاک ہو کر لوٹا جیسے اس دن پا ک تھا جس دن اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، (صحیح بخاری و مسلم)۔ ایک اور حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: عمرہ سے عمرہ تک ان گناہوں کا کفارہ ہے جو درمیان میں ہوئے اور جج مبرور کا ٹو اب جنت ہی ہے، (صحیح بخاری و مسلم)۔

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ بندے سے جو صغیرہ گناہ نا دانستہ طور پر سرزد ہو جاتے ہیں اعمال صالحہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرما دیتا ہے، چنانچہ حدیث پاک میں ہے: حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: پانچ نمازیں (ایک نماز سے دوسری نماز تک) اور جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک کفارہ ہے ان گناہوں کے لئے جو اس درمیان ہوئے جب کہ وہ گناہ کبیرہ سے اجتناب کرتا ہو، (صحیح مسلم)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: بتاؤ تو کسی

دروازے پر نہر ہو وہ اس میں ہر روز پانچ بار غسل کرے، کیا اس کے بعد بدن پر میل رہ جائے گا عرض کی نہیں اس کے بدن پر کوئی میل باقی نہیں رہے گا فرمایا: یہی مثال پانچوں نمازوں کی ہے اللہ تعالیٰ ان کے سبب خطاؤں کو مٹا (مٹا) فرمادیتا ہے، (صحیح بخاری و مسلم)۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: ایک صاحب آئے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھ پر حد قائم فرمائیے آپ نے اس سے کوئی سوال نہ فرمایا اور نماز کا وقت آگیا پھر اس شخص نے نبی ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی، رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو وہ شخص پھر کھڑا ہو گیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ میں نے ایسا فعل کیا ہے کہ جس کے باعث مجھ پر حد واجب ہو گئی ہے تو مجھ پر حد قائم فرمائیے جو کتاب اللہ میں ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز ادا نہیں کی اس عرض کی جی ہاں! آپ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے تیرے گناہ کو جو تیرے نزدیک موجب حد تھا معاف فرمادیا، (بخاری و مسلم)۔

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ ایک صاحب سے ایک گناہ صادر ہوا حاضری ہو کر عرض کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، ترجمہ: ”نماز قائم کرو دن کے دونوں کناہوں اور رات کے کچھ حصے میں بیشک نیکیاں گناہوں کو دور کرتی ہیں، یہ نصیحت ہے نصیحت ماننے والوں کے لئے، (سورۃ ہود: 114)۔“

انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہ خاص میرے لئے ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری تمام امت کے لئے، ایک روایت میں یہ بھی آیا آپ نے فرمایا: کہ میری امت سے جو بھی نیک عمل کرے، (صحیح بخاری و مسلم)۔

ان احادیث مبارکہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عبادات کی برکت سے صغیرہ اور غیر

ارادی گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے کسی عذر شرعی کی بناء پر فرض ترک ہو گیا ہے تو وہ معذور ہے عذر اٹھ جانے کے بعد اسے ادا کرے۔ اگر بلا عذر شرعی محض کوتاہی یا سرکشی کی بناء پر مثلاً فرض نماز وقت پر نہیں پڑھی، یا رمضان میں روزہ بلا عذر شرعی ترک کر دیا تو یہ عمل بجائے خود فسق اور کبیرہ گناہ ہے، ان قضاء شدہ نمازوں اور روزوں کی قضاء کرے اور بلا عذر قضاء کا جو گناہ کیا ہے، اس کی اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگے اور توبہ کرے، واللہ اعلم بالصواب۔

نَفْسِ اسْلَام

WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿کتاب النکاح﴾

حرمت رضاعت

سوال: 87

کیا فرماتے ہیں مفتیان دین علماء کرام قرآن و سنت کی روشنی میں ازراہ کرم جواب سے جلد از جلد مرحمت فرمائیں، کہ میرے ایک دوست کے بھائی محمد صالح شاہ اور اس کی کزن چچا کی بیٹی فاطمہ بنت رحیم شاہ کی شادی ان کے والدین طے کرنا چاہتے ہیں، مگر دونوں کے والدین یہ جانتے ہیں کہ محمد صالح شاہ نے اپنی چچی فاطمہ کی والدہ کا شیرخوارگی کی عمر میں دودھ پیا تھا۔ جہاں تک میری معلومات ہے کہ ان دونوں کا نکاح نہیں ہو سکتا جو کہ میں نے اپنے دوست کو بتایا تھا مگر اس نے کہا کہ کوئی شرعی فتویٰ ثبوت کے طور پر ہو، جو وہ والدین اور اپنے چچا کو دکھائے تا کہ کسی بھی غلطی اور گناہ سے بچا جاسکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کیا محمد صالح شاہ کے کسی بھی بھائی سے نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں؟، (محمد عباس ہاشمی اختر القادری رضوی، ڈاکٹار ٹنڈو مٹھا خان تحصیل و ضلع ساٹلھڑ)۔

جواب:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَأَحْزَنَ لَكُمْ الرِّضَاعَةُ**۔
ترجمہ: ”اور تمہاری مائیں، جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری رضاعی بہنیں (تم پر حرام کی گئیں)، (النساء، آیت 23)۔“

۱۔ عن عائشة قالت: قال لي رسول الله ﷺ: ”يحرم من الرضاعة ما يحرم

من الولادة۔

ترجمہ: ”حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3505، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکتبہ المکرمۃ)۔“

۲۔ عن ابن عباس قال: قيل للنبي ﷺ: الا تتزوج ابنة حمزة؟، قال: ”انها ابنة اخي من الرضاعة۔“

ترجمہ: ”ابن عباس فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے عرض کی گئی کہ آپ حضرت حمزہ کی صاحبزادی سے نکاح کیوں نہیں کر لیتے؟، ارشاد فرمایا: ”وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے“، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5100، مکتبہ العصریہ، بیروت)۔“

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ فتاویٰ عالمگیری میں لکھتے ہیں:

”يحرم على الرضيع ابواه من الرضاع واصور لهما وفروعهما من النسب والرضاع جميعاً حتى ان المرضعة لو ولدت من هذا الرجل او غيره قبل هذا الارضاع او بعده او ارضعت رضيعاً او ولد لهذا الرجل من غير هذه المرأة قبل هذا الارضاع او بعده او ارضعت امرأة من لبنه رضيعاً فالكل اخوة الرضيع واخواته واولادهم اولاد اخوته واخواته واخوال الرجل عمه واخوته وعمته واخوال المرضعة خاله واخواته خالاته وكذا في الجد والجدة

ترجمہ: ”دودھ پینے والے پر اس کے رضاعی ماں باپ اور ان کے تمام اصول اور فروع حرام ہو جاتے ہیں، خواہ وہ نسباً اصول و فروع ہوں یا رضاعاً حتیٰ کہ اگر دودھ پلانے والی کے ہاں اس کے موجودہ شوہر سے یا کسی اور شوہر سے کوئی اولاد ہو، خواہ دودھ پلانے سے پہلے ہوں یا دودھ پلانے کے بعد ہو یا وہ کسی اور بچے کو دودھ پلائے

یا دودھ پلانے والی کے شوہر کی کسی اور بیوی سے اولاد ہو، خواہ اس کو دودھ پلانے سے پہلے یا بعد تو یہ سب دودھ پینے والے کے بھائی اور بہن اور ان کی اولاد اس کے بھائیوں اور بہنوں کی اولاد ہیں، دودھ پلانے والی کے شوہر کا بھائی اس کا چچا ہے اور اس کی بہن اس کی پھوپھی ہے اور دودھ پلانے والی کا بھائی اس کا ماموں ہے اور بہن اس کی خالہ ہے، اسی طرح دادا، دادی اور نانا، نانی کے رشتے ہیں، (فتاویٰ عالمگیری، جلد اول، ص: 343 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔

رضاعت (دودھ شریک) رشتہ دو طرفہ متعدی نہیں ہوتا بلکہ جانب واحد سے متعدی ہوتا ہے، یعنی جس بچی یا بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہے، اس پر رضاعی ماں باپ کی ساری اولاد حرام ہے، جبکہ رضاعی ماں باپ کی اولاد پر صرف یہ بچہ یا بچی حرام ہے، جس نے دودھ پیا ہے، اس کے باقی بہن بھائی حرام نہیں ہے (بشرطیکہ حرمت کا کوئی اور سبب نہ ہو)۔ لہذا فاطمہ بنت رحیم شاہ کی شادی محمد صالح شاہ کے دوسرے بھائیوں سے ہو سکتی ہے، رضاعت کا رشتہ صرف محمد صالح کے ساتھ قائم ہوا ہے، دوسرے بھائیوں کے ساتھ نہیں۔

ثبوت رضاعت

سوال: 88

میری بیٹی آمنہ کا رشتہ میرے چچا زاد بھائی کے بیٹے عامر شہزاد سے ہو رہا تھا، عامر شہزاد نے اپنی خالہ مریداں کا دودھ پیا ہے، جب میری بیٹی آمنہ چھ ماہ کی تھی تو میں اسے گاؤں لے گئی، وہاں ایک روز میں گھر میں کام کاج میں مصروف تھی کہ آمنہ رونے لگی مریداں نے اسے دودھ دینے کی غرض سے کود میں ڈال لیا اور کپڑا اٹھا ہی رہی تھی کہ میں وہاں آگئی اور اس پر غصہ کرنے لگی کہ میرے شوہر کی اجازت نہیں

ہے، اس نے آمنہ کو میری کو د میں دے دیا، جب میں نے اسے کو د میں لیا تو خدا کو اہ ہے کہ اس کا منہ سوکھا ہوا تھا، اس وقت آمنہ کی عمر ایک سال تھی اور مریداں کی بیٹی کی ساڑھے تین سال تھی، پھر تین سال قبل جب میں نے مریداں سے پوچھا کہ کیا تم نے میری بیٹی آمنہ کو دودھ پلایا ہے؟ تو اس نے کہا کہ مجھے تو معلوم نہیں کہ میں نے آمنہ کو دودھ پلایا ہے۔ اب جب رشتے کی بات چلی تو وہ کہتی ہے کہ میں نے آمنہ کو دودھ پلایا ہے اور اس بات پر کوئی کو اہ بھی نہیں ہے، ایسی صورت میں سوال یہ ہے کہ کیا عامر شہزاد اور آمنہ اقبال کا آپس میں نکاح جائز ہے یا نہیں؟، (غلام سکیٹہ، فیڈرل بی ایریا کراچی)۔

جواب:

رضاعت کا ثبوت دودھ پلانے والی کے اقرار سے ہوگا یا کو اہان شرعیہ سے ہوگا۔ عالمگیری میں ہے:

الرضاع يظهر باحد أمرين أحدهما الاقرار والثاني البينة كذا في البدائع - ولا يقبل في الرضاع الا شهادة رجلين أو رجل وامرأتين عدول كذا في المحيط -

ترجمہ: ”رضاعت دو طریقوں سے ثابت ہوگی، ایک یہ ہے کہ مرضعہ (دودھ پلانے والی) خود اقرار کرے، دوسرا یہ کہ اس پر شرعی کو اہ ہوں، اور شہادت قبول نہیں کی جائے گی مگر یہ کہ دو عادل مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عادل عورتیں ہوں ”محیط“ میں اس طرح سے ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 صفحہ 347، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔“

صورت مسئلہ میں شہادت شرعیہ موجود نہیں ہے، مدعیہ کے بیان میں اضطراب پایا جاتا ہے، جس سے صورت حال مشکوک ہوگئی ہے، فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

لا تثبت الحرمة بالشك۔ ترجمہ: ”شک سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 صفحہ 344 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔“

لہذا صورتِ مسئلہ میں عامر شہزاد اور آمنہ کا آپس میں نکاح جائز ہے، فقط واللہ اعلم
الصواب۔

خالہ کے نکاح میں رہتے ہوئے اس کی بھانجی سے نکاح حرام ہے

سوال: 89

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ فاطمہ کی خالہ زید کے نکاح میں ہے۔ کیا فاطمہ بھی زید کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے؟ اگر کر سکتی ہے تو کیسے اور نہیں کر سکتی تو کیسے، مہربانی فرما کر قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیلاً وضاحت فرمائیں، (محمد جان نعیمی ہزاروی، ضلع و تحصیل مانسہرہ)۔

جواب:

محرماتِ نکاح کی نواقسام میں سے تیسری قسم ”جمع بین المحارم“ ہے، یعنی وہ عورتیں کہ ان میں اگر ایک کو مرد فرض کریں تو دوسری اس کے لئے حرام ہو، مثلاً ”دوبہنیں“ کہ ایک کو مرد فرض کریں تو بھائی بہن کا رشتہ ہوایا ”پھوپھی بھتیجی“ کہ پھوپھی کو مرد فرض کریں تو ”چچا اور بھتیجی“ کا رشتہ ہو اور بھتیجی کو مرد فرض کریں، تو ”پھوپھی اور بھتیجے“ کا رشتہ یا ”خالہ بھانجی“ کہ خالہ کو مرد فرض کریں تو ”ماموں اور بھانجی“ کا رشتہ ہو اور بھانجی کو مرد فرض کریں تو بھانجے اور خالہ کا رشتہ ہو، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: والاصل ان کل امرأتین لو صورنا احداہما من ای جانب ذکرالم یحجز النکاح بینہما برضاع أو نسب لم یحجز الجمع بینہما ہکذا فی المحيط۔

ترجمہ: ”اور قاعدہ یہ ہے کہ ایسی دو عورتیں جن میں سے ایک کو مرد فرض کریں تو ان کا آپس میں نکاح جائز نہ ہو، نسب کے رشتے سے ہی خاص نہیں بلکہ رضاعی رشتے میں بھی دونوں کا جمع کرنا حرام ہے، ”محیط“ میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 277، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

اللہ جل شانہ نے محرمات نکاح کے تفصیلی احکام میں ارشاد فرمایا: وان تجمع بین الاختین۔ (ترجمہ) ”اور کسی شخص کا (بیک وقت) اپنے نکاح میں دو بہنوں کا جمع کرنا بھی حرام ہے، (النساء)۔“ آیت میں اگرچہ صراحت کے ساتھ دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا گیا ہے، لیکن مفسرین کرام اور فقہاء کرام کا اس پر اجماع ہے کہ ایسی ہر دو عورتوں کو بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، جن میں سے ایک کو مرد فرض کریں تو ان دونوں میں حرمت کا رشتہ قائم ہو جائے۔

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ: أن رسول اللہ ﷺ قال: "لا يُجمع بين المرأة وعمتها، ولا بين المرأة وخالتها۔“

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بھتیجی اور اس کی پھوپھی“ کو اور ”بھانجی اور اس کی خالہ“ کو نکاح میں ایک ساتھ جمع نہ کیا جائے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5109)۔“

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ: أن رسول اللہ ﷺ عن اربع نسوة ان یجمع بینہن "المرأة وعمتها" "والمرأة وخالتها"۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چار عورتوں کو نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا ہے، ”بھتیجی اور اس کی پھوپھی“ اور ”بھانجی اور اس کی خالہ“، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3333)۔“

عن الزهري قال : حدثني قبيصة بن ذؤيب : أنه سمع أبا هريرة يقول : نهى النبي ﷺ أن تنكح المرأة على عمتها ، والمرأة على خالتها - فترى حالة أبيها بتلك المنزلة -

ترجمہ: ”زہری فرماتے ہیں کہ قبصہ بن ذویب نے یہ حدیث بیان کی کہ انہوں نے ابو ہریرہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے ”عورت اور اس کی پھوپھی“ کو ایک نکاح میں (جمع) کرنے سے منع فرمایا، اور اسی طرح ”عورت پر اس کی خالہ“ کو (جمع کرنے سے منع فرمایا)۔ (زہری کہتے ہیں) ہمارا خیال یہ ہے بیوی کے باپ کی خالہ کا بھی یہی حکم ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5110)۔“

عن أبي هريرة، عن رسول الله ﷺ : ”أنه نهى أن تنكح المرأة على عمتها، أو خالتها“۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ پھوپھی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی بھتیجی سے نکاح کیا جائے یا بھتیجی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی پھوپھی کے ساتھ یا خالہ کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی بھانجی کے ساتھ یا بھانجی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی خالہ سے نکاح کیا جائے، (سنن نسائی، رقم الحدیث: 3290)۔“

علامہ نظام الدین مزید لکھتے ہیں: فان تزوج الاختين في عقدة واحدة يفرق بينهما وبينه فان كان قبل الدخول فلا شيء لهما وان كان بعد الدخول يحجب لكل واحدة منهما الاقل من مهر مثلها ولو من المسمى كذا في المصنعات - وان تزوجهما في عقدتين فنكاح الاخيرة فاسد ويجب عليه أن يفارقها ولو علم القاضي بذلك يفرق بينهما فان فارقها قبل الدخول

لا يثبت شئ من الاحكام وان فارقتها بعد الدخول فلها المهر ويجب الاقل من المسمى ومن مهر المثل وعليها العدة ويثبت النسب ويعتزل عن امراته حتى تنقضي عدة اختها كذا في محيط السرخسي -

ترجمہ: ”اگر دو بہنوں سے بیک وقت نکاح کیا تو کسی سے بھی نکاح نہیں ہوا، فوراً دونوں کے درمیان علیحدگی کر دی جائے گی، اگر ازواجی تعلق قائم ہونے سے پہلے ہی علیحدگی کی گئی تو کوئی مہر واجب نہ ہوا اور اگر اس کے بعد علیحدگی ہوئی تو ان میں سے ہر ایک کو (اگر دونوں سے دخول ہوا ہو تو) ”مہر مثل“ اور ”مقرر مہر“ میں سے جو کم ہو وہ دیا جائے گا، ”مضمرات“ میں اسی طرح ہے۔ اور اگر دونوں سے یکے بعد دیگرے نکاح کیا ہو تو جس سے بعد میں نکاح کیا، وہ فاسد ہوگا اور شوہر پر واجب ہے کہ اس سے فوراً علیحدگی اختیار کر لے، (اگر قاضی کو علم ہو جائے) تو وہ تفریق کر دے پس اگر مباشرت سے پہلے تفریق کی تو اس کے لئے کوئی حکم ثابت نہیں ہے، اور اگر مباشرت کے بعد تفریق ہوئی تو اس کے لئے مہر مثل یا مقرر مہر میں سے جو کم ہو وہ دیا جائے گا، اور اس پر عدت لازم ہوگی، (بچہ پیدا ہو تو) ثابت النسب ہوگا، اور اپنی بیوی سے دور رہے گا جب تک اس کی بہن کی عدت پوری نہ ہو جائے، ”محیط سرخسی“ میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 277، 278، مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

صورت مذکورہ میں فاطمہ اور اس کی خالہ زید کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں، اور یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی قائم کردہ حدیں ہیں جن کی پابندی از حد ضروری ہے۔

محترم مفتی صاحب!، یہ سوال میری چھوٹی ہمشیرہ کا ہے، جو میں ان کے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ آپ اپنی علمی قابلیت کو بروئے کار لاتے ہوئے شریعت محمدی کی روشنی میں اس کا جواب مرحمت فرمائیں گے۔ میری شادی میرے تایا زاد کنن سے فروری 2002ء میں آج سے تقریباً چار سال پہلے ہوئی، سن 1994ء میں ہماری منگنی ہوئی شادی سے تقریباً دو سال پہلے کی بات ہے، میں اور میرا بڑا بھائی اپنے تایا کے گھر میں رہ رہے تھے (پڑھائی کے سلسلے میں کیونکہ والدین سعودیہ میں رہتے تھے) میرے تایا مجھ سے اور میرے بڑے بھائی سے کافی پیار کرتے تھے، اکثر مجھ سے اپنی ٹانگیں دبواتے تھے، ایک دن وہ اخبار پڑھ رہے تھے، اور انہوں نے کہا کہ میری ٹانگیں دباؤ، جب میں ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی، تو انہوں نے پوچھا تمہارا پیٹ خراب ہے تو اپنی زبان دکھاؤ، تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے کہا کہ اپنی زبان باہر نکالو اور ہاتھ لگا کر کہا کہ تمہاری زبان تو کافی نرم ہے، اور پھر انہوں نے زبان چوس لی، یہ عمل انہوں نے دوبارہ کیا، اللہ کواہ ہے کہ اس میں لکھا سب سچ ہے، اس بات سے میں بہت روئی تھی۔

اس واقعہ کے بعد گھر میں کافی جھگڑا ہوا، تایا اس بات سے سرے سے ہی منکر ہو گئے، خاندان کے لوگ میری بات کو ماننے بھی تھے، لیکن تایا کے سامنے کہنے کی جرات نہ کر سکے، نہ ہی کسی نے اس بابت شریعت سے رجوع کرنے کے بات کی یا کوشش کی، تایا کیونکہ خاندان میں سب سے بڑے ہیں، اور ان کا خاندان میں کافی رعب و دبدبہ ہے، جس کی وجہ سے کوئی ان سے بحث نہیں کرتا، میرے بار بار منع کرنے کے

باوجود خاندان کے بڑوں نے میری شادی تایا کے بیٹے کے ساتھ کر دی، منگنی کے تقریباً 8 سال گزرنے کے بعد میرے دل میں تایا زاد کے لئے پسندیدگی کے جذبات بھی تھے۔ ہماری شادی ہوئی، اس واقعہ کے بعد جو کہ بڑی مشکل سے ہوئی، شادی کے بعد اس گھر میں، مجھ پر ہر وقت ایک خوف طاری رہتا تھا، شادی سے پہلے کا واقعہ میرے دماغ پر ہر وقت سوار رہتا ہے اور مجھے انتہائی خوف محسوس ہوتا ہے، مختلف جھگڑے ہوئے۔

تایا کا بیان ہے کہ: ”بلکہ وہ لڑکی آئس کریم کھا رہی تھی، میں نے اس سے مانگی تو اس نے کہا کہ ختم ہو گئی ہے اور صرف میرے منہ میں باقی ہے، جو کہ میں نے (یعنی تایا نے) اپنے زبان کے ساتھ اٹھالی، اس وقت اس کی زبان بھی میرے منہ میں آ گئی تھی، اور کہ اس میں کسی قسم کی شہوت نہ تھی اور میں اس پر قرآن اٹھانے کو تیار ہوں۔“

اب اصل صورتحال (جو کہ میں نے سوال میں بیان کی ہے) کی روشنی میں، میں حلفاً کہتی ہوں کہ تایا کا یہ بیان مکمل طور پر جھوٹ ہے۔

میں اور میرے گھر والے اس مسئلہ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں، اور ہم نے ابھی تک اس سلسلے میں کوئی تحریری فتویٰ نہیں لیا، اس لئے جناب سے گزارش ہے کہ شریعت کی روشنی میں تفصیل سے بتائیں کہ میری ہمشیرہ کے لئے کیا حکم ہے؟ تحریر فرمائیں، (حماد آصف، رجسٹرار آفس، نیشنل الیکٹرک پاور ریگولیٹری اتھارٹی، سیکٹر 2/5-G، اسلام آباد)۔

جواب:

وہ عورتیں، جن سے نکاح حرام ہے، ان کو 9 قسم پر منقسم کیا جاتا ہے، جس میں ایک قسم حرمت مصاہرت ہے، مرد و عورت ایک دوسرے کو شہوت سے چھوئیں یا

ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھیں، تو عورت کے اصول و فروع مرد پر حرام ہو جائیں گے۔ اور مرد کے اصول و فروع عورت پر حرام ہو جائیں گے۔ اس کو حرمت مصاہرة کہتے ہیں۔

اس کے بارے میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: نو کما تثبت هذه الحرمة بالروطء تثبت بالمس والتقبيل والنظر الى الفرج بشهوة كذا في الذخيرة۔۔۔

ترجمہ: ”حرمت مصاہرت، جس طرح وطی (مباشرت) سے ثابت ہوتی ہے، اسی طرح شہوت کے ساتھ چھونے، بوسہ لینے اور فرج (شرمگاہ) کی طرف نظر کرنے سے بھی ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ ”ذخیرہ“ میں ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں:

و كذا لو عضها بشهوة هكذا في الخلاصة۔

ترجمہ: ”اور اسی طرح اگر شہوت کے ساتھ دانت سے کاٹا ہو تو اس سے بھی حرمت ثابت ہو جائے گی، ”خلاصہ“ میں بھی اسی طرح ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 274، 275۔ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: قال في ”الذخيرة“: واذا قبلها او لمسها او نظر الى فرجها ثم قال: لم ي كن عن شهوة، ذكر الصدر الشهيد انه في القبلة يفتى بالحرمة، مالم يبين انه بلا شهوة، وفي المس والنظر لا، الا ان تبين انه بشهوة لان الاصل في التقبيل الشهوة، بخلاف المس والنظر،..... ومنهم من فصل في القبلة فقال: ان كانت على الفم يفتى بالحرمة، ولا يصدق انه بلا شهوة، وان كانت على الرأس او اللكن او الخد فلا اذا تبين انه بشهوة و كان الامام ظهير الدين يفتى بالحرمة في القبلة مطلقا، ويقول: لا يصدق في انه لم يكن بشهوة۔

ترجمہ: ”ذخیرہ“ میں فرمایا: جب (کسی عورت کو) بوسہ دیا یا چھوا یا اس کی شرمگاہ (فرج) کی طرف نظر کی، پھر کہتا ہے کہ یہ عمل شہوت سے نہیں تھا، صدر الشہید ذکر کرتے ہیں کہ بوسہ لینے میں حرمت کا فتویٰ دیا جائے گا، جب تک کہ یہ بالکل واضح نہ ہو کہ یہ بوسہ لینا شہوت کے بغیر تھا اور چھونے اور (شرمگاہ کی طرف) نظر کرنے پر حرمت کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا، سوائے اس صورت کے کہ (ان دونوں امور کا) شہوت کے ساتھ ہونا بالکل واضح ہو، کیونکہ بوسہ لینے میں اصل شہوت ہے اور دیکھنے میں ایسا نہیں ہے (یعنی اصل شہوت نہیں ہے)، بعض فقہاء نے بوسہ لینے میں بھی تفصیل بیان کی ہے اور فرمایا ہے کہ: اگر بوسہ منہ پر لیا ہو، تو فتویٰ حرمت مصاہرت پر ہے اور اس کا شہوت کی غیر ہونا سچا نہیں جانا جائے گا، اور اگر بوسہ پیشانی پر لیا ہو یا ٹھوڑی پر یا رخسار پر تو حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوگی، جب تک کہ شہوت سے نہ ہو، اور امام ظہیر الدین بوسہ لینے میں مطلقاً حرمت کا فتویٰ دیتے ہیں، اور فرماتے ہیں: کہ اس کا بلا شہوت ہونے کا دعویٰ سچا نہیں مانا جائے گا۔

علامہ شامی آگے چل کر لکھتے ہیں:

وقال فی ”الفیض“: ولو قام اليها وعانقها منتشرا او قبلها وقال لم يكن عن شهوة لا يصدق، ولو قبل ولم تنتشر آله وقال كان عن غير شهوة يصدق، وقيل لا يصدق لو قبلها على الفم، وبه يفتي اهـ۔

ترجمہ: ”اور“ فیض ”میں فرمایا: کہ اگر اٹھ کر اس عورت کی طرف بڑھا اور اس کو گلے لگایا، اس حال میں کہ منتشر آئے اور کہتا ہے کہ شہوت سے نہیں تھا، تو اس کے قول کو نہیں مانا جائے گا۔ اور اگر اس نے بوسہ لیا اور منتشر آئے نہیں ہو اور وہ کہتا ہے کہ شہوت سے نہیں تھا تو اس کا قول معتبر مانا جائے گا اور بعض فقہاء نے فرمایا کہ اگر منہ پر

بوسہ لیا ہے، تو اس کے بلا شہوت ہونے کے دعویٰ کی تصدیق نہیں کی جائے گی، (رد المحتار علی الدر المختار جلد 4 ص: 90 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ویشترط أن تكون المرأة مشتبهة كذا في التبيين، والفتوى على أن بنت تسع محل الشهوة لا مادونها كذا في معراج الدراية وقال الفقيه أبو الليث مادون تسع سنين لا تكون مشتبهة وعليه الفتوى كذا في فتاوی قاضی خان۔

ترجمہ: ”اور حرمت مصاہرت کے لئے شرط ہے کہ عورت مشتبهة ہو (یعنی وہ عمر اور جسمانی وضع کے اعتبار سے ایسی ہو کہ اسے دیکھ کر مرد کو جنسی شہوت آئے)، ”تبيين“، میں اسی طرح ہے، اور فتویٰ اس پر ہے کہ نو سال کی عمر والی لڑکی محل شہوت ہے، اگر اس کی عمر اس سے کم ہو تو وہ محل شہوت نہیں ہے، ”معراج الدراية“ میں بھی اسی طرح ہے، اور فقیہ ابواللیث فرماتے ہیں کہ جو لڑکی نو سال سے کم عمر کی ہو، وہ مشتبهة نہیں ہے، یعنی اس پر شہوت کی نظر ڈالنے سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی، اسی پر فتویٰ ہے، فتاویٰ قاضی خان میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 274-275، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

اب صورت مسئلہ میں بر تقدیر صدق سائل لڑکی کے تایا اور خسر نے اس کی زبان چوسی اور خسر اس بات کا اقرار بھی کرتا ہے، اور منہ کا بوسہ لینے کی صورت میں مرد کا دعوائے عدم شہوت غیر معتبر ہے، جب کہ یہاں اس سے بھی بڑھ کر زبان بھی چوسی گئی ہے، جبکہ قرائن بھی اس حقیقت کے مؤید ہیں کہ اس شخص نے یہ عمل شہوت سے کیا ہے، اس لئے مذکورہ بالا لڑکی اور اس کے شوہر کے درمیان حرمت مصاہرت کا تعلق قائم ہو جاتا ہے اور دونوں کا آپس میں نکاح شروع ہی سے ناجائز تھا، اس لئے دونوں کو فوراً

علیحدگی اختیار کر لینی چاہیے۔

حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں

سوال: 91

ایک گھر میں تقریباً 14 سال سے Joint Family رہتی ہے، ابھی پچھلے جمعہ اچانک بھابھی نے اپنے دیور (سائل) پر الزام لگایا کہ اس نے ان کے کمرے میں آکر (جہاں وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ سو رہی تھی) اُن کے رخسار پر بوسہ دیا ہے یہ بھابھی کا قول ہے، جبکہ دیور (سائل) کا قول یہ ہے کہ یہ سب ڈرانگ روم میں سو رہے تھے، میں اپنے کسی کام سے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ بھابھی کی قمیص حد سے زائد پیچھے سے اٹھی ہوئی ہے، میں اس کو ڈھانپنے کے لئے گیا، ان کا بیٹا بھی ساتھ سو رہا تھا ڈھانپتے ہوئے اچانک میرا ہاتھ بھابھی کے چہرے پر لگ گیا جس سے وہ اٹھ گئیں اور انہوں نے غلط بات سمجھی۔

جواب طلب بات یہ ہے کہ آیا بھابھی کا قول معتبر ہو گا یا دیور کا؟ میری بیوی کے بقول بھابھی نے مجھ کو معاف کر دیا ہے لیکن بھائی اور بھابھی نے ترکِ کلام کیا ہوا ہے، میرے لئے شریعت کا کیا حکم ہے؟، (خالد احمد، بلاک 6 گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

علامہ علاؤ الدین ہسکفی لکھتے ہیں:

(وان ادعت الشهوة) فی تقبیله أو تقبیلها ابنه (وانکرھا الرجل فہو مصدق)۔

ترجمہ: ”اور اگر عورت نے دعویٰ کیا کہ مرد نے اس کو بشہوت چھوا، یا اس عورت نے اس کے بیٹے کو بشہوت چھوا اور مرد نے اس کا انکار کیا تو مرد کا قول معتبر مانا جائے

گا، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد: 4 ص: 92 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

حدیث میں ہے: عن عقبۃ بن عامر أن رسول الله ﷺ قال: ”ایاکم والدخول علی النساء“ فقال رجل من الانصار: یا رسول الله افرأیت الحموقال الحموموت، ”(انجشی) عورتوں کے پاس جانے سے اجتناب کرو، انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! دیور کا کیا حکم ہے؟، فرمایا کہ دیور موت ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث 5570، جلد 9، مکتبہ زار مصطفیٰ الباز مکة المكرمة)

عن علی بن الحسین: کان النبی ﷺ فی المسجد، وعنده ازواجه، فرحن، فقال لصفیة بنت حی: ”لا تعجلي حتی أنصرف معك“۔ وکان بیتها فی دار أسامة، فخرج النبی ﷺ معها، فلقیه رجلان من الانصار، فنظرا الی النبی ﷺ ثم أجازا، وقال لهما النبی ﷺ: ”تعالیا، انہا صفیة بنت حی“۔ قالوا: سبحان الله یا رسول الله ﷺ، قال: ”إن الشیطان یجری من الانسان مجری الدم، وانی خشیة أن یتلقى فی أنفسكما شیئاً“۔

ترجمہ: ”علی بن حسین سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مسجد میں تھے اور آپ کی زوجہ مطہرہ آپ کے پاس تھیں، وہ جانے لگیں تو آپ نے حضرت صفیہ سے فرمایا: بٹھرو تا کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں اور ان کا حجرہ حضرت اسامہ کے مکان میں تھا۔ نبی کریم ﷺ ان کے ساتھ نکلے تو آپ کو انصار کے دو شخص ملے، انھوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا اور آگے نکل گئے۔ نبی کریم ﷺ نے ان دونوں سے فرمایا: ادھر آؤ، یہ صفیہ بنت حی ہے (یعنی میری بیوی ہے)۔ دونوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ: سبحان

اللہ! (یعنی آپ کی ذات کے بارے میں مومن کسی بدگمانی کا تصور بھی نہیں کر سکتا) آپ نے فرمایا کہ شیطان انسان کے جسم میں خون کی طرح دوڑتا ہے تو مجھے خدشہ ہوا کہ مبادا وہ تمہارے دل میں کوئی دوسرہ ڈال دے، (صحیح بخاری، جلد 2 رقم الحدیث 2038، مطبوعہ مکتبۃ العصریہ، بیروت)۔

مسلمان کو چاہئے کہ وہ مواضع تہمت اور مواقع تہمت سے ہمیشہ اجتناب کرے، اپنی عزت و آبرو کا تحفظ مومن کی شرعی ذمہ داری ہے، کسی ایسے مقام پر جانا یا ٹھہرنا، جہاں دوسرے لوگ بدگمانی کی بنا پر ہدف تہمت بنا سکتے ہوں۔ ایک روایت میں ہے: من سلك مسالك الظن اتهم، ورواه الخرائطي في مكارم الاخلاق مرفوعاً بلفظ: من اقام نفسه مقام التهم فلا يلزم من اساء الظن به۔

ترجمہ: جو بدگمانیوں کی راہوں پر چلے گا، وہ ہدف تہمت بنے گا، اور مکارم اخلاق میں خرائطی نے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا کہ ”جو مقام تہمت پر ٹھہرا، تو پھر اسے چاہئے کہ بدگمانی کرنے والوں کو ملامت نہ کرے (بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرے کہ اس نے خود انہیں موقع فراہم کیا) علامہ اسماعیل بن محمد العمرونی الجراحى نے مندرجہ بالا روایات کا حوالہ دے کر یہ لکھا ہے کہ: اگرچہ ”اتقوا مواضع التهمة“ ہر ترجمہ: (مقامات تہمت سے بچو!) کی روایت لفظاً ثابت نہیں ہے، لیکن مندرجہ بالا روایات کی بنا پر معنی ثابت ہے، (کشف الخفاء ومزيل الالباس، جز الاول، صفحہ 44، مطبوعہ مکتبۃ الغزالی، دمشق)۔

صورتِ مسئلہ میں حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوئی، آپ کی بھابھی نے آپ کو معاف کر کے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا ہے اور چاہئے کہ ترکِ کلام نہ کریں اور دیور کے لئے لازم ہے کہ آئندہ محتاط رہے۔

شادی اور تقریبات پر فارنگ اور آتش بازی

سوال: 92

شادی کے موقع پر فارنگ کرنا کیسا ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مدلل ارشاد فرمائیں، (سلمان حسین، لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

زمانہ قدیم سے ہی حیات انسانی کے تمام شعبوں میں طرزِ بود و باش، معاشرتی میل جول اور خوشی و غم کے جذبات و احساسات کے پیرائے اظہار کے طور طریقے بدلتے چلے آ رہے ہیں، اس حوالے سے مزید غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کی اپنی ایک ثقافت ہوتی ہے، جو اس قوم کی شناخت بھی ہوتی ہے اور ہر قوم خوشی کا اظہار زمانے کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی ثقافت کے مطابق کرتی رہی ہے، مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ رسوم و رواج اور ثقافتیں بھی بدلتی رہتی ہیں، کہیں سادگی کا عنصر نمایاں ہو تو کہیں اظہارِ ثقافت کی زیادہ سے زیادہ نمود و نمائش پائی جاتی ہے، اور وہ رسومات جب تک شریعت سے متصادم نہ ہوں، شرعاً ان پر طعن نہیں کیا جاسکتا، اور ان رسومات کے مذموم و محمود ہونے کا مدار نیت پر ہے جیسا کہ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: فی الواقع نکاح میں بغرض اعلان بندوقین چھوڑنے کی ممانعت شرع میں کہیں ثابت نہیں۔ ہلالِ عید اور رمضان میں صدھا سال سے توپوں کے فار کئے جاتے ہیں اس سے بھی اعلان ہی مقصود ہوتا ہے اس اعلان پر شرعاً عمل کا جزئیہ ردالمختار میں مذکور ہے۔ نیتِ ریا و تفاخر نہ فقط شادی کی بندوقوں بلکہ نماز کو حرام کر دیتی ہے، رسم کا اعتبار جب تک کسی فسادِ عقیدہ پر مشتمل نہ ہو اصل رسم کے حکم میں رہتا ہے اگر رسم محمود ہے، محمود ہے، مذموم ہو مذموم ہے، مباح ہو مباح ہے، واللہ

تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ رضویہ، جلد 24، ص: 119، رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔“

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے شادیوں میں کی جانے والی مختلف رسومات مثلاً آتش بازی، بندوق اور گانا بجانا، لکڑی کھیلنا، نوشہ (دولہا) کو پاکی میں سوار کرنے سے متعلق سوال ہوا، آپ نے جواب میں فرمایا: نوشہ کو پاکی میں سوار کرنا مباح و جائز ہے لان من الرسوم العامة التي لا مضر فيها من المشرع، (اس لئے کہ یہ ان عادی رسموں میں سے ہے شریعت میں جن پر کوئی طعن نہیں) اور لکڑی پھینکنا، بندوقیں چھوڑنا اور اس قسم کے سب کھیل جائز ہیں جبکہ اپنے اور دوسرے کی مضرت کا اندیشہ نہ ہو، ایک اور سوال کہ ”اعلان کے لئے شادی میں بندوقیں چھوڑنا جائز ہے یا نہیں؟“ کے جواب میں لکھتے ہیں: جائز ہے۔ اخرج الترمذی عن ام المؤمنين الصديقة رضي الله تعالى عنها قالت قال رسول الله ﷺ اعلنوا هذا النكاح واجعلوه في المساجد واضربوه عليه بالدفوف وروى احمد بسند صحيح وابن حبان في صحيحه والطبرانی في الكبير و ابو نعیم في الحلیة والحاكم في المستدرک عن عبد الله بن الزبير رضي الله تعالى عنهما عن النبي ﷺ قال اعلنوا النكاح، والله تعالى اعلم۔

ترجمہ: ”امام ترمذی نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے تخریج فرمائی کہ آپ نے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگو! نکاح کا اعلان کیا کرو (یعنی اس کی تشہیر کیا کرو) اور مسجدوں میں نکاح کیا کرو اور اس کی تشہیر کے لئے دف بجایا کرو۔ امام احمد نے سند صحیح سے ابن حبان نے اپنی صحیح میں، طبرانی نے الكبير میں، اور ابو نعیم نے الحلیہ میں اور حاکم نے المستدرک میں حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے نبی کریم ﷺ سے روایت فرمائی کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ نکاح کا

اعلان کیا کرو، (فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص: 277، 289، 290، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔ “آج کل آتش بازی کی ممانعت کا قانون موجود ہے اور تقریبات کے موقع پر فائرنگ سے بعض اوقات حادثات بھی رونما ہو جاتے ہیں، اس لئے قانون کی پابندی بھی ضروری ہے اور فی نفسہ از روئے شرع پابندی کے جواز کے باوجود احتیاط پر عمل کرنا افضل ہے، اور اس حد تک آتش بازی اور فائرنگ جو اسراف کی حد میں داخل ہو جائے، بہر حال ممنوع ہے۔ آگ کا کھیل تو ویسے بھی مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں ہے۔

جبری نکاح کا حکم

سوال: 93

میری بیٹی رضوانہ جس کی شادی میری سالی کے بیٹے کے ساتھ ہوئی۔ دوسری طرف میری بیوی گردوں کی خرابی کی وجہ سے 2005ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئی، اس پر میری بیٹی کراچی آئی ہوئی تھی۔ چونکہ میری بیٹی امید سے تھی، میری بیٹی نے بڑے آپریشن سے بچے کو جنم دیا۔ اس کے تین ماہ بعد اس کے شوہر نے کہا کہ میری ماں نے بچہ بیوی اور بچے اپنے پاس سیہون بلائے کو کہا ہے، اس پر میں نے اجازت دی کہ اپنے گھر سیہون جاؤ۔ اجازت دینے کے بعد چونکہ میری بیٹی آپریشن کی وجہ سے کمزور تھی۔ اس کے ساتھ اس سے تیسرے نمبر پر میری بیٹی ارم کو ساتھ روانہ کیا تا کہ بچے کو سنبھال سکے۔ واضح ہو کہ اس سے قبل میری بیٹی کی ساس نے میری دوسری بیٹی ارم کا رشتہ اپنے دوسرے بیٹے کے لئے مانگا تھا۔ لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میری پہلی بیٹی مشکلات میں تھی۔ اس کا شوہر کچھ بھی نہیں کمانا۔ اور کچھ بھی جو تھوڑا بہت کمانا ہے۔ وہ ماں کو دے دیتا ہے۔ بجائے اپنی

بیوی کو دینے کے۔ جو کہ از روئے شریعت محمدی ﷺ بیوی کا حق ہے۔ اور شوہر کا فرض ہے۔ اس کا شوہر کوئی اخراجات میری بیٹی کے برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے دوسرے رشتے کے لئے میں نے انکار کر دیا۔ اور اپنے تیسرے نمبر والی بیٹی کی منگنی کہیں اور کر دی۔ جس میں میرے داماد کی مرضی بھی شامل تھی۔ بہر حال پہلی شادی شدہ بیٹی کے ساتھ بچے کی دیکھ بھال کے لئے اپنی تیسرے نمبر والی بیٹی کو بھیجا۔ اس کے ٹھیک ڈیڑھ ماہ بعد جب ارم کراچی آئی۔ تو اس نے بتایا کہ میرا زبردستی نکاح کروا دیا اپنے بیٹے کے ساتھ اور ان کو معلوم تھا۔ کہ ارم کسی اور کی امانت ہے۔ حالانکہ میں اس رشتے کے لئے دو دفعہ منع کر چکا تھا۔ ارم کے نکاح میں نہ میں شریک ہوا اور نہ ہی ہمارے رشتے داروں میں سے کوئی یہاں تک کہ میری شادی شدہ بیٹی جو کہ اسی گھر میں رہتی ہے۔ اسے بھی پتہ نہ تھا۔ اس پر میری تیسرے نمبر والی بیٹی نے کہا کہ مجھ سے زبردستی نکاح کروایا ہے۔ میں اس وقت ہوش میں نہیں تھی۔ مجھ پر جادو ہوا تھا۔ اور میں اس رشتے سے خوش نہیں ہوں، جہاں میرے ماں باپ نے میری منگنی طے کی ہے، میں وہیں خوش ہوں۔ میں وہاں خوش نہیں رہوں گی۔ اسباب یہ ہے کہ میری پہلی بیٹی وہاں بھوک سے مر رہی ہے۔ اسی کے اخراجات پورے نہیں کر سکتا۔ اس بنا پر اپنی دوسری بیٹی نہیں دینا چاہتا۔ آپ سے گزارش ہے کہ شریعت محمدی ﷺ کے مطابق فتویٰ صادر فرمائیں کہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟، (محمد نواز، ڈیفنس ویو، فیز ۱۱ بنگلہ نمبر G-199 مدینہ اسٹاپ نزد دارم مسجد کراچی)۔

جواب:

صورت مسئلہ میں فقہائے احناف کی تصریحات کے مطابق جبر کی حالت میں نکاح ہو جاتا ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ لکھتے ہیں:

اقول وبتقریری هذا اندفع ما عسى ان يتوهم من ان النكاح مما يستوى فيه الهزل والسخف لا يحتاج الى نية وقصد متى لو تكلمنا بالايجاب والقبول هازلین او مکرهین ینعقد۔

ترجمہ: ”اقول (میں کہتا ہوں) میری اس تقریر سے اس شبہ کا ازالہ ہو گیا، جس میں کہا گیا کہ نکاح تو ان امور میں سے ہے، جن میں مذاق اور قصد برابر ہیں، لہذا اس میں قصد اور ارادہ کی ضرورت نہیں حتیٰ کہ جب مرد و عورت نے ایجاب و قبول کے کلمات بول دیئے اگرچہ مذاق یا جبر سے کہے ہوں، تو نکاح ہو جائے گا، (فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۱ ص: ۱۲۸)“،

مزید لکھتے ہیں:

نکاح اگرچہ جبر و اکراہ سے بھی ہو جاتا ہے، فی الہندیۃ الاصل ان تصرفات المکرہ کلہا قولاً من عقیدۃ عندنا الا ان ما یحتمل الفسخ منه کالبیع والاحارۃ یفسخ وما لا یحتمل الفسخ منه کالطلاق والعناق والنکاح والتبیر والاستیلاء والنور فہو لازم کذا فی الکافی ۱۔

ترجمہ: ”ہند یہ میں ہے قاعدہ یہ ہے کہ جس پر جبر کیا گیا ہو اس کے اس حالت کے تمام تصرفات نافذ العمل ہونگے، ہاں وہ تصرفات جو فسخ کا احتمال رکھتے ہوں جیسے بیع اور اجارہ کہ یہ فسخ قرار پائیں گے، اور جو فسخ کا احتمال نہیں رکھتے، مثلاً طلاق، عناق، نکاح، مدبر بنانا، ام ولد بنانا اور نذر تو یہ امور لازم ہو جائیں گے، (فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۱ ص: ۲۰۲-۲۰۳)“۔

لہذا صورتِ مسئلہ میں نکاح منعقد ہو گیا۔

جعلی نکاح نامے کی حیثیت

سوال: 94

ایک شخص نے کسی لڑکی سے جھوٹا اور جعلی نکاح نامہ تیار کر لیا ہے۔ لڑکی اور اس کے والدین کو اس نکاح کا کوئی علم نہیں۔ ازراہ کرم یہ ارشاد فرمائیں کہ اس جھوٹے نکاح نامہ کی بنیاد پر شرعی نکاح ثابت ہوگا یا نہیں ہوگا؟ یعنی اس صورت میں ہمیں لڑکے سے طلاق لینا ضروری ہے؟ نکاح نامہ میں جو وکیل اور گواہان رکھے گئے ہیں۔ وہ سب کے سب فرضی ہیں اور ہم لڑکی والے ان کو پہچانتے بھی نہیں۔ واضح رہے کہ لڑکی نے نکاح نامہ پر نہ دستخط کئے ہیں اور نہ ایجاب و قبول ہوا ہے، (پروفیسر میر محمد سومرو، ساکن ہنگو رجبہ تحصیل سو بھو دیر ضلع، خیر پور میرس)۔

جواب:

استفتاء میں مستفتی نے چند دعوے کئے ہیں:

- (1) لڑکی کے ساتھ نکاح کے ثبوت کے لئے نکاح نامہ تو موجود ہے، لیکن جعلی ہے۔
- (2) نکاح نامے میں دلہا و دلہن کے دستخط اور گواہوں کے نام اور دستخط موجود ہیں، لیکن مستفتی کا دعویٰ ہے کہ لڑکی کے دستخط فرضی اور جعلی ہیں اور گواہان بھی فرضی ہیں۔
- (3) ایجاب و قبول ہوا ہی نہیں ہے۔

ہمارا منصب افتاء ہے، قضا نہیں ہے، ہمارا جواب اس مفروضے پر مبنی ہوتا ہے کہ استفتاء میں بیان کردہ بیان اور حقائق اگر درست ہیں تو صورت مسئلہ کا شرعی جواب یہ ہے، باقی رہا یہ سوال کہ استفتاء میں بیان کردہ صورت مسئلہ آیا حقیقت پر مبنی ہے اور واقعہ کے مطابق ہے؟ قطعیت کے ساتھ اس کا فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے۔ پس اگر استفتاء میں بیان کردہ صورت مسئلہ درست ہے تو شرعاً نکاح منعقد ہی نہیں ہوا، لہذا

طلاق کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ طلاق، اس نکاح کی قید سے آزاد کرنے کا نام ہے، جو شرعاً منعقد ہو چکا ہو، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

غیر رجسٹرڈ نکاح کی شرعی حیثیت

سوال: 95

نیاز بی بی بنت شیر اکبر کا نکاح محمد حنیف ولد محمد اسلم خان کے ساتھ 4 اپریل 1997ء کو مصری خان ولد فضل الرحمن کی وکالت پر گواہان حاجی محمد نور ولد نواب اور محمد ایوب ولد نواب کے روبرو قاضی نکاح خواں نے پڑھایا۔ جس میں نیاز بی بی کے والد شیر اکبر اور ان کے ساتھ کئی قریبی رشتے دار بھی موجود تھے، اس نکاح کا اندراج رجسٹر میں نہیں کرایا، جو کہ ہمارے ہاں اکثر رخصتی پر یہ نکاح رجسٹرڈ کیا جاتا ہے۔ لہذا اس نکاح کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ بغیر رجسٹریشن نکاح ہوا یا نہیں؟ محمد حنیف کے طلاق دیئے بغیر نیاز بی بی دوسرے فریق سے نکاح کر سکتی ہے؟، (نصیر احمد الحسنی، اسلامک سینٹر، ناتھناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

نکاح ایجاب و قبول سے منعقد ہوتا ہے، نکاح کے شرعی طور پر منعقد ہونے کے لئے فارم پر کرنا یا رجسٹریشن کرنا شرط نہیں، البتہ یہ قانونی ضرورت بھی ہے اور دستاویزی ثبوت کی وجہ سے تنازعات کے حل میں مدد ملتی ہے، لہذا یہ مستحسن امر ہے اور ایسا کرنا بہتر ہے۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ”قاضی کا رجسٹر شرعاً کوئی شرط نکاح نہیں، رجسٹر آج سے نکلے ہیں، پہلے نکاح کیونکر ہوتے تھے، ہاں یادداشت کے لئے درج ہونا بہتر ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ رضویہ، جلد: 21، ص: 169، جلد: 23، ص: 193، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن،)۔“

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: النکاح منعقد بالایجاب والقبول۔ ترجمہ: ”نکاح ایجاب وقبول سے منعقد ہو جاتا ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 270، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

لہذا مذکورہ بالا گواہوں کی موجودگی میں محمد حنیف کا نکاح نیاز بی بی سے منعقد ہو گیا اور چونکہ نیاز بی بی کے والد بھی نکاح کے وقت موجود تھے، اس لئے بجا طور پر ولی کی رضا بھی اس میں شامل ہے۔ اور اب وہ اس کی پابند ہے، بغیر اس کے طلاق دیئے، یا اس کی زندگی میں اس کے نکاح میں رہتے ہوئے کسی اور شخص سے نکاح کرنا حرام ہے اور اگر نکاح کیا تو منعقد ہی نہیں ہوگا اور زنا کی مرتکب ہوگی۔

میاں بیوی کے ایک دوسرے پر الزامات لگانے سے از خود نکاح باطل نہیں ہوتا

سوال: 96

ایک دفعہ T.V پر میں نے کسی وکیل سے سنا کہ اگر میاں بیوی ایک دوسرے پر الزامات لگائیں اور اگرچہ وہ غلط ہوں یا صحیح، تو شرعی حیثیت سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ مجھے آپ سے یہ دریافت کرنا ہے کہ کیا یہ درست ہے؟، (اسامہ بن سہیل، گلشن اقبال اصفہانی روڈ، کراچی)۔

جواب:

وکیل کا یہ بیان شرعاً غلط اور باطل ہے کہ اگر زوجین (میاں بیوی) ایک دوسرے پر زنا کی تہمت لگائیں، تو اس امر سے قطع نظر کہ تہمت زنا فی الواقع صحیح ہے یا غلط، ان دونوں کا نکاح از خود (Automaticaly) ٹوٹ جائے گا، ایسا ہرگز نہیں ہے، وکیل صاحب کو شریعت کا علم نہیں ہے اور شرعی علم کے بغیر ایسے فتوے جاری نہیں کرنے چاہئیں۔ اگر شوہر اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے، یا اس کے نکاح میں رہتے

ہوئے اس عورت کے ہاں جو بچہ پیدا ہوا ہے، اسے ولد الزنا کہے اور اسے اپنی صحیح النسب اولاد ماننے سے انکار کر دے، اور پھر معاملہ قاضی کی عدالت میں پہنچ جائے تو قاضی عورت سے شوہر کے دعوے (یعنی الزامِ زنا) کی صداقت کے بارے میں پوچھے گا، اگر وہ اقرار کرے تو اس پر حدِ زنا جاری ہوگی، لیکن اگر وہ شوہر کے دعوے اور الزام کو رد کرتی ہے اور اپنی عفت اور پاک دامنی کا دعویٰ کرتی ہے (ظاہر ہے کہ یہ اس صورت حال کی بابت ہے، جب شوہر کے پاس اپنی بیوی پر ثبوتِ زنا کے کواہ نہیں ہیں اور بیوی اعترافِ جرم سے انکاری ہے)، تو قاضی ان دونوں کے درمیان ”لعان“ کرائے گا، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُن لَّهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ ^۱ بِاللَّهِ أَنَّهُ لَمَنِ الصُّدُوقِينَ ^۲ وَالْخَامِسَةَ ^۳ أَنْ لَعْنَتُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ^۴ وَيَسْأَلُ عَنْهَا الْعَذَابُ إِنْ تَشْهَدُ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ ^۵ بِاللَّهِ أَنَّهُ لَمَنِ الْكَاذِبِينَ وَالْخَامِسَةَ ^۶ أَنْ غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهَا إِنْ كَانَ مِنَ الصُّدُوقِينَ ^۷

ترجمہ: ”اور جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگائیں، اور ان کے پاس خود ان کے سوا اور کوئی کواہ نہ ہوں، تو ان میں سے کسی ایک شخص کی کواہی یہ ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر یہ کہے کہ بے شک وہ (اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگانے میں) سچوں میں سے ہے ^{۱۰} اور پانچویں بار یہ کہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو ^{۱۰} اور عورت سے حدِ زنا اس طرح دور ہو سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ بے شک وہ (یعنی اس کا خاوند) ضرور جھوٹوں میں سے ہے ^{۱۰} اور پانچویں بار یہ کہے کہ اس پر اللہ کا غضب نازل ہو اگر وہ (خاوند) سچوں میں سے ہو ^{۱۰} (النور: 6 تا 9)

(حدیث مبارک میں ہے:

عن ابن عباس رضي الله عنهما: أن هلال بن أمية قذف امرأته عند النبي ﷺ بشريك بن سحماء، فقال النبي ﷺ: "البينة أو حد في ظهرك" فقال: يا رسول الله، إذا رأي أحدنا على امرأته رجلاً، ينطلق يلتمس البينة؟ فجعل يقول: "البينة والا؟ حد في ظهرك"۔ فذكر حديث اللعان۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہلال بن امیہ نے اپنی بیوی پر شریک بن سحماء کے ساتھ زنا کی تہمت لگائی (اور نبی ﷺ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا) تو نبی ﷺ نے فرمایا: تم کو وہ پیش کرو، ورنہ تمہاری پیٹھ پر حد قذف کے کوڑے لگائے جائیں گے، اس نے کہا: یا رسول اللہ! جب ہم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کیساتھ کسی اجنبی شخص کو حالت گناہ میں دیکھے، تو کیا وہ کوہوں کو تلاش کرنے چل پڑے گا؟، آپ نے پھر یہی فرمایا کہ تم کوہوں کو پیش کرو ورنہ تمہاری پیٹھ پر حد قذف لگائی جائے گی، پھر ”لعان“ کے احکام نازل ہوئے، (صحیح بخاری، جلد نمبر 2، رقم الحدیث: 2671، مطبوعہ مکتبہ عصریہ، بیروت)۔“

امام مسلم حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے لعان جاری کرنے سے پہلے شوہر کو (ان الفاظ کے ساتھ) نصیحت و تذکیر فرمائی: اِنَّ عَذَابَ الدُّنْيَا اَهْوَنُ مِنْ عَذَابِ الْآخِرَةِ، كَمَا لَا وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ مَا كَذَبْتَ عَلَيْهِ ثُمَّ دَعَاهُمْ عِظَاهَا وَذَكَرَهَا وَاخْبَرَهَا اَنَّ عَذَابَ الدُّنْيَا اَهْوَنُ مِنْ عَذَابِ الْآخِرَةِ۔

ترجمہ: ”دنیا کی سزا (حد قذف) آخرت کے عذاب کے مقابلے میں معمولی ہے، اس شخص نے کہا: قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں نے اس پر جھوٹی تہمت نہیں لگائی۔ پھر آپ نے اس عورت کو بلایا اور اس کو وعظ و نصیحت کی (یعنی عذاب آخرت سے ڈرایا) اور فرمایا: دنیا کی سزا (حد زنا) آخرت کے عذاب کے

مقابلے میں بہت معمولی ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3676)۔“

لعان کا طریقہ: شوہر قاضی کے سامنے چار بار اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہے گا کہ وہ (اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگانے میں) سچا ہے، اور پانچویں بار کہے گا کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، پھر بیوی چار مرتبہ قاضی کے سامنے قسم کھا کر یہ کہے گی کہ میرا شوہر مجھ پر زنا کا الزام لگانے میں جھوٹا ہے اور پانچویں بار کہے گی کہ اگر اس کا شوہر اس پر زنا کا الزام لگانے میں سچا ہو تو اس (عورت) پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہو۔

لعان کی چند شرطیں ہیں، ان کی بابت علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:

لعان کے لئے چند شرطیں ہیں: ”(1) نکاح صحیح ہو، اگر اس عورت سے اس کا نکاح فاسد ہوا اور تہمت لگائی ہو، تو لعان نہیں (2) زوجیت قائم ہو، خواہ دخول ہوا ہو یا نہیں لہذا اگر تہمت لگانے کے بعد طلاق بائن دینے کے بعد تہمت لگائی یا زوجہ کے مرجانے کے بعد، تو لعان نہیں اور اگر تہمت کے بعد رجعی طلاق دی یا رجعی طلاق کے بعد تہمت لگائی ہو، تو لعان ساقط نہیں (3) دونوں آزاد ہوں (4) دونوں عاقل ہوں (5) دونوں بالغ ہوں (6) دونوں مسلمان ہوں (7) دونوں ناطق ہوں یعنی ان میں کوئی کونگاہ نہ ہو (8) ان میں کسی پر حد قذف نہ لگائی گئی ہو (9) مرد نے اپنے اس قول پر کواہ نہ پیش کئے ہوں (10) عورت زنا سے انکار کرتی ہو اور اپنے کو پارسا کہتی ہو اصطلاح شریعت میں پارسا اس کو کہتے ہیں جس کے ساتھ وطی حرام نہ ہوئی ہو نہ وہ اس کے ساتھ متہم ہو لہذا طلاق بائن کی عدت میں اگر شوہر نے اس سے وطی کی اگرچہ وہ اپنی نادانی سے یہ سمجھتا تھا کہ اس سے حلال ہے تو عورت عقیقہ نہیں یوں ہی اگر نکاح فاسد کر کے اس سے وطی کی تو عفت جاتی رہی یا عورت کی اولاد ہے جس کے باپ کو یہاں کے

لوگ نہ جانتے ہوں اگرچہ حقیقتاً وہ ولد الزنا نہیں ہے یہ صورت مُتَّہَم ہونے کی ہے اس سے بھی عفت جاتی رہتی ہے اور اگر وطی عارضی سبب سے حرام ہو، مثلاً حیض و نفاس وغیرہ میں (جن میں وطی حرام ہے) وطی کی، تو اس سے عفت نہیں جاتی (11) صریح زنا کی تہمت لگائی ہو یا اس کی جو اولاد اس کے نکاح میں پیدا ہوئی اس کو یہ کہتا ہو کہ یہ میری نہیں یا جو بچہ عورت کا دوسرے شوہر سے ہے اس کو کہتا ہو کہ یہ اس کا نہیں (12) دارالاسلام میں یہ تہمت لگائی ہو (13) عورت قاضی کے پاس اس کا مطالبہ کرے (14) شوہر تہمت لگانے کا اقرار کرتا ہو یا دوسرے کو اہوں سے ثابت ہو۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ: اگر مسلمان مرد کی بیوی اہل کتاب میں سے ہے، تو اس پر لعان جاری نہیں ہو سکتا، (بہار شریعت جلد: 1، ص: 943، 944، مطبوعہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز)۔

عن نافع: ان ابن عمر رضی اللہ عنہما أخبرہ: ان رسول اللہ ﷺ فرق بین رجل وامرأة قلنہا وأحلفہما۔

ترجمہ: ”نافع کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے انہیں خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگانے والے مرد اور عورت دونوں کو قسم دلائی اور پھر ان کے درمیان تفریق فرمادی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5313)۔“

لعان کے بعد زوجین کے درمیان از خود تفریق نہیں ہوتی بلکہ لعان کے بعد وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی، لیکن نکاح سے خارج نہیں ہوگی بلکہ لعان کے بعد حاکم اسلام یا قاضی ان کے درمیان تفریق کرے گا۔

علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں: یفسد مالک و الشافعی ومن تبعہما الی ان الفرقة تنقع بنفس اللعان قال مالک وغالب اصحابہ بعد فراغ المرأة وقال

الشافعي واتباعه وسحنون من المالكية بعد فراغ الزوج وقال الثوري
وابو حنيفة واتباعهما لا تقع الفرقة حتى يوقعها عليهما الحاكم وعن احمد
روايتان۔

ترجمہ: ”امام مالک، امام شافعی اور ان کے موافقین کا یہ نظریہ ہے کہ نفس لعان سے
لعان کرنے والوں کے درمیان از خود تفریق واقع ہو جاتی ہے، امام مالک اور ان
کے اکثر اصحاب کا قول یہ ہے کہ عورت کے لعان سے فارغ ہونے کے بعد تفریق ہو
جاتی ہے اور امام شافعی، اور ان کے پیروکار اور امام مالک کے مقلدین میں سے
سحون کا قول یہ ہے کہ شوہر کے قسم سے فارغ ہونے کے بعد زوجین کے درمیان
فرقت لازم ہو جاتی ہے، امام سفیان ثوری، امام ابو حنیفہ اور ان دونوں کے متبعین کا قول
ہے کہ نفس لعان سے تفریق نہیں ہوتی تا وقتیکہ (لعان کے بعد) قاضی ان دونوں کے
درمیان تفریق کرے، اور امام احمد بن حنبل کے اس مسئلے میں دو قول ہیں، (یعنی ایک
قول کے مطابق احناف کے ساتھ ہیں اور دوسرے کے مطابق شوافع کے ساتھ)،
(عمدة القاری جلد 20 ص: 295 ادارة الطباعة المنیر، مصر)۔“

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: وحرّم وطؤها بعد اللعان قبل التفريق۔
ترجمہ: ”اور لعان کے بعد اگر ابھی (دونوں کے درمیان) تفریق نہ ہوئی ہو تب
بھی (شوہر کے لئے) اس عورت سے وطی حرام ہے، (اور ابن عابدین شامی نے
محرمات واسباب وطی کو بھی حرمت میں شامل کیا ہے)، (رد المحتار علی الدر المختار جلد: 5،
ص: 126، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

اس سے ثابت ہوا کہ لعان طلاق بائن کے حکم میں ہے، بیوی اگر شوہر پر زنا کا الزام
لگائے تو لعان جاری نہیں ہوگا اور نکاح قائم رہے گا، تا وقتیکہ شوہر طلاق نہ دے۔

لیکن امام ابو داؤد روایت کرتے ہیں: قال سہل: حضرت ہذا عند رسول اللہ ﷺ، فمضت السنة بعد فی المتلاعنین ان یفرق بینہما، ثم لا یجتمعان ابدا۔ ترجمہ: ”سہل کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس اس (لعان) کے موقع پر حاضر تھا، اس کے بعد (لعان کرنے والے زوجین کے بارے میں) یہ سنت جاری ہو گئی کہ ان کے درمیان تفریق کر دی جائے، پھر وہ کبھی بھی (نکاح میں) جمع نہیں ہوں گے، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: 2244)۔“

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

أی مآدام حکمہ باقیاً، فلور خرجا أو احدهما عن أهلیة اللعان له أن ینکحہا کما یأتی، وعالیہ حمل الحدیث المذكور، ولا ینافیہ قولہ ابدا کما فی قولہ تعالیٰ: انہم ان یظہروا علیکم یرجموکم او یعیدوکم فی ملتہم ولن تفلحوا اذا ابدا، (الکہف: 20)۔

ترجمہ: ”یہ دائمی تفریق اس وقت تک مؤثر ہے، جب تک اس کا حکم باقی ہے، اگر وہ دونوں یا ان میں سے ایک اہلیت لعان سے خارج ہو گیا (مثلاً شوہر اپنی بیوی پر زنا کے الزام سے رجوع کر لے تو اس پر حد قذف لگے گی) تو پھر لعان کے بعد بھی اس سابقہ بیوی سے نکاح کر سکتا ہے، (کیونکہ لعان کی بنا پر تفریق طلاق بائن کے حکم میں ہے اور طلاق بائن کے بعد باہمی رضا مندی سے دونوں میں نکاح ہو سکتا ہے)، اور آگے چل کر شامی نے آیت قرآنی سے استدلال کیا ہے کہ کلمہ ”ابدا“ ہمیشہ قطعی دائمی کے حکم میں نہیں ہوتا، (رد المحتار علی الدر المختار، جلد: 5، ص: 119 دار احیاء اراث العربی، بیروت)۔“

زید نے ایک مطلقہ عورت سے شادی کی اس عورت کی پہلے خاوند سے اولاد (لڑکی) ہے اور زید کی بھی (پہلی بیوی سے) اولاد ہے، اب زید (اپنی پہلی بیوی کے) بیٹے کا نکاح اس عورت کی بیٹی سے کرنا چاہتا ہے۔ آیا شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں یہ نکاح درست ہے یا نہیں؟، (قاری محمد زمان چشتی، مدرس: دارالعلوم نعیمیہ)۔

جواب:

صورتِ مسئلہ میں برصدق بیان سائل یہ نکاح جائز ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: لا بأس بان يتزوج الرجل امرأة ويتزوج ابنه ابنتها أو أمها كذا في محيط السر حسی۔

ترجمہ: ”کسی شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا اور اس شخص کے لڑکے نے عورت کی لڑکی سے نکاح کیا جو اس عورت کے پہلے شوہر سے تو حرج نہیں، یونہی اگر لڑکے نے عورت کی ماں سے نکاح کیا جب بھی یہی حکم ہے (بشرطیکہ حرمتِ نکاح کی اور کوئی وجہ نہ ہو)، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 277، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

مفتی محمد نور اللہ نعیمی ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: اگر صورتِ سوال صحیح اور واقعی ہے تو یہ نکاح کرنا یقیناً روا ہے، قرآن کریم میں ہے: و احل لکم ما وراء ذالکم، فتاویٰ عالمگیری، جلد: 2، ص: 6 میں محیط سر حسی سے ہے اور بحر الرائق، جلد: 3، ص: 98، درمختار، شامی جلد: 2، ص: 383 میں بحر الرائق اور فتاویٰ خیر یہ سے ہے و النظام من الدر و اما بنت زوجة ابیه او ابنه فحلال بحر الرائق میں اضافہ فرمایا: وقد تزوج محمد بن الحنفیہ امرأة وزوج ابنه بنتها، سب عبارات کا

حاصل یہ ہے کہ یہ نکاح کرنا حلال ہے اور اہل بیت کرام میں بھی ہوا، حضرت مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے امام محمد بن حنفیہ نے ایک عورت سے نکاح کیا اور اسی عورت کی بیٹی کا نکاح اپنے بیٹے سے کرادیا اپنی بیوی کی لڑکی اپنے صاحبزادے کو نکاح کر دی، (فتاویٰ نور، جلد: 2، ص: 433، مطبوعہ: بصیر پورا و کاڑھ)۔“

حقیقی بھائی کی رضاعی بہن سے نکاح

سوال: 98

ایک بچے نے ایک عورت کا دودھ پیا۔ اس بچے کے بڑے بھائی کا رشتہ اس عورت کی لڑکی سے آیا ہے کیا یہ شادی ہو سکتی ہے۔ پرانے مہربانی اس بات کی شرعی تصدیق فرما دیجئے کہ یہ شادی جائز ہے یا نہیں؟، (تحسین، مکان نمبر 2-65 قصبہ موڑ، کراچی)۔

جواب :

صورتِ مسئلہ میں برصدق بیانِ سائل جس بچے نے عورت کا دودھ دیا
رضاعت (یعنی ڈھائی سال کی عمر تک) پیا تو اس بچے کی رضاعت ثابت ہے اور اس
عورت کی تمام اولاد خواہ وہ دودھ پلانے سے پہلے کی ہو یا بعد کی اس شوہر سے ہوں
یا دوسرے شوہر سے وہ سب اس دودھ پینے والے کے لئے رضاعی بہن بھائی ہو گئے
اور ان میں سے کسی کی شادی اس دودھ پینے والے سے نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے
دوسرے بھائی بہن جنہوں نے اس عورت کا دودھ نہیں پیا اس سے رضاعت کا کوئی
رشتہ نہیں ہے۔ لہذا ان کے آپس میں نکاح جائز ہیں۔

علامہ علاؤ الدین حنفی لکھتے ہیں:

(وتمحل اخوت اخيه رضاعا)-----كأن يكون لـ اخيه رضاعا اخوت

نسباً و بہماً۔

ترجمہ: ”حقیقی بھائی کی رضاعی بہن یا رضاعی بھائی کی حقیقی بہن یا رضاعی بھائی کی رضاعی بہن سے نکاح جائز ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار: جلد: 4، ص: 301، دار احیاء التراث العربی، بیروت)“

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ: زید بکر کا چچا زاد بھائی ہے اور رضاعی بھی زید کے صرف ایک حقیقی چھوٹا بھائی ہے اور بکر کے ایک چھوٹا بھائی اور ایک بہن جو کہ حقیقی ہیں اور بکر کی بہن دونوں بھائیوں سے چھوٹی ہے تو زید کے چھوٹے بھائی کا نکاح بکر کی چھوٹی بہن سے جائز ہے یا نہیں؟، چونکہ زید اور بکر آپس میں رضاعی بھائی ہیں۔

جواب میں لکھتے ہیں: بکر نے اگر زید کی ماں کا دودھ پیا ہے تو زید اور اس کا بھائی بکر کے بھائی ہوئے نہ کہ خواہر بکر کے اور اگر زید نے بکر کی ماں کا دودھ پیا ہے تو زید خواہر بکر کا بھائی ہو نہ کہ زید کا بھائی بہر حال زید کے بھائی اور بکر کی بہن میں نکاح جائز ہے لفقولہم تسجل اغت اغیہ رضاعاً (فقہاء کے قول کے مطابق بھائی کی رضاعی بہن حلال ہے)، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ رضویہ، جلد: 11، ص: 279، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

لا علمی میں بہن بھائی کا نکاح

سوال: 99

کچھ دن پہلے ہمارے محلے میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ہمارے محلے میں ایک لڑکی کی شادی ہو کر آئی، شادی کے چھ ماہ بعد ان دونوں کو پتہ چلا کہ وہ آپس میں بہن بھائی ہیں، جو تین سال کی عمر میں نکچڑ گئے تھے، یہ بات معلوم

ہوتے ہی لڑکی نے خودکشی کر لی، جبکہ لڑکا وہی چلا گیا اور وہیں شفٹ ہو گیا تا کہ یہاں شرمندگی نہ ہو۔ اب ایسے میں اسلام کیا کہتا ہے، کیا وہ لڑکا گنہگار ہے یا نہیں؟، (نبیل بھٹی، لاڑکانہ)۔

جواب:

صورت مذکورہ میں وہ لڑکا یا لڑکی شرعاً گناہ گار نہیں ہیں، اگر انہیں نکاح کے وقت اس کا علم نہیں تھا، تاہم اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتے رہیں لڑکی کا خودکشی کرنا شرعاً فعل حرام ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عفو و مغفرت کی دعا کرتے رہنا چاہئے۔ البتہ اگر نکاح کرانے والوں اور شرکاء مجلس نکاح کوان دونوں کے اس بھائی بہن کے رشتے کا علم تھا، اور انہوں نے اسے حلال جان کر کیا تو کفر ہے، توبہ کریں اور تجدید ایمان و تجدید نکاح کریں، اور اگر اسے حرام قطعی جانتے ہوئے کیا تو وہ سب فاسق و فاجر ہیں، توبہ کریں اور اللہ کے غضب سے ڈریں۔ اور اگر نکاح کرانے والوں اور شرکاء مجلس نکاح کو بھی اس رشتے کا علم نہیں تھا تو پھر وہ سب بھی عند اللہ معذور ہیں، بہر حال اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتے رہیں اور معافی مانگتے رہیں۔ باقی نکاح کرنے والا بھائی چونکہ بہن کے رشتے سے لاعلم تھا، اس لئے معاشرے کو چاہئے کہ جو عند اللہ معذور ہو، اسے ملامت نہ کریں۔

تحلیل شرعی کے لئے زوج غیر کے ساتھ نکاح صحیح ضروری ہے

سوال: 100

ایک لڑکی ”ک“ کا نکاح بنام ”الف“ سے ہوا۔ شادی کے تقریباً سات سال بعد اس کے خاوند نے ”ک“ اس کو تحریری طور پر تین طلاقیں دے دیں اور حق مہر وعدت کے تمام واجبات ادا کر دیئے۔ ایک سال کے بعد دونوں میں مفاہمت کے

امکانات پیدا ہو گئے اور ”تخلیل شرعی“ کے لئے راضی ہو گئے۔ جس کے لئے ایک شخص ”ش“ سے غیر مشروط طور پر نکاح کر لیا، نکاح لڑکی کے والد نے پڑھایا، صرف لڑکی کی والدہ موجود تھی اور کوئی گواہ نہیں تھا، اس شخص یعنی ”ش“ نے ازدواجی تعلقات بھی تین مرتبہ قائم کئے، لیکن اس نکاح کو پوشیدہ رکھا گیا اور ایک ماہ بعد اپنی مرضی سے بغیر کسی دباؤ یا شرط، اس نے ”ک“ کو فون پر اس کے والد کے روبرو تین طلاق دے دیں اور لڑکی نے عدت بھی مکمل کر لی۔ اب لڑکی ”ک“ دوبارہ اپنے سابقہ شوہر ”الف“ سے نکاح کرنا چاہتی ہے۔ اب دریافت یہ کرنا ہے کہ آیا تخلیل شرعی کے لئے کیا گیا نکاح درست ہو یا نہیں؟ اور اب ”ک“ اپنے سابقہ شوہر ”الف“ سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟، (ایم یاسین عابد قریشی، ناظم آباء کراچی)۔

جواب :

نکاح کا اعلانیہ طور پر ہونا، نکاح کے مستحبات میں سے ہے، اور دو گواہوں کی موجودگی میں ہونا شرائط نکاح میں سے ہے، جیسا کہ اعلان نکاح کے حکم میں حدیث مبارکہ میں ہے: عن عائشة رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت: قال رسول اللہ ﷺ: اعلنوا هذا النکاح واجعلوه فی المساجد واضربوه علیہ بالدفوف۔ ترجمہ: ”حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگو! نکاح کا اعلان کیا کرو (یعنی اس کی تشہیر کیا کرو) اور مسجدوں میں نکاح کیا کرو اور اس کی تشہیر کے لئے دف بجایا کرو، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1089)۔“

نکاح کے منعقد اور صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ دو مسلمان گواہوں کے سامنے مجلس نکاح میں ایجاب و قبول کیا جائے، امام اعظم ابو حنیفہ، امام احمد اور امام شافعی رحمہم اللہ کا یہی

مسک ہے، اور ان ائمہ ثلاثہ کی دلیل یہ حدیث ہے: عن ابن عباس ان النبی ﷺ قال: البغایا اللاتی ینکحن انفسهن بغیر بینة۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: بدکار عورتیں وہ ہیں جو بغیر گواہوں کے اپنا نکاح کرتی ہیں، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1103)۔“

شیخ الاسلام برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر الفرغانی لکھتے ہیں: ولا ینعقد نکاح المسلمین الا بحضور شاهدين حریین عاقلین بالغین أو رجل وامرأتین۔
ترجمہ: ”مسلمانوں کا نکاح منعقد نہیں ہوتا جب تک وہاں دو آزاد عاقل و بالغ مسلمان مرد گواہ یا ایک مرد اور دو عورتیں بطور گواہ موجود نہ ہوں۔“ اس کی شرح میں علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں: أما اشتراط الشهادة فلقوله عليه السلام ”لا نکاح الا بشهود“

ترجمہ: ”پس شہادت (گواہوں) کی شرط نبی کریم ﷺ کے اس قول کے مطابق لگائی گئی ہے کہ ”گواہوں کے بغیر نکاح (منعقد) نہیں“، (فتح القدیر مع ہدایہ، جلد 3، ص: 190, 191 مطبوعہ: مرکز اہلسنت برکات رضا، کجرات، ہند)۔“

علامہ سرحسی حنفی لکھتے ہیں: ہمیں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث پہنچی ہے کہ ”لا نکاح الا بشہود۔ (گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا)“ اور ہمارے علماء (حنفیہ) اسی حدیث پر عمل کرتے ہیں اور امام مالک، ابن ابی لیلیٰ، اور عثمان ہشتی رحمہم اللہ یہ کہتے ہیں کہ نکاح میں گواہ شرط نہیں بلکہ اعلان شرط ہے حتیٰ کہ بچوں اور مجنونوں کے سامنے بھی نکاح کا اعلان کر دیا تو نکاح درست ہوگا اور اگر گواہوں کو یہ حکم دیا کہ وہ گواہی ظاہر نہ کریں تو نکاح درست نہیں ہوگا، (المبسوط، جلد 5، ص: 31، مطبوعہ: دارالمعرفۃ، بیروت)۔“

صحیح نکاح کے لئے کواہوں کا ہونا شرط ہے، یعنی دو آزاد عاقل و بالغ مسلمان مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا ضروری ہے، اور مذکورہ صورت میں لڑکی کے والد نے نکاح پڑھایا اور کواہ کی صورت میں صرف ایک عورت (یعنی لڑکی کی والدہ) موجود تھی، کواہی کا نصاب مکمل نہیں، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: لان النکاح بغیر شہود فاسد لا باطل۔

ترجمہ: ”کواہوں کے بغیر نکاح فاسد ہے باطل نہیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 26، ص: 28، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“

سوال میں بیان کردہ صورت سے واضح ہے کہ دوسرا نکاح ”ش“ سے تحلیل شرعی کی غرض سے پڑھایا گیا اور تحلیل شرعی کی بابت امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز درمختار (جلد 5 ص: 34 تا 36، مطبوعہ بیروت) کی ایک عبارت کی تلخیص فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: ”درمختار میں ہے: لا ینکح مطلقۃ بالثلاث حتی یطأھا غیرہ ینکح نافذ خرج الفاسد والموقوف، ترجمہ: ”تین طلاقیں سے مُطلقہ عورت سے دوبارہ اس وقت تک نکاح نہیں ہو سکتا، جب تک دوسرا خاوند (شرعی طور پر) نافذ (اور مؤثر صحیح) نکاح کے ساتھ اس عورت سے جماع نہ کر لے، صحیح اور نافذ نکاح کی قید سے نکاح فاسد اور نکاح موقوف خارج ہو گیا، (فتاویٰ رضویہ، جلد 12، ص: 423، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“

صورت مذکورہ بالا میں جب نکاح صحیح طور پر منعقد ہی نہیں ہوا تو وہ عورت طلاق کا محل ہی نہیں بنی، لہذا طلاق کیسے مؤثر ہوگی؟، اور اس سے شوہر اول کے لئے حلت کیسے ثابت ہوگی؟۔ اس خاتون، اور اس کے ساتھ نکاح فاسد میں شریک شخص اور دیگر شرکاء معاملہ سب کو اللہ تعالیٰ سے تو بہ کرنی چاہئے۔ اور ”تحلیل شرعی“ اب بھی

از روئے قرآن ”زوج غیر“ کے ساتھ غیر مشروط نکاح اور پھر اس کا اپنی مرضی سے طلاق دینا اور عدت کا گزر جانا ضروری ہے۔

عنین کا حکم

سوال: 101

12 مئی کو میرے چھوٹے بھائی نوید کی شادی ہوئی لیکن شادی کے بعد سے اب تک وہ اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات استوار نہیں کر سکا لڑکی والوں کا کہنا ہے کہ اب لڑکی کی شادی لڑکے کے بڑے بھائی سے کر دی جائے اور وہ اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ لڑکی والے ہم کو وقت دیں تاکہ ہم اس کا علاج کروا سکیں لیکن لڑکی والے اس کے لئے تیار نہیں ہو رہے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ اس صورت میں کیا کرنا ہوگا؟ عدت سے متعلق کیا حکم ہے؟ اور کیا یہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟، (جاوید، اورنگی، کراچی)۔ میری بیٹی کی شادی 12 مئی کو ہوئی اور لڑکا حق زوجیت ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس صورت میں ہم اس کے بھائی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ آیا عدت کرنا ہوگی یا کوئی کفارہ ہوگا؟، (محمد شریف، اورنگی، کراچی)۔

جواب:

جو شخص اپنی بیوی کے ازدواجی حقوق ادا کرنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اسے اصطلاح فقہ میں ”عنین“ کہتے ہیں۔

عبدالرزاق عن معمر عن الزہری عن سعید بن المسیب قال: قضی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فی الذی لا یتطیع النساء ان یؤجل سنة قال معمر: وبلغنی انه یؤجل سنة من یوم ترفع امرها۔

ترجمہ: امام عبدالرزاق اپنی سند کے ساتھ سعید بن مسیب سے روایت فرماتے ہیں:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایسے شخص کے بارے میں کہ جو اپنی عورت پر (جماع کی) قدرت نہ رکھتا ہو، کے بارے میں فیصلہ فرماتے کہ اس کو ایک سال کی مدت دی جائے، معمر فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی کہ اس کو ایک سال کی مدت اس روز سے دی جائے گی کہ جس دن یہ معاملہ قاضی کے پاس پہنچا، (مصنف عبدالرزاق، رقم الحدیث: 10720)۔“

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

عورت بے موت یا طلاق جدا نہیں ہو سکتی اگرچہ مرد نامرد ہو، ہاں چارہ کار حاکم شرعی کے یہاں دعویٰ ہے، وہ اس ثبوت لینے کے بعد کہ مرد اس پر قادر نہ ہو، مرد کو ایک سال کی کامل مہلت دے کہ اپنا علاج کرے، اس سال میں عورت مرد سے جدا نہ رہے اگر سال گزر جائے، اور اب بھی قادر نہ ہو، عورت پھر دعویٰ کرے اور حاکم پھر ثبوت لینے کے بعد عورت سے پوچھے کہ تو اپنے شوہر کے پاس رہنا چاہتی ہے یا اپنے نفس کو اختیار کرتی ہے، اگر عورت فوراً بلا تاخیر کہہ دے کہ میں نے اپنے نفس کو اختیار کیا، تو حاکم ان میں تفریق و جدائی کر دے، یہ تفریق طلاق ہوگی، اور اب بعد عدت عورت دوسرے سے نکاح کر سکے گی ورنہ نہیں، یہ حکم عورت کی جانب ہے، رہا مرد، اسے حکم شریعت ہے کہ جب وہ عورت کا حق ادا نہیں کر سکتا تو اس پر فرض ہے کہ عورت کو طلاق دے دے، نہ دے گا تو گنہگار و مستحق عذاب ہوگا۔ واللہ اعلم، (فتاویٰ رضویہ، جلد: 12، ص: 488)۔“

سوال میں بیان کردہ واقعات اگر درست ہیں، تو شوہر کو چاہئے کہ اپنی بیوی کو فی الفور طلاق دے دے، ورنہ وہ گنہگار ہوگا اور مستحق عذاب ہوگا اور شوہر کے گھر والوں کو چاہئے کہ وہ اسے برضا و رغبت طلاق دینے پر آمادہ کریں، اگر وہ اس کے باوجود طلاق

دینے پر آمادہ نہ ہو تو پھر بیوی عدالت سے رجوع کرے اور عدالت شوہر کو ایک سال کا وقت دے، اگر وہ اس ایک سال کے دوران اپنی اہلیت مباشرت ثابت نہ کر سکے تو عدالت نکاح فسخ کر دے گی اور عدت گزرنے کے بعد عورت آزاد ہوگی، جہاں چاہے اپنی مرضی سے نکاح کر سکتی ہے۔

ہمیں حرمتِ مصاہرت سے متعلق دو سوالات موصول ہوئے

ترتیب وار عرض خدمت ہیں۔

حرمتِ مصاہرت زنا سے بھی ثابت ہوتی ہے

سوال: 102

میں ایک رات جلسے میں شرکت کرنے کے بعد کافی دیر سے گھر آیا تو سب گھر والے سو چکے تھے، میں اپنے کمرے میں داخل ہوا اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے لائٹ لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ معمول کے مطابق میری چارپائی کے ساتھ بیوی کی چارپائی ہوتی ہے۔ مجھے کچھ خواہش ہوئی جس کی وجہ سے میں نے اپنا ہاتھ بیوی کی طرف بڑھایا اور میں نے اس کے سینے پر ہاتھ پھیرا، بعد ازاں قمیص کے اندر بھی ہاتھ داخل کیا تو اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ میری بیوی نہیں ہے۔ میں نے لائٹ لگائی تو فی الواقع وہ میری بیوی نہ تھی بلکہ میری ساس تھی جو بیوی کی جگہ لیٹی ہوئی تھی اور ساتھ میں میری بچی بھی سو رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے فوراً توبہ واستغفار کیا۔ میں نے حنفی علماء کرام سے اس مسئلے کی بابت دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ تمہاری بیوی اب تم پر حرام ہے۔ خدا را آپ اس مسئلے کو مفصل و مدلل تحریر فرما کر میری پریشانی کا شافی حل بتائیے۔ میرے سب رشتے دار بڑے غصے میں ہیں، جو بھی حکم از روئے قرآن وحدیث ہے اس سے ہمیں اپنے فتویٰ کے ذریعے آگاہ فرمائیے، (محمد عبدالرحمن، بنوں، صوبہ سرحد)۔

جواب :

وہ عورتیں، جن سے نکاح حرام ہے، ان کو 9 قسم پر منقسم کیا جاتا ہے، جس میں ایک قسم حرمتِ مصاہرت ہے، مرد و عورت ایک دوسرے کو شہوت سے چھوئیں یا ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھیں، تو عورت کے اصول و فروع مرد پر حرام ہو جائیں گے۔ اور مرد کے اصول و فروع عورت پر حرام ہو جائیں گے، اس کو حرمتِ مصاہرت کہتے ہیں۔ یہ حرمت ہمیشہ کے لئے ہوگی، اس کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَأَمَّا نِسَاءُكُم مِّنَ النَّسَاءِ الَّتِي فِي حُجُورِكُم مِّن نِّسَاءِكُمُ الَّتِي دَخَلْتُم بِهِنَّ**۔

ترجمہ: ”(اور تم پر حرام کی گئی ہیں) تمہاری بیویوں کی مائیں، اور تمہاری ان بیویوں کی بیٹیاں جن سے تم صحبت کر چکے ہو، (النساء: 23)۔“

قرآن کریم نے ان عورتوں کو بھی حرام کیا ہے، جن کی ماں کے ساتھ نکاح کر کے یا بغیر نکاح و طی کر لی گئی ہو اور شہوت کے ساتھ چھونا بھی و طی کے حکم میں ہے، شہوت کے ساتھ چھونے سے بھی حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے، اس کے بارے میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: **و كما ثبت هذه الحرمة بالوطء ثبت بالمس والتقبيل والنظر الى الفرج بشهوة كذا في الذخيرة**۔

ترجمہ: ”حرمتِ مصاہرت، جس طرح و طی (مباشرت) سے ثابت ہوتی ہے، اسی طرح شہوت کے ساتھ چھونے، بوسہ لینے اور فرج (شرمگاہ) کی طرف نظر کرنے سے بھی ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ ”ذخیرہ“ میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 274-275، مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (ولا فرق فيما ذكر وبين اللمس والنظر

بشهوة بين عمد ونسيان وخطاء واكراه۔

ترجمہ: ”کسی عورت کو شہوت کے ساتھ چُھوا، یا (شرمگاہ کو نظرِ شہوت) دیکھا حرمت ثابت ہو جائے گی، اگرچہ یہ کام جان بوجھ کر کیا ہو، بھولے سے ہو، غلطی سے ہو یا زیرِ دستی کرایا گیا ہو، ہر صورت میں حرمت ثابت ہو جائے گی، (رد المحتار علی الدر المختار، فصل فی الحُرّمات، جلد 2 ص: 306 مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ثم لا فرق فی ثبوت الحرمة بالحس بین كونه عامدا أو ناسيا أو مكرها أو مخطئا كذا فی فتح القدیر۔

ترجمہ: ”پھر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کا چُھونا، خواہ (یہ فعل) جان بوجھ کر ہو، یا بھول کر ہو یا اس سے زیرِ دستی کرایا گیا ہو یا غلطی سے ہوا ہو، ہر صورت حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جائے گی، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 274، مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

لہذا جب بیوی کی ماں کو شہوت سے چھولیا تو بیوی اسی وقت حرام ہوگئی اور بیوی کی ماں تو پہلے سے ہی حرام تھی، اب دونوں ماں بیٹی ہمیشہ کے لئے حرام ہو گئیں کہ ان سے نکاح کی کوئی صورت نہیں ہے۔ متار کہ کے بعد عورت کو اختیار ہے کہ اس شخص کے سوا جس سے چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ متار کے کا طریقہ یہ ہے کہ شوہر دو گواہوں کے سامنے کہے ”میں نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا وہ جس سے چاہے نکاح کر سکتی ہے“۔ متار کہ کے بعد عدت شروع ہوگی۔

سوال: 103

میری خالہ دیہی سے آئی ہیں اور اپنی سگی بہن (میری والدہ) کے گھر پر ٹھہری ہیں۔ میری خالہ کی ایک بیٹی ہے، میری امی نے خالہ سے میرے بھائی کے لئے ان کی بیٹی کا رشتہ کر لیا نکاح کے چھ سات مہینے باقی تھے اسی دوران خالہ اور بھانجے میں

صحبت (زنا) ہوگئی۔ لیکن بھائی اور خالہ نے ہمیں کچھ بھی نہیں بتایا۔ خالہ بہت پرہیز گار اور پانچ وقتہ نمازی ہے۔ خالہ کی عمر 32 سال ہے اور بھائی کی عمر 18 سال ہے۔ ہمیں تو کچھ بھی نہیں پتا تھا سات مہینے بعد جب لڑکی کے ابو دہی سے آئے تو ہم سب نے مل کر منگنی اور نکاح کر دیا لیکن رخصتی نہیں ہوئی تھی نکاح کے بعد لڑکی اور لڑکے کا آمنا سامنا تھا نکاح کے تین مہینے بعد لڑکا نے لڑکی سے صحبت کر لی۔ اسی دوران لڑکا اور لڑکی کی آپس میں لڑائی ہوگئی ماموں کے حوالے سے تو لڑکے نے غصے میں آ کر کہا ”میں تمہیں تین طلاقیں دیتا ہوں اگر تم ماموں کے سامنے گئی تو“ طلاق دینے کے بعد کہا کہ تمہیں سمجھ میں آئی کہ میں نے کیا کہا تیسری دفعہ بھی یہی کہا۔ میری خالہ نے خالو کو میرے بھائی کے ساتھ زنا کی بات بتادی اور طلاق والی بات بھی بتادی، خالو نے غصے میں بیٹی کو ماموں کا سامنا کرا دیا، کیا طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟، (ایک سائل، کراچی)۔

جواب :

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعُمَّتُكُمْ وَأَخْلَتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُم مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُم مِّن نِّسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُم بِهِنَّ۔

ترجمہ: ”تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمہاری رضاعی (دودھ شریک) بہنیں، اور تمہاری بیویوں کی مائیں، اور تمہاری ان بیویوں کی بیٹیاں جن سے تم صحبت کر چکے ہو، (النساء: 23)۔“

وہ عورتیں، جن سے نکاح حرام ہے، ان کو 9 قسم پر منقسم کیا جاتا ہے، وہ اسباب جن کے سبب نکاح حرام ہے ان میں ایک قسم نسب ہے، محرمات نسبہ میں مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں اور بھانجیاں شامل ہیں، ان سے نکاح کرنا، صحبت کرنا اور کسی قسم کا کوئی بھی شہوانی عمل کرنا دائمًا حرام ہے۔

دوسرا سبب حرمت مصاہرت ہے، یعنی مرد و عورت ایک دوسرے کو شہوت سے چھوئیں یا ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھیں، تو عورت کے اصول و فروع مرد پر حرام ہو جائیں گے۔ اور مرد کے اصول و فروع عورت پر حرام ہو جائیں گے، اس کو حرمت مصاہرت کہتے ہیں۔ یہ حرمت ہمیشہ کے لئے ہوگی، اس کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ قرآن کریم نے ان عورتوں کو بھی حرام کیا ہے، جن کی ماں کے ساتھ نکاح کر کے یا بغیر نکاح و طہ کر لی گئی ہو یا انہیں شہوت کے ساتھ چھوا، شہوت کے ساتھ چھونے سے بھی حرمت مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے، اس کے بارے میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: **وَكَمَا تَثْبُت هَذِهِ الْحَرَمَةُ بِالرَّطْبِ تَثْبُت بِالْمَسِّ وَالتَّقْبِيلِ وَالنَّظَرِ إِلَى الْفَرْجِ بِشَهْوَةٍ كَذَا فِي الذَّخِيرَةِ۔**

ترجمہ: ”حرمت مصاہرت، جس طرح و طہ (مباشرت) سے ثابت ہوتی ہے، اسی طرف شہوت کے ساتھ چھونے، بوسہ لینے اور فرج (شرمگاہ) کی طرف نظر کرنے سے بھی ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ ”ذخیرہ“ میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 275-274، مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“ اب صورت مسئلہ میں بر تقدیر صدق سائل اس کے بھائی نے خالہ سے زنا کیا اور خالہ تو پہلے ہی حرام تھی اب اس کی اولاد بھی اس پر حرام ہو گئی، اور دونوں کا آپس میں نکاح شروع ہی سے ناجائز تھا، نکاح منعقد ہی نہیں ہوا، تو طلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یعنی جب وہ

خاتون اس لڑکے کے لئے محل نکاح ہی نہیں بنتی، تو اس کے ساتھ نکاح ابتداء ہی منعقد نہیں ہو سکتا۔ پس وہ محل طلاق ہی نہیں ہے، کیونکہ طلاق تو نکاح کی بندش کو اٹھانے کا نام ہے، لہذا دونوں کو فوراً علیحدگی اختیار کر لینی چاہیے، اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہئے۔



﴿کتاب الطلاق﴾

”دلالتِ حال“ نسبتِ طلاق کے لئے کافی ہے

سوال: 104

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں تجھے طلاق دے دوں گا اور پھر کہا طلاق، طلاق، طلاق، آیا ان الفاظ سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟، (معرفت صاحبزادہ نور العارفین صدیقی، آسٹن، اولڈھم، یو۔ کے)۔

جواب:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق وقوعِ طلاق کے لئے نسبت شرط ہے اور نسبت یہ ہے کہ طلاق دیتے وقت شوہر اپنی بیوی کی زوجیت کا اظہار کرے، مثلاً یوں کہے کہ میری بیوی کو طلاق ہے یا بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہے کہ اس کو طلاق ہے یا طلاق دیتے وقت بیوی کا نام ذکر کرے، جس طلاق میں نسبت نہ ہو وہ طلاق واقع نہیں ہوگی، البتہ نسبت کا صریح لفظوں میں پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ اگر شوہر کی نیت طلاق کی ہو، تو بھی طلاق واقع ہو جائے گی۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ولا يلزم كون الاضافة صريحة في كلامه الخ۔

ترجمہ: ”کلام میں (بیوی کی طرف) نسبت کا صریح ہونا لازمی نہیں ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: لان دلالة الحال قائمة مقام النية الخ۔

ترجمہ: ”اس لئے کہ دلالتِ حال نیت کے قائم مقام ہے، (رد المحتار علی الدر المختار ج: 4، ص: 338، 339 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

نسبت معنوی کی بنا پر وقوعِ طلاق کی مثالیں کتب فقہ میں بکثرت موجود ہیں، شیخ الامام

محمد بن محمد بن شہاب المعروف ابن بزاز کردری حنفی متوفی 827ھ لکھتے ہیں: فقال لها بعد الخلع من ساعته هرسه هرسه اخاف وقوع الثلاث وان لم توجد الاضافة لانه سبق ذكر الطلاق۔

ترجمہ: ”(شوہر نے) بیوی سے خلع کے بعد اسی وقت کہا: ”تین کی تین“، (اس میں) اگرچہ (بیوی کی طرف) نسبت نہیں پائی گئی، (پھر بھی) تینوں طلاق واقع ہونے کا اندیشہ ہے، کیونکہ طلاق کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔“

اس کے بعد آگے چل کر لکھا: ”این زن کہ مراستدہ“ لایقع وقال ابو بکر العیاض ان نوى يقع وقال الورشتمی رحمه الله طلقت امرأته لانه وجدت الاضافة فی اول الكلام۔

ترجمہ: ”(شوہر نے کہا:) یہ جو میری بیوی ہے (اس کو) تین طلاق واقع ہوں، (تو طلاق) واقع نہیں ہوگی، اور ابو بکر عیاض نے کہا: (اگر شوہر نے) نیت کی ہے تو واقع ہوگی اور ورشتمی رحمه الله تعالیٰ نے کہا: اس کی بیوی کو طلاق واقع ہو جائے گی، کیونکہ ابتدائے کلام میں نسبت ہے۔“

اس سے پیشتر انہوں نے لکھا: وسئل احمد القلاسی عن وکرا امرأته فقال ”اینک ینک“ یقع طلاق ثم ذکر ثانیاً وقال ”اینک دو طلاق“ وکذا فی الروکرة الثالثة، قال تطلق ثلاثاً الخ۔

ترجمہ: ”احمد القلاسی سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو مکار کر کہا: ”اس کو ایک“ تو ایک طلاق واقع ہو جائے گی، پھر دوبارہ ذکر کیا اور کہا: ”اس کو دو طلاق“، اسی طرح تیسری بار مکار کر کہا: ”اسے تین طلاق“ تو (احمد القلاسی) نے کہا: (اس کی بیوی کو) تین طلاق واقع ہو جائیں گی، (فتاویٰ بزاز یہ بر حاشیہ فتاویٰ عالمگیری

ج: 4، ص: 179، 172 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ۔“۔

امام احمد رضا قادری سے دریافت کیا گیا: محمد مظفر کا اپنی والدہ سے جھگڑا ہو رہا تھا، اس کی والدہ نے کہا کہ اپنی بی بی کو نہ چھوڑو گے تو تم سو رکھاؤ، اسی طرح تین مرتبہ بولی، مظفر نے کہا کہ طلاق دیتے ہیں پھر اس نے بلا قصد غصہ کے ساتھ اپنی والدہ کے سامنے کہا: طلاق، طلاق، طلاق بغیر مخاطب کرنے کسی کو، اب شرعاً صورتِ مسئلہ میں مظفر کی بی بی پر طلاق پڑے گی یا نہیں؟۔

جواب میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”تین طلاقیں ہو گئیں، بے حلالہ اس کے نکاح میں نہیں آسکتی، (فتاویٰ رضویہ ج: 12، ص 359، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“۔

مولانا محمد امجد علی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک طویل سوال میں پوچھا گیا: ساس نے داماد سے کہا کہ یہ کمینہ پن ہے کوئی اپنی بیوی کو اس طرح نہیں مارتا ہے، تم یہاں سے نکل جاؤ، (شوہر نے) یہ سن کر کہا: طلاق دیا، طلاق دیا، طلاق دیا، اس وقت زید کی بیوی اپنے چچا کے مکان کے سائبان میں تھی الخ۔

اس کے جواب میں علامہ امجد علی خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا: اگرچہ زید کے ان الفاظ میں اضافت نہیں ہے اور وقوع طلاق کے لئے اضافت ضروری ہے مگر چونکہ ساس کے جواب میں کہا تھا، لہذا زید کے الفاظ کے یہی معنی متعین ہیں کہ تمہاری بیٹی کو طلاق الخ، (فتاویٰ امجدیہ، جلد: دوم، ص: 227، 228)۔

صورتِ مسئلہ میں شوہر کے کلام میں اگرچہ (بیوی کی طرف) نسبت صریحہ نہیں ہے، لیکن چونکہ پہلے شوہر نے طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، جیسا کہ خط کشیدہ

الفاظ سے ظاہر ہے، لہذا اس قرینے کے پیش نظر صورتِ مسئلہ میں نسبتِ معنوی پائی گئی اور مذکورہ خاتون کو تین طلاقیں واقع ہو گئیں۔ متکلم کی ”دلائلِ حال“ نیت کے قائم مقام ہے اور یہاں ”دلائلِ حال“، الفاظِ طلاق کی ادائیگی سے پہلے، ارادہ طلاق کا اظہار ہے۔

ازدواجی تعلقات میں کشیدگی اور طلاق

سوال : 105

میرے خاوند نے دو سال پہلے مجھے ایک طلاق دی اس کے بعد ہم نے رجوع کر لیا، پھر چھ ماہ بعد انہوں نے مجھے دوسری طلاق دی اور پھر ہم نے رجوع کر لیا اس کے چار ماہ بعد ایک بار جب پاکستان سے میرے بھائی اور بہنوئی نے مجھے موبائل پر فون کیا اور میری ان سے بات ہوئی، جب میرے خاوند گھر آئے تو انہوں نے موبائل چیک کر کے پوچھا کہ کیا آج تمہارا پاکستان سے فون آیا تھا، (میں یہ بتاتی چلوں کہ کچھ جھگڑوں کی وجہ سے دونوں خاندانوں کی بول چال بند تھی، میرے خاوند کو بالکل پسند نہیں کہ میں یا وہ فون کریں اور دوسرا یہ کہ وہ بہت شکی، اور وہی طبیعت کے مالک ہیں) خیر جب میرے خاوند نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہاری بات ہوئی ہے تمہارے گھر والوں سے میں نے کہا کہ ہاں، انہوں نے کہا کہ کس کس سے ہوئی؟ میں نے کہا کہ بھائی، بہن، امی سے ہوئی (یہ میں نے جھوٹ کہا تھا جبکہ میری بات صرف بھائی اور بہنوئی سے ہوئی تھی) پھر انہوں نے کہا کہ کیا بہنوئی سے بھی ہوئی، میں نے بات نہ واضح کرتے ہوئے کہا کہ شاید ہوئی ہو، کیونکہ مجھے ان کی طبیعت کا اندازہ تھا، انہوں نے کہا ”اچھا اگر تو گلہ کرتی تے تو میری بیوی نہیں“۔ بقول میرے خاوند کے کہ یہ الفاظ میں نے طلاق کی نیت سے استعمال نہیں کئے۔ بلکہ میرے دل میں یہ تھا

کہ بیویاں اپنے شوہروں کی اطاعت گزار ہوتی ہیں۔ اگر تم کو میری عزت کا خیال ہو تو انگلی بار تم بات نہ کرو گی۔ میں نے یہ مسئلہ جب Dues Bury England کے مفتی موسیٰ سے پوچھا! تو انہوں نے کہا کہ آپ کے شوہر سے بات کرنی پڑے گی کہ آیا ان کی نیت کیا تھی۔ پھر میرے خاوند نے کہا کہ اگر میں نے اس کو طلاق دینی ہوتی تو جس طرح پہلی دونوں بار طلاق کا لفظ استعمال کیا اب بھی کرتا۔ خیر مفتی صاحب نے اجماع کر کے کہا کہ طلاق نہیں ہوئی۔ مجھے کبھی شک پڑتا ہے کہ کیا معلوم اس وقت ان کی نیت کیا ہو۔ بہت پریشان رہتی ہوں۔ پر میرے خاوند بہت قسمیں اٹھاتے ہیں۔ اور مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ یہ پھر اس کا اور اللہ کا معاملہ ہے، اگر وہ غلط بیانی کرتا ہے۔ آپ میری صحیح رہنمائی کریں۔ میرے شوہر نے مجھ پر بہت گندے الزامات اور بہتان لگائے ہیں، اپنے گھر والوں کے کہنے پر اس کی حمایت اور تائید میرے خاوند نے بھی کی۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اب 4 ماہ سے میں نے اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کی ہوئی ہے، وہ بچوں سے ملنے آتے ہیں، پر نان نفقہ بالکل نہیں دیتے، کہتے ہیں کہ جب میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں، تو تم کیوں الگ رہتی ہو، وہ کہتے ہیں کہ کبھی مجھ کو طلاق نہیں دیں گے۔ چاہے دوسری شادی بھی کر لیں۔ اپنے خاوند کے بارے میں یہ بتاتی چلوں کہ دینی اعتبار سے ناجائز ہیں۔ اور جھوٹے اور لالچی انسان ہیں، (یا سمین، معرفت محمود احمد، مکان نمبر 558، گلی نمبر 16 مرگلہ، اسلام آباد)

جواب:

اسلامی تعلیمات کی رو سے میاں بیوی کو ازدواجی زندگی باہمی حسن سلوک اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ گزارنی چاہئے، ایک دوسرے کی خامیوں سے حتی الوسع

صرف نظر کرنی چاہئے، خاص کر شوہروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اگر تمہاری بیویاں تمہیں پسند نہ آئیں تو صبر کا مظاہرہ کرو ممکن ہے کہ اس میں تمہارے لئے کوئی بہتری ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فان كرهتموهن فعسىٰ ان تکرهوا شياء و يجعل الله فيہ خیرا کثیرا (النساء: 19)۔

ترجمہ: ”پھر اگر وہ تمہیں پسند نہ آئیں تو قریب ہے کہ کوئی چیز تمہیں ناپسند ہو اور اللہ اس میں بھلائی رکھے، اس تمہید کے بعد صورت مسئلہ میں شوہر پہلے دو طلاقیں دے چکا ہے، از روئے شرع شوہر کو مزید صرف ایک طلاق دینے کا حق ہے، آئندہ کبھی اگر شوہر نے ایک طلاق دے دی تو بیوی ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہو جائے گی۔ استفتاء میں درج پنجابی کے خط کشیدہ الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، صحیح قول کے مطابق اگر شوہر ان الفاظ سے طلاق کی نیت کرتا تو بھی طلاق واقع نہ ہوتی۔ فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 386 پر ہے:

ولو قال ”توزن من نئی“ لا يقع ان نوری وهو المختار

ترجمہ: ”اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ تو میری بیوی نہیں ہے تو طلاق واقع نہیں ہوگی، اگرچہ اس کی نیت طلاق کی ہو اور یہی مختار (مذہب) ہے۔“ لہذا نکاح باقی ہے، عورت اگر شوہر کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہو بشرطیکہ شوہر کی طرف سے کوئی زیادتی نہ ہو تو ایسی عورت کا خرچہ شوہر کے ذمہ لازم نہیں ہے، عالمگیری جلد 1 ص: 545 پر ہے:

وان نشزت فلا نفقة لها حتی تعود الی منزلہ الخ۔

ترجمہ: ”اگر عورت مرد کی نافرمانی کرے تو مرد کے ذمہ اس کا خرچہ نہیں ہے، جب تک کہ وہ واپس اپنے شوہر کے ساتھ اس کے گھر میں نہ رہے۔“

طلاق ثلاثہ کے بعد شوہر اول سے نکاح کا حکم

سوال: 106

آپ نے 18 جون کے دین و دانش ایڈیشن میں ایک سائل کے جواب میں مسئلہ طلاق کے ذیل میں بیان فرمایا کہ تین طلاقیں کے بعد عورت سابقہ شوہر سے نکاح نہیں کر سکتی اس کے علاوہ کسی بھی مرد سے نکاح کے سلسلے میں آزاد ہے، پوچھنا یہ ہے کہ اگر تینوں طلاقیں دینے کے بعد میاں بیوی اپنے فیصلے پر پشیمان ہوں، اور بچوں وغیرہ کو تباہ ہونے سے بچانے کے لئے دوبارہ گھر بسانا چاہیں تو شریعت اس کا کوئی حل پیش کرتی ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہمارے ضلع میں ایک واقعہ ہوا ہے کہ تین طلاقیں کی عدت گزرنے کے بعد اس عورت کا نکاح کسی نامعلوم مرد سے ہوا اور مباشرت کے بعد اس نے طلاق (تین بار) دے دی، اور اس کی عدت گزرنے کے بعد پھر پہلے مرد سے نکاح کر دیا گیا، کیا قرآن و سنت میں ایسے کسی طریقے کی گنجائش موجود ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو ان لوگوں اور نکاح خواں کا یہ عمل کیسا ہے اور شریعت اس پر کیا حد لگاتی ہے۔ ایسا نکاح کرنے والے امام کے پیچھے نماز ہوگی یا نہیں اور مسجد میں اسے مستقل امام مقرر کیا جائے یا نہیں؟، برائے مہربانی جلد اخبار میں جواب سے نوازیں، (رشید احمد خان، دکان نمبر 147 پرانی لکڑ منڈی، منڈی بہاؤ الدین)۔

جواب:

ہمارے حق میں کیا بہتر ہے اور کیا ہوا ہے، یہ بات ہمارا خالق و مالک رب تبارک و تعالیٰ ہم سے بہتر جانتا ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء آیت نمبر 11 میں احکام وراثت بیان کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَبَاؤُكُمْ وَ اَبْنَاؤُكُمْ لَا تَلْزَمُوْنَ اٰیْہُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ط

میرے شوہر شاہنواز احمد خان نے گھریلو پریشانیوں سے تنگ آ کر غصہ کرتے ہوئے لفظ طلاق استعمال کیا، جھگڑا اس وجہ سے شروع کیا کہ پانچ ہزار کا مطالبہ کیا یہ کہہ کر کہ میں چلا جاؤں گا اور تمہیں چھوڑ دوں گا تم نکاح کر لینا۔ میں نے کہا میرے دل میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، اس پر کہا کہ میرے دل میں تو ہے۔ 2 جون 2006ء جمعہ کی رات تقریباً ساڑھے دس بجے غصہ کرتے ہوئے کہا کہ ”میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں، میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں“، میں نے کہا کہ فرید بھائی کو فون کرتی ہوں (میرے چھوٹے جیٹھ ہیں) اور بھائی صاحب (میرے بڑے جیٹھ خورشید) کو اس پر شاہنواز نے کہا کہ ذرا سوچ سمجھ کر فون کرنا، اگر دونوں بھائی آجاتے ہیں تو ان کے سامنے تین بار کہہ کر قصہ ختم کر دیتا ہوں کہ میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں اور اپنے کپڑے وغیرہ لے کر شکیل (میرے دیور) کے ہاں چلا جاؤں گا، پھر میں نے فون نہیں کیا۔ آیا مذکورہ صورت میں کتنی طلاق واقع ہوئی ہیں؟، (ریحانہ بیگم، ماریہ پارٹمنٹ مارٹھ کراچی)۔

جواب :

صورت مسئلہ میں بر تقدیر صدق سائلہ اس کے شوہر کا یہ قول کہ ”تمہیں چھوڑ دوں گا تم نکاح کر لینا“ یہ مستقبل میں طلاق دینے کے ارادے کا اظہار ہے اور شرعاً ارادہ طلاق، طلاق نہیں ہے۔ طلاق انشاء آت میں سے ہے یعنی شوہر واضح طور پر (بصیغہ حال) کہے کہ ”میں تمہیں طلاق دیتا ہوں“، یا بصیغہ ماضی کہے ”میں نے تمہیں طلاق دی“، لہذا مذکورہ الفاظ ”تمہیں چھوڑ دوں گا تم نکاح کر لینا“ سے کوئی طلا

ق واقع نہیں ہوئی۔

پھر سائلہ کے بیان کے مطابق 2 جون، 2006ء کی شب سائلہ کے شوہر نے دو مرتبہ کہا کہ ”میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں“ ان الفاظ سے دو طلاق صریحہ واقع ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الطلاق مرتن ۛ فامساک ۛ بمعروف او تسریح ۛ باحسان ط

ترجمہ: ”طلاق (رجعی) دوبارہ ہے، پھر (عدت میں) حسن سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کے بعد) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے، (البقرہ 229)۔“ شوہر چاہے تو عدت کے اندر ایک طرفہ طور پر عقد ثانی کے بغیر رجوع کر سکتا ہے، خواہ محض زبانی کہہ دے کہ میں نے رجوع کیا یا ازدواجی تعلق قائم کر لے۔ اور اگر عدت کے اندر رجوع نہ کیا اور عدت گزر گئی تو وہ عورت اب آزاد ہے، اپنی آزادانہ مرضی سے پہلے شوہر کے ساتھ بھی عقد ثانی کر سکتی ہے اور کسی اور شخص کے ساتھ بھی نکاح کر سکتی ہے، اگر پہلے شوہر کے ساتھ عقد ثانی کیا تو آئندہ اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا اور اگر خدا نخواستہ اس نے ایک طلاق دے دی تو وہ ان پہلی دو طلاقوں کے ساتھ جمع ہو کر تین طلاقیں ہو جائیں گی اور وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی۔ سائلہ کے بیان کے مطابق ”میں نے کہا کہ فرید بھائی کو فون کرتی ہوں (میرے چھوٹے جیٹھ ہیں) اور بھائی صاحب (میرے بڑے جیٹھ خورشید) کو اس پر شاہنواز نے کہا کہ ذرا سوچ سمجھ کر فون کرنا، اگر دونوں بھائی آجاتے ہیں تو ان کے سامنے تین بار کہہ کر قصہ ختم کر دیتا ہوں کہ میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں اور اپنے کپڑے وغیرہ لے کر شکیل (میرے دیور) کے ہاں چلا جاؤں گا، پھر میں نے فون نہیں کیا“ چونکہ یہاں طلاق کو فون کرنے اور دونوں بھائیوں کے آنے پر معلق کیا

تھا اور شرط نہیں پائی گئی لہذا اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، واللہ اعلم
بالصواب۔

مذاکرۃ طلاق

سوال: 108

میری شادی کو ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے جبکہ میری بیٹی تین ماہ کچھ
دن کی ہے جب سے میری شادی ہوئی ہے گھر میں لڑائی جھگڑا رہتا ہے، میرے بھائی
اور بہنوں کے میری بیوی سے بہت اختلافات ہیں ابھی دو دن پہلے کی بات ہے صبح نا
شتہ کے نام گھر میں جھگڑا ہو گیا میری بھائی کہتے تھے کہ اس کو طلاق دے دو میں نے
سب کو سمجھایا لیکن میری بات کسی نے نہ مانی میں اتنا غصہ کی حالت میں تھا کہ غصہ کی حا
لت میں کئی بار طلاق طلاق طلاق کہتا رہا جبکہ میں نے دل سے طلاق نہیں دی بلکہ معا
ملہ کو ٹھنڈا کرنے کیلئے کہا جبکہ سن کر میری بیوی رونے لگی اور سب گھر والے بھی رونے
لگے میں نے اپنی بیوی کو تھوڑی دیر بعد کہا کہ کچھ بھی نہیں ہوا ہے اور میں اپنی بیوی اور
بیٹی کو سسرال چھوڑ کر آیا اور میں نے اس سے وعدہ لیا کہ اس جھگڑے کا کسی سے ذکر
نہیں کرو گی، میں تمہیں دو چار دن میں کرائے کا گھر لے کر چلا جاؤں گا بلکہ میں اپنی
اس حرکت شیطانی پر بہت شرمندہ ہوں، (سہیل عمران، الکرم اسکوائر بلاک 4 لیاقت آ
باد، کراچی)۔

بیان زوجہ: میں مسماۃ خالدہ بنت ضیاء الحق حلفیہ بیان دیتی ہوں کہ مورخہ
31 مئی 2006ء صبح کے وقت میرے اور میری نند کے درمیان گفتگو جھگڑے کی
صورت اختیار کر گئی اور بات بڑھتے بڑھتے یہ ہوئی کہ میرے دیور نے مجھے گالیاں

دیتے ہوئے میرے شوہر سے یہ کہا کہ آپ اسے طلاق دے دیں ہم آپ کی دوسری شادی کر دیں گے اور اس پر میرے شوہر نے ان کو ڈانٹا لیکن وہ بار بار طلاق دینے پر اصرار کرتا رہا، اس دوران انتہائی غصے میں میرے شوہر نے تین بار طلاق، طلاق، طلاق کہا نہ مجھے مخاطب کیا اور نہ ہی میرا یا اپنا نام لیا، (خالدہ بنت ضیاء الحق)۔

جواب :

طلاق میں اضافت کا پایا جانا ضروری ہے خواہ وہ اضافت لفظی ہو یا معنوی ہو یا کسی ایسے کلام کے جواب میں ہو جس میں اضافت مذکور تھی، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

اما وجود الاضافة في اللفظ فاقول على ثلاثة انحاء، الاول تحققها صريحاً في كلام الزوج وهذا الذي ذكر الحلبي والطحاوي امثله كقوله انت طالق او طلقتك او هذه او زينب او بنت زيد او ام عمرو او اخت بكر او امرأتى طالق، الثاني تحققها فيه لاجل كونه جواباً لكلام تحققت فيه فتحقق في الجواب ايضاً لان السؤال معاد في الجواب وهذا ما في الهندية عن الخلاصة قالت طلاق بلسنت تو است، مرا طلاق كن فقال الزوج طلاق مي كنم وكرر ثلاثا طلقت ثلاثا اهـ۔

ترجمہ: ”یا لفظوں میں اضافت کا موجود ہونا فاقول (تو میں کہتا ہوں) یہ تین طرح ہوتی ہے: اول یہ کہ خاوند کے کلام میں صراحۃً پائی جائے وہ یہ ہے جس کی مثالیں علامہ حلبي اور علامہ طحاوی نے یہ ذکر کی ہیں، مثلاً تو طلاق والی ہے، میں نے تجھے طلاق دی (بیوی کو اشارہ کرتے ہوئے) اسکو، نام لے کر، زینب کو، زید کی بیٹی کو، عمرو کی ماں کو، بکر کی بہن کو، میری بیوی کو طلاق۔ دوسری صورت، یہ کہ طلاق کے الفاظ کسی ایسے کلام کے

جواب میں ذکر کئے جائیں جس میں اضافت مذکور تھی تو اس وجہ سے وہ اضافت جواباً طلاق کے الفاظ میں متحقق ہوگی، کیونکہ جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے، اس کی مثالیں ہندیہ میں خلاصہ سے منقول ہیں، مثلاً بیوی کہے ”طلاق تیرے ہاتھ میں ہے مجھے طلاق دے“۔ تو جواب میں خاوند کہے ”میں نے طلاق دی“ تین دفعہ تکرار کیا تو تین طلاقیں بیوی کو پڑیں گی اھت (فتاویٰ رضویہ جلد 12 ص: 344-345 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)۔“

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا:
محمد مظفر کا اپنی والدہ سے جھگڑا ہو رہا تھا اس کی والدہ نے کہا کہ اگر اپنی بی بی کو نہ چھوڑو گے تو تم سو رکھاؤ، اسی طرح تین مرتبہ بولی، مظفر نے کہا طلاق دیتے ہیں، پھر اس نے بلا قصد غصہ کے ساتھ اپنی والدہ کے سامنے کہا طلاق طلاق طلاق، بغیر مخاطب کرنے کسی کو۔ اب شرعاً صورتِ مسئلہ میں مظفر کی بی بی پر طلاق پڑے گی یا نہیں؟ جواب میں لکھتے ہیں:

”تین طلاقیں ہو گئیں، بے حلالہ اس کے نکاح میں نہیں آسکتی، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ رضویہ جلد 12 ص: 360 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)۔“

صورتِ مسئلہ میں بر صدقِ بیان سائل اور حلفیہ اقرار زوجہ، صورتِ مسئلہ میں مذاکرۃ طلاق موجود ہے اور جیسا کہ بے اضافت طلاق کی صورتوں میں سے دوسری صورت یہ ہے کہ: طلاق کے الفاظ کسی ایسے کلام کے جواب میں ذکر کئے جائیں جس میں اضافت مذکور تھی تو اس وجہ سے وہ اضافت جواباً طلاق کے الفاظ میں متحقق ہوگی، کیونکہ جو اب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے۔ آپ کے تحریری و زبانی بیان کے مطابق کہ ”میرے بھائی کہتے تھے کہ اس کو طلاق دے دو میں نے سب کو سمجھایا لیکن میری بات کسی نے نہ

مائی میں اتنا غصہ کی حالت میں تھا کہ غصہ کی حالت میں کئی بار طلاق طلاق طلاق کہتا رہا
 ’’آپ کا لفظ طلاق کہنا آپ کے بھائی کے کلام کے جواب میں تھا، اسی کو اصطلاح
 فقہاء میں مذاکرہ طلاق کہتے ہیں، لہذا تین طلاق مغلطہ واقع ہو گئی ہیں۔

تین طلاق کا حکم

سوال: 109

میں روبینہ انجم سبحانی بنت سبحان خان میری شادی محمد افسر سے 28 مارچ
 1986ء کو انجام پائی ہم دونوں فقہ حنفی سے تعلق رکھتے ہیں، 10 سال پہلے میرے
 شوہر نے غصے میں آکر ایک ہی نشست میں مجھے کئی بار یہ لفظ ادا کئے ’’میں تمہیں طلاق
 دیتا ہوں‘‘ اس واقعے کا کوئی کواہ نہیں ہے، پھر وہ مکتبہ اہل حدیث سے فتویٰ لے
 آئے کہ تین طلاق سے ایک ہی طلاق واقع ہوئی ہے ہم پھر ساتھ رہنے لگے، اس کے
 بعد وہ مجھ پر تشدد کرتے اور کہیں آنے جانے بھی نہیں دیتے، تالے میں مجھے بند رکھتے
 ، اس واقعہ کے 7 سال بعد انہوں نے 5 مرد اور 7 خواتین کی موجودگی میں قبلہ رو ہو کر
 کلمہ پڑھا اور کہا ’’میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، میں تمہیں
 طلاق دیتا ہوں‘‘۔ میرے چار بچے ہیں، بڑے بیٹے کی عمر 18 سال، 12 سال کی
 ایک بیٹی، 10 سال کا ایک بیٹا پھر 8 سال کی بیٹی، تین چھوٹے بچے میرے بغیر نہیں
 رہتے اور میرے ساتھ ہیں وہ (بچوں کے والد) کوئی خرچہ بھی نہیں دیتے اور تشدد
 کر کے بچے چھین کر لے جاتا ہے، قرآن و سنت کے حساب سے باپ پر بچوں کا خرچہ کیا
 بنتا ہے؟، (روبینہ انجم، روئی گرین سٹی بلاک 18 گلستانِ جوہر، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئلہ میں بر تقدیر صدق سائلہ مذکورہ شخص نے اپنی منکوحہ کو دس

سال قبل جو تین طلاق دیں وہ مؤثر ہیں اور دیا گیا طلاق اسی وقت واقع ہوگئی ہے اور باوجود فقہ حنفی سے تعلق رکھنے کے، غیر مقلدین سے فتویٰ لینا محض ہوائے نفس کی پیروی اور جہالت ہے اور اس کے بعد جتنا عرصہ ساتھ گزارا وہ سب حرام اور زنا میں شمار ہوگا، آپ نے لکھا ہے کہ پہلی بار جب آپ کے شوہر نے تین طلاقیں دیں، تو اس کے گواہ نہیں ہیں، عند اللہ طلاق واقع ہونے کے لئے گواہوں کی موجودگی، لازم نہیں ہے، آپ کے بقول آپ کے شوہر مسلک اہل حدیث سے فتویٰ لے آئے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلی بار بھی تین طلاق دینے کا اقرار کرتے ہیں اور یہ اعتراف قضاء طلاق کے لئے مؤثر ہونے کے لئے کافی ہے۔ بچوں کی کفالت اور پرورش کا حق اولاد ماں کو حاصل ہے۔ علامہ علاء الدین حصکفی درمختار میں لکھتے ہیں:

تربیۃ الاولاد (ثبت للام)۔ ترجمہ: ”حق حضانت (نگہداشت کا حق) نسبی ماں کو حاصل ہے، (جلد نمبر 5، ص: 203 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)۔“ اگر مطلقہ ماں کی عدت ختم ہو چکی ہو اور وہ بچے کی پرورش پر اجرت کا تقاضہ کرے تو اجرت دینا باپ کے ذمے واجب ہے، البتہ اگر وہ عدت میں ہو تو یا غیر مطلقہ ماں اجرت کا تقاضا کریں تو ایسی صورت میں وہ اجرت کا مطالبہ نہیں کر سکتیں۔ درمختار میں ہے:

(و تستحق الحاضنة) اجرة الحضانة اذا لم تكن منكوحة ولا معتدة) لابیہ۔ ترجمہ: ”بچے کی پرورش کرنے والی عورت پرورش کرنے کی اجرت کی مستحق ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ بچے کے باپ کی منکوحہ نہ ہو اور نہ ہی وہ بچے کے باپ کی مطلقہ معتدہ ہو، (جلد نمبر 5، ص: 209 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)۔“

بالغ بیٹا آزاد ہے چاہے ماں کے ساتھ رہے یا باپ کے ساتھ، نابالغ بچوں کی

نگہداشت کا حق ماں کو حاصل ہے اور ان کا نفقہ باپ کے ذمہ ہے، نفقہ باپ کی مالی حیثیت کے مطابق طے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ط لَا تَكْلَفُ نَفْسٌ آلا وَسْعَهَا ج

ترجمہ: ”اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ دستور کے موافق ان (ماؤں) کا کھانا اور پہننا ہے کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کیا جائے گا، (البقرہ 233: 233)“ اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

لَيَنْفِقَ ذُو سَعْتٍ مِّنْ سَعَتِهِ ط وَمِنْ قَدَرِ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلَيَنْفِقَ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ط لَا يَكْلَفُ اللَّهُ نَفْسًا آلا مَا آتَاهَا ط

ترجمہ: ”گنجائش والے کو چاہئے کہ وہ اپنی گنجائش کے مطابق خرچہ دے اور جس پر رزق کی تنگی ہو تو وہ اسی میں سے نفقہ دے جو اللہ نے اسے دیا اللہ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی کے مطابق جو اسے دیا ہے، (الطلاق: 7)“۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

فَتَسْتَحِقُّ النِّفْقَةَ (بِقَدْرِ حَالِهَا)، بِهَ يَفْتَى، وَيَخَاطَبُ بِقَدْرِ وَسْعِهِ وَالْبَاقِي دِينَ إِلَى الْحَيْسَرَةِ۔

ترجمہ: ”خاوند پر دونوں کی حیثیت کے مطابق نفقہ واجب ہوگا، اسی پر فتویٰ دیا جائے گا، اور خاوند اپنی وسعت کے مطابق ادائیگی کا مکلف ہوگا اور جو رقم باقی رہ جائے، تو وہ اس کے ذمہ قرض ہوگا، جس کو اپنی سہولت سے ادا کرے گا“۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

قَالَ الْفَقِي "الْبَحْر": وَاتَّفَقُوا عَلَى وَجُوبِ نَفَقَةِ الْمَوْسِرِينَ إِذَا كَانَا مَوْسِرِينَ،

على نفقة المعسرین اذا كانا معسرین، وانما الاختلاف فیما اذا كان احدهما موسرا والآخر معسرا، فعلى ظاهر الرواية الاعتبار لحال الرجل، فان كان موسرا وهى معسرة فعليه نفقة الموسرین، وفى عكسه نفقة المعسرین۔ واما على المفتی به فتجب نفقة الوسط فی المسألتین وهو فرق نفقة المعسرة ودون نفقة الموسرة۔

ترجمہ: ”بخر“ میں ہے: سب کا اتفاق ہے کہ اگر دونوں خوش حال ہیں تو ان کے حال کے مطابق خاوند پر نفقہ واجب ہوگا، اور اگر دونوں تنگ دست ہیں تو ان کے حال کے مطابق خاوند پر نفقہ ہوگا، اور اختلاف صرف اس صورت میں ہے، جب دونوں میں سے ایک امیر اور دوسرا غریب ہے، ظاہر روایت کے اعتبار سے مرد کے حال کا اعتبار ہوگا، پس اگر خاوند خوشحال ہو، اور زوجہ تنگ دست ہو تو ان پر خوشحالی کا نفقہ واجب ہوگا، اور اس کے برعکس ہو تو تنگ دستی کا نفقہ واجب ہوگا، اور مفتی بقول یہ ہے کہ درمیانہ نفقہ دونوں مسئلوں میں واجب ہوگا، اور وہ یہ ہے کہ خوشحالی سے کم اور تنگ دستی سے زائد ہو“..... آگے چل کر لکھتے ہیں:

ويعيد الحقول ”البدائع“: حتى لو كان الرجل مفرطاً في اليسار يأكل خبز الحواري ولحم الدجاج والمرأة مفرطة في الفقر تأكل في بيت أهلها خبز الشعير يطعمها خبز الحنطة ولحم الشاة۔

ترجمہ: ”بدائع“ میں ہے: اگر خاوند انتہائی خوشحال ہونے کی بنا پر صاف باریک آنا اور مرغ کا گوشت کھاتا ہے اور بیوی انتہائی تنگ دستی کی بنا پر اپنے گھر والوں کے ہاں جو کی روٹی کھاتی ہے تو خاوند اسے گندم کی روٹی اور بکرے کا گوشت نفقہ کے طور پر کھانے کو دیگا“، (رد المحتار علی الدر المختار جلد 5 ص: 226-225 مطبوعہ دار احیاء

التراث العربی، بیروت)۔“

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا یقدر نفقتها بالدرهم والننانیز علی ای سعر کانت بل یقدر بها علی حسب اختلاف الاسعار غلا ورخصار عایة للحنین کذا فی البدائع۔
منہوم: ”نفقہ کا تعین اشیاء ضرورت کی مروجہ قیمت سے صرف نظر کر کے (ایک مستقل معیار کے طور پر) درہم و دینار (روپوں) سے نہیں کیا جاسکتا؛ کیونکہ ہمیشہ اتنے ہی روپے دیئے جائیں، اس لئے کہ اشیاء ضرورت کی قیمتیں کم و بیش ہوتی رہتی ہیں) بلکہ (ہر دور میں) مہنگائی اور ارزانی کے اعتبار سے نفقہ کا تعین ہو گا تا کہ جائیداد کی رعایت ملحوظ رہے۔ ارزانی و گرانی دونوں ادوار کے مصارف یکساں ہوسکتے، بلکہ گرانی میں اس کے لحاظ سے نفقہ کی مقدار بڑھائی جائے گی اور ارزانی میں کم کی جائے گی بدائع الصنائع میں بھی اسی طرح سے ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 547 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

طلاق میں اضافت

سوال: 110

میرا ایک مسئلہ ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی میں گھریلو بات پر لڑائی ہوئی۔ بہت ہی شدید غصے میں لڑائی اس قدر بڑھ گئی کہ ہم دونوں ہوش و حواس کھو چکے تھے، اور میں نے شدید غصے میں اسے دوسرے طلاق، طلاق کہا۔ نہ تو میں نے اپنی بیوی کا نام لیا اور نہ ہی یہ کہا کہ تجھے طلاق، اس طرح کی بات بالکل نہیں۔ صرف طلاق، طلاق کہا۔ میرے یہ الفاظ کہنے سے پہلے ہم دونوں کے درمیان گالیاں چل رہی تھیں اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے پہلے جب جھگڑا شروع ہوا تو اس وقت کہا تھا کہ مجھے علیحدگی چاہیے جس

وقت طلاق کے لفظ کہے اس وقت بد کلامی ہو رہی تھی سب ہم دونوں ہی بہت پریشان ہیں ہمارا ڈیڑھ سال کا بچہ ہے، براہ کرم قرآن و سنت کی روشنی میں ہمارے اس مسئلے کا حل بتائیں، (فیصل خان، بلاک 14 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

طلاق میں اضافت ضروری ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

اما وجود الاضافة في اللفظ فاقول على ثلاثة انحاء، الاول تحققها صريحاً في كلام الزوج وهذا الذي ذكر الحلبي والطحاوي امثله كقوله انت طالق او طلقتك او هذه او زينب او بنت زيد او ام عمرو او اخت بكر او امرأتى طالق، الثاني تحققها فيه لاجل كونه جواباً لكلام تحققت فيه فتحقق في الجواب ايضاً لان السؤال معاد في الجواب وهذا مافى الهندية عن الخلاصة قالت طلاق بلسنت تو است، مرا طلاق كن فقال الزوج طلاق مي كنم وكرر ثلثا طلقت ثلثا۔

ترجمہ: ”یا لفظوں میں اضافت کا موجود ہونا فاقول (تو میں کہتا ہوں) یہ تین طرح ہوتی ہے: اول یہ کہ خاوند کے کلام میں صراحۃً پائی جائے اس کی صورت وہ ہے جو علامہ حلبي اور علامہ طحاوی نے ان الفاظ میں ذکر کی ہیں: مثلاً تو طلاق والی ہے، میں نے تجھے طلاق دی (یا بیوی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اسے طلاق دی) یا بیوی کا نام لے کر کہا کہ (مثلاً اس کا نام زہنب ہے) میں نے زہنب کو طلاق دی، (یا اس کی کنیت کی نسبت سے کہا کہ) میں نے زید کی بیٹی کو یا عمرو کی ماں کو یا بکر کی بہن کو طلاق دی، یا یوں کہا میری بیوی کو طلاق۔ دوسری صورت یہ ہے کہ طلاق کے الفاظ کسی ایسے

کلام کے جواب میں ذکر کئے جائیں جس میں اضافت مذکور تھی، تو اس وجہ سے وہ اضافت جواباً طلاق کے الفاظ میں متحقق ہوگی، کیونکہ جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے، اس کی مثالیں فتاویٰ عالمگیری میں خلاصہ سے منقول ہیں، مثلاً بیوی کہے ”طلاق تیرے اختیار میں ہے مجھے طلاق دے“ تو جواب میں خاوند کہے ”میں نے طلاق دی“ تین دفعہ تکرار کیا تو تین طلاقیں بیوی کو پڑیں گی اھ ت (فتاویٰ رضویہ جلد 12 ص: 345. 344 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)۔“

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا:

محمد مظفر کا اپنی والدہ سے جھگڑا ہو رہا تھا تو اس کی والدہ نے کہا کہ: اگر اپنی بی بی کو نہ چھوڑو گے تو تم سو رکھاؤ، اسی طرح تین مرتبہ بولی، مظفر نے کہا طلاق دیتے ہیں، پھر اس نے بلا قصد غصہ کے ساتھ اپنی والدہ کے سامنے کہا طلاق طلاق طلاق، بغیر مخاطب کرنے کسی کو۔ اب شرعاً صورتِ مسئلہ میں مظفر کی بی بی پر طلاق پڑے گی یا نہیں؟

جواب میں لکھتے ہیں:

تین طلاقیں ہو گئیں، تحلیل شرعی کے بغیر اس کے نکاح میں نہیں آسکتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (فتاویٰ رضویہ جلد 12 ص: 360 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)۔“

صورتِ مسئلہ میں بر صحتِ بیان سائل، چونکہ مذاکرۃ طلاق موجود ہے اور جیسا کہ بے اضافت طلاق کی صورتوں میں سے دوسری صورت یہ ہے کہ:

طلاق کے الفاظ کسی ایسے کلام کے جواب میں ذکر کئے جائیں جس میں اضافت مذکور تھی تو اس وجہ سے وہ اضافت جواباً طلاق کے الفاظ میں متحقق ہوگی، کیونکہ جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے، اسی کو اصطلاح فقہاء میں مذاکرۃ طلاق کہتے ہیں، لہذا دو طلاق واقع ہو گئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الطلاق مرتین من فامساکہٗ بمعروف او تسریح باحسان ط

ترجمہ: ”طلاق (رجعی) دوبارہ ہے، پھر (عدت میں) حسن سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کے بعد) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے، (البقرہ 229)۔“

شوہر چاہے تو عدت کے اندر ایک طرفہ طور پر عقد ثانی کے بغیر رجوع کر سکتا ہے، خواہ مہض زبانی کہہ دے کہ میں نے رجوع کیا یا ازدواجی تعلق قائم کر لے۔ اور اگر عدت کے اندر رجوع نہ کیا اور عدت گزر گئی تو وہ عورت اب آزاد ہے، اپنی آزادانہ مرضی سے پہلے شوہر کے ساتھ بھی عقد ثانی کر سکتی ہے اور کسی اور شخص کے ساتھ بھی نکاح کر سکتی ہے، اگر پہلے شوہر کے ساتھ عقد ثانی کیا تو آئندہ اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا، کیونکہ پہلے دی ہوئی طلاقیں رجوع کے باوجود آئندہ طلاق کے ساتھ جمع ہونے کے لئے مؤثر رہتی ہیں، لہذا شوہر اول کے رجوع یا عقد ثانی کے بعد اگر خدانخواستہ اس نے ایک طلاق دے دی تو وہ ان پہلی دو طلاقیں کے ساتھ جمع ہو کر تین طلاقیں ہو جائیں گی اور وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی، اسے انتہائی محتاط زندگی گزارنی ہوگی۔

بیوی کو شروط طلاق دینا

سوال: 111

محمد اشرف نے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے یہ الفاظ کہے ”اگر تم نے اپنے بھائی سے بات کی تو میری طرف سے تم کو طلاق ہوگی“۔ اس کے بعد وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے رہے اور ایک سال سے بیوی کا بھائی اس سے ملتا بھی ہے اس

کے گھر میں کھانا کھانا اور رہتا بھی ہے بہن جاہل ہے وہ ضد سے یہ سب کچھ کر رہی ہے۔ محمد اشرف نے بیان دیا کہ ”میں نے اپنی بیوی سے کہا ہے کہ اگر تم نے اپنے بھائی سے بات کی تو میری طرف سے اس کو طلاق ہوگی۔“ اس بیان کے کواہ محمد اشرف کی ہمیشہ اور ایک بہنوئی موجود ہیں۔ معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت دونوں میاں بیوی کی کیا حیثیت ہے کیا وہ دونوں میاں بیوی رہے ہیں یا نہیں؟، (محمد عربی فورمین، کوئٹہ)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور شوہر (محمد اشرف) نے اپنی بیوی کو براہ راست مخاطب کر کے یہ کلمات کہے ہیں اور وہ ان کلمات کا اقرار کرتا ہے، تو جب پہلی بار بیوی نے بھائی سے بات کی، تو اس پر ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی، اس کے بعد چونکہ وہ بدستور میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے رہے، لہذا رجوع ہو گیا اور ان کا نکاح قائم ہے۔ آئندہ شوہر کے پاس صرف دو طلاق کا اختیار باقی ہے، اگر شوہر منکر ہے اور مدعی کے پاس چونکہ ایک مرد اور ایک عورت کواہ ہے لہذا اس سے نصاب شہادت پورا نہیں ہوتا، بصورت انکار شوہر کو قسم دی جائے گی، یہ مسئلہ قضا یعنی عدالتی ثبوت کے اعتبار سے ہے، عند اللہ حقیقت حال اور دیانت پر فیصلہ ہوتا ہے۔

خلع اور حق حضانت

سوال: 112

میری بیٹی پانچ ماہ کی حاملہ ہے خلع ہونے کی صورت میں کیا بچے کی پیدائش سے پہلے اس کے ماں یا باپ کے پاس رہنے کا فیصلہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟۔ بچے کی ولادت کے بعد بچہ کتنے عرصے تک ماں کے پاس رہ سکتا ہے اور اس کے بعد شریعت کیا کہتی

ہے، (سید ارشاد علی، 23-x-عثمان گارڈن بلاک 13، گلستان جوہر، کراچی)۔

جواب :

بچے کی پیدائش کے بعد اس کی پرورش و نگہداشت کا حق بچے کی ماں کو حاصل ہے، علامہ علاؤ الدین حنفی لکھتے ہیں:

الحضانة للأم----- (ثم) أى عدم الأم بأن ماتت أو لم تقبل أو أسقطت حقها أو تزوجت بأجنبي (أم الأم) وإن علت عند عدم أهلية القريبى (ثم أم الأب وإن علت) بالشرط المذكور ، وأما أم أبى الأم فتتفرع عن أم الأب بل عن الخالة أيضاً .

ترجمہ: ”بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: ترجمہ: ”ماں فوت ہو جائے یا بچے کو قبول نہ کرے یا اپنا حق حضانت ساقط کر دے، یا کسی ایسے شخص کے ساتھ نکاح کر لے جو بچے کے لئے اجنبی ہے تو پھر ماں کے بعد نانی کو پرورش کا حق ہے یہ استحقاق بالترتیب اوپر تک جائے گا، اگر قریب والے میں پرورش کی اہلیت نہ ہو، پھر دادی کو اور مذکورہ کے ساتھ یہ سلسلہ اوپر تک جائے گا، پھر نانا کی ماں، دادی بلکہ خالہ سے بھی موثر ہے۔“

علا مہتملا والدین جسکی درمختاریں لکھتے ہیں:

تربيت الولد (تثبت للام) النسبية.

ترجمہ: ”حق حضانت (نگہداشت کا حق) نسبی ماں کو حاصل ہے، (جلد نمبر 5، ص: 203 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)۔“

علامہ علاؤ الدین حصکفی لڑکے کے حق پرورش کے متعلق لکھتے ہیں:

(والحاضنة) أما أو غيرهما (أحق به) أي بالغلام حتى يستغني عن النساء

وقلربسبع وبہ یفتی لآذہ الغالب۔

ترجمہ: ”پرورش کرنے والی ماں ہوں یا کوئی اور اس کو یہ حق اس وقت تک حاصل ہے جب تک لڑکا عورتوں کی نگرانی سے مستغنی نہ ہو جائے، جس کی مدت کا اندازہ سات سال لگایا گیا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، کیونکہ اکثر صورتوں میں یہ ضرورت اسی عمر تک رہتی ہے۔

لڑکی کی پرورش کے بارے میں لکھتے ہیں:

(الأم والحلة) لأم أو لأب (احق بہا) بالصغيرة (حتی تحيض) ای تبلغ (وغیرہما احق بہا حتی تشتہی) وقلربتسع وبہ یفتی۔

ترجمہ: ”ماں اور نانی اور دادی لڑکی کے حیض آنے تک ان کی پرورش کا استحقاق رکھتی ہیں، (ان کی عدم موجودگی یا عدم دستیابی کی صورت میں) دوسری پرورش کرنے والی عورتوں کا استحقاق لڑکی کے مشہدۃ (قریب البلوغ) ہونے تک ہے اور اس کی مدت کا اندازہ 9 سال لگایا گیا ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 5 ص: 210 تا 216 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

صورتِ مسئلہ میں بچے کی پیدائش کے بعد اگر لڑکا ہوتو سات سال، اور لڑکی ہوتو نو سال کی عمر تک ماں کے پاس رہیں گے اور اس کی پرورش کا خرچہ (جب تک وہ بچہ اپنی بقاء و نگہداشت کیلئے ماں کی محتاج ہے) بچے کے باپ کے ذمے ہے، اور یہ خرچہ وہ اپنے مالی معیار کے مطابق دینے کا پابند ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ**۔

ترجمہ: ”اور جس کا بچہ ہے، اس کے ذمہ دستور کے موافق ان (ماؤں) کا کھانا اور پہننا ہے، (البقرة: 233)۔“

(وتستحق) الحاضنة) اجرة الحاضنة اذا لم تكن منكوحه ولا معتدة) لابیہ۔

ترجمہ: ”بچے کی پرورش کرنے والی (ماں) اجرت حضانہ کی حق دار ہے، بشرطیکہ نہ وہ کسی شخص کے نکاح میں ہو اور نہ ہی اس (زیر نگہداشت) بچے کے باپ کی عدت (طلاق) میں ہو، (جلد نمبر 5، ص: 209 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)۔“

طلاق بائن

سوال: 113

میرے شوہر نے مجھے دو مرتبہ یہ کہا کہ میں نے تجھے آزاد کیا، ابھی جب یہ مجھے چھوڑ کر گئے تو دوبارہ یہی الفاظ دہرائے وہ کہتا ہے کہ میں نے طلاق کے الفاظ استعمال نہیں کئے اس صورت میں اس کی شرعی حیثیت کیا ہے برائے مہربانی آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس بات کا فیصلہ دے دیجئے، (شہلاظفر، R-822 بلاک 14 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب: علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولو قال اعتقتك طلقت بالنية كذا في معراج الدراية۔

ترجمہ: ”اور اگر (خاوند) نے اپنی بیوی سے کہا: ”میں نے تجھے آزاد کیا“، اگر (یہ کلمات ادا کرتے وقت) ان کی نیت طلاق کی تھی، تو ایک طلاق واقع ہو جائیگی، جیسا کہ معراج الدراية میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 376 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔“

یہ طلاق بائن کا کلمہ ہے اور اس کا دارودار نیت پر ہے، عام فقہی قاعدہ یہ ہے کہ بائن

، بائن کو لاحق نہیں ہوتی ہے، لیکن اگر ثانی کو اول کی خبر بنانا ممکن ہو تو، ثانی سے اول ہی مراد ہوتی ہے، چونکہ شوہر نے ”میں نے تجھے آزاد کیا“ کا کلمہ دو مرتبہ متصلاً کہا ہے، اس لئے اس سے ایک طلاق بائن واقع ہوگی، اس کے بعد جب دوبارہ آپ کو چھوڑ کر جاتے وقت یہی کلمہ اگر عدت کے اندر طلاق کی نیت سے کہا ہے، تو اس سے دوسری طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔

علامہ علاؤ الدین ہسکفی لکھتے ہیں:

اذا امکن جعلہ اخباراً عن الاول کانت بائن کانت بائن او ابتک بتطبیقة فلا یقع لانه اخباراً فلا ضرورة فی جعلہ انشاء بخلاف ابتک باخبری او انت طالق بائن۔

ترجمہ: ”طلاق بائن کو (دوسری) بائن لاحق نہیں ہوتی، جبکہ دوسری کو پہلی کی حکایت و خبر قرار دینا درست ہو، جیسے شوہریوں کہے، تو بائن ہے، بائن ہے یا یہ کہے کہ میں نے تجھے ایک طلاق بائن دی تو یہ دوسری بائن واقع نہیں ہوگی، کیونکہ یہ پہلی ہی کی حکایت و خبر ہے۔ تو اسے انشاء یعنی نئی طلاق قرار دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہاں اگر وہ کوئی ایسے کلمات کہہ دے، جنہیں پہلی کی خبر قرار دینا ممکن نہ ہو تو وہ دوسری طلاق شمار ہوگی، جیسے یوں کہے کہ: ”میں نے تجھے دوسری طلاق بائن دی، (ردالمحتار علی الدر المختار، ج 4 ص: 408-409، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

لا یصحق البائن البائن بان قال لها انت بائن ثم قال لها انت بائن لا یقع الا طلقة واحدة بائنة لانه یمکن جعلہ خبراً عن الاول۔

ترجمہ: ”طلاق بائن، بائن کو لاحق نہیں ہوتی، مثلاً کسی نے اپنی بیوی سے کہا تو بائن

ہے، پھر اس سے کہا تو بائن ہے، تو اس سے ایک ہی طلاق بائن واقع ہوگی، کیونکہ دوسری کو پہلی کی حکایت و خبر قرار دینا ممکن ہے، (فتاویٰ عالمگیری ج 1 ص: 377 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔“

اور اگر شوہر کی نیت طلاق کی نہیں ہو تو یہ کلمات لغو ہوں گے اور کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، لیکن اگر طلاق دیتے وقت شوہر کی نیت طلاق کی تھی، مگر بعد میں وہ منکر ہو گیا، تو قضاءء عدم وقوع طلاق کا حکم نہیں دیا جائے گا۔

”تم تو میری بیوی نہیں ہو“، الفاظ طلاق نہیں

سوال: 114

میرے شوہر نے آج سے تقریباً آٹھ دس سال پہلے جھگڑے کے دوران غصے میں دو تین مرتبہ کہا ”تم تو میری بیوی نہیں ہو“ اس کے بعد میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ تمہارا میرا تعلق صحیح نہیں ہے، انہوں نے کہا: میں نے طلاق کی نیت سے نہیں کہا، آپ سے گزارش ہے کہ جلد میرے مسئلے کا حل کر دیجئے، کہ مجھے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟۔ (ایک دینی بہن، معرفت علامہ جمیل احمد نعیمی)۔

جواب:

اسلامی تعلیمات کی رو سے میاں بیوی کو ازدواجی زندگی باہمی حسن سلوک اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ گزارنی چاہئے، ایک دوسرے کی خامیوں سے حتی الوسع صرف نظر کرنی چاہئے، استفتاء میں درج خط کشیدہ الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، صحیح قول کے مطابق اگر شوہر ان الفاظ سے طلاق کی نیت کرتا تو بھی طلاق واقع نہ ہوتی۔

ولو قال ”توزن من نئی“ لا يقع ان نوری وهو المختار۔

ترجمہ: ”اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے، تو میری بیوی نہیں ہے، تو طلاق واقع نہیں ہوگی، اگرچہ اس کی نیت طلاق کی ہو اور یہی مختار (مذہب) ہے۔“ لہذا نکاح باقی ہے، فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 386 مکتبہ رشید یہ کوئٹہ۔“

مسئلہ طلاق

سوال : 115

میرا مسئلہ کچھ یوں ہے کہ 7 سال قبل میرے اور شوہر کے بیچ جھگڑا ہو رہا تھا کہ اتنے میں میرے شوہر نے کہا: ”چپ ہو جاؤ ورنہ کچھ بول دوں گا۔“ بولوں ابھی ”طلاق“۔ پھر بولوں! چپ ہو جاؤ، میں نے ان کو چپ کرایا، ہمارے بیچ کوئی طلاق کی بات نہیں چل رہی تھی اور نہ میں نے ان سے کبھی طلاق کا مطالبہ کیا۔ پھر انہوں نے قرآن اٹھایا اور کہا: کہ میں یہ لفظ آئندہ نہیں بولوں گا۔ اس کے تین سال بعد میرے شوہر نے پھر لفظ ”طلاق“ کہا، جھگڑے کے دوران۔ تب بھی کوئی مطالبہ یا کوئی بات طلاق کی نہیں چل رہی تھی، پھر ان سے میں نے کہا کہ ہمارے بیچ نازک رشتہ ہے اور دو بار آپ بول چکے ہیں، تو انہوں نے پھر قرآن اٹھایا اور کہا کہ آئندہ یہ لفظ نہیں بولوں گا۔ میں نے یہی سمجھا کہ انہوں نے دو طلاقیں دیں یا دو بار بولا۔ اور ان کو سمجھایا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ایک طلاق کے بعد رجوع ہو جائے تو وہ ختم ہو جاتی ہے۔ بہر حال پھر انہوں نے کچھ مہینے قبل جھگڑے میں کہا کہ میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ اب ہماری ۳ ہو گئی ہیں اور میرا آپ کا کوئی رشتہ نہیں، تو انہوں نے کہا کہ یہ دوسری بار ہے، اس کے بعد میں اپنی امی کے گھر آ گئی۔ پھر میری ان سے فون پر بات ہوئی اور انہوں نے کہا کہ ”میں نے دے دوں گا“ کہا تھا اور وہ اللہ کی قسم اٹھا کر کہتے ہیں۔ بہر حال اب وہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے صرف ایک طلاق دی ہے اور

ہم اب بھی میاں بیوی ہیں۔ برائے مہربانی میرا مسئلہ قرآن و سنت کی روشنی میں حل کر دیجئے، تاکہ میں سکون سے رہ سکوں۔ میری آخرت اور دنیا دونوں سرخرو ہو سکیں۔ ایک بات یاد رہے کہ میں نے ان سے ان تینوں موقعوں پر طلاق کی بات یا مطالبہ نہیں کیا، اچانک غصے کی حالت میں وہ یہ نکال دیتے۔ اب وہ یہی کہتے ہیں کہ ایک طلاق ہوئی ہے۔ فقہ حنفی کی روشنی میں جواب دیجئے کہ ہمارا نکاح باقی ہے یا نہیں یا کتنی طلاق واقع ہوئی ہیں۔ (بشری بنت اقبال، A-492، بلاک 3 گلشن اقبال، کراچی)

جواب:

صورت مسئلہ میں متعدد احتمالات ہیں، جس کی وجہ سے علی التبعین ایک حکم بیان کرنا مشکل ہے، لہذا تمام احتمالات میں سے ہر ایک کا حکم حسب ذیل ہے:

پہلی مرتبہ شوہر نے یہ الفاظ کہے ”بولوں ابھی طلاق“ اور پھر کہا: ”پھر بولوں“، دوبارہ ”پھر بولوں“ کہنا اس بات کا قرینہ ہے کہ پہلی بار اس نے طلاق کی نیت کی ہے، لہذا ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی۔ تین سال کے بعد جب دوبارہ شوہر نے لفظ طلاق بولا، تو اس صورت میں بھی اگر اس نے یہ لفظ اپنی بیوی کو طلاق کی نیت سے بولا ہے، تو ایک اور طلاق رجعی واقع ہوگئی۔ اور شوہر کا یہ کہنا ”ایک طلاق کے بعد رجوع ہو جائے تو وہ ختم ہو جاتی ہے“ بظاہر اس بات پر قرینہ ہے کہ مذکورہ لفظ طلاق بہ نیت طلاق زوجہ کہا ہے۔ لہذا مذکورہ خاتون کو ایک اور طلاق رجعی واقع ہوگئی۔ شوہر کا یہ کہنا کہ طلاق رجعی کے بعد رجوع کر لیا جائے، تو وہ طلاق کا عدم ہو جاتی ہے، درست نہیں ہے، بلکہ وہ آئندہ طلاقوں کے ساتھ جمع ہونے کے لئے بدستور مؤثر رہتی ہے، تاہم دو طلاق رجعی کے بعد شوہر کو پھر بھی رجوع کا حق حاصل رہتا ہے۔ شوہر نے جب تیسری بار ”میں تجھے طلاق دیتا ہوں“ کے الفاظ کہے تو اب یہ طلاق پچھلی دو طلاقوں کے ساتھ مل کر تین

طلاق ہو جائیں گی۔ لیکن اگر شوہر کہتا ہے کہ میں نے ”طلاق دے دوں گا“ کے الفاظ کہے تھے، تو بیوی سے کواہ طلب کئے جائیں گے، اگر کواہوں سے ثابت ہو جائے تو تیسری طلاق کا حکم لگا دیا جائے گا اور بیوی شوہر کے لئے حرام ہو جائے گی ورنہ شوہر کے انکار کی صورت میں قسم کے ساتھ اس کا قول معتبر ہوگا اور اس صورت میں نکاح قائم رہے گا۔

مشروط طلاق

سوال: 116

میں نے مختلف وجوہات کی بنا پر اپنے شوہر سید محمد طارق کو طلاق دینے کا نوٹس دیا تھا اور اس نوٹس کے جواب میں انہوں نے ایک خط تحریر کر کے روانہ کیا جس کی نقل منسلک ہے یہ خط مجھے 11 اگست 2006ء کو ملا۔ اس خط میں ایک طلاق کا ذکر ہے میں گذشتہ دو سال سے والدین کے ساتھ مقیم ہوں اور اس خط کے موصول ہونے کے بعد بھی اُس مقررہ تاریخ پر یا اس کے بعد شوہر کے گھر نہیں گئی اور تا حال والدین کے گھر میں رہ رہی ہوں، خط کی تحریر مندرجہ ذیل ہے:

ڈیر ریشماں! السلام علیکم!

تم ایک طویل عرصے سے میکے میں بیٹھی ہو اور میرے بار بار بلانے پر بھی واپس نہ آئی اب میں تم کو حتمی طور پر کہتا ہوں کہ 14 اگست 2006ء یوم آزادی کے دن دوپہر بارہ بجے تک واپس آ جاؤ ورنہ تم پر میری جانب سے پہلی طلاق نافذ ہو جائے گی اور اسی دن سے عدت شروع ہو جائے گی، دورانِ عدت جب اور جس وقت واپس آنا چاہو آ سکتی ہو وہ رجوع سمجھا جائے گا، ورنہ عدت پوری ہونے پر تمہیں یہی طلاق بائن ہو جائے گی، خیر اندیش طارق۔

مہربانی فرما کر اس خط کی شرعی حیثیت پر فتویٰ صادر فرمائیں۔

۱۔ کتنی مدت تک مجھے انتظار کرنا ہوگا کہ طلاق مکمل ہو جائے؟

۲۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور نوکری کرتی ہوں لہذا اس مدت کے دوران تو کوئی عدت نہیں کیونکہ مجھے نوکری پر جانا ضروری ہے۔

۳۔ اگر خاص مدت کے بعد خود بخود طلاق ہو جاتی ہے تو میرے پاس تو کوئی تحریر نہیں ہے کہ مجھے مکمل طلاق ہو گئی ہے شوہر کی جانب سے مکمل طلاق کی تحریر کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے؟، (ریشماں صدیقی، A-33/9 ڈیگیٹل سائٹ فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئلہ میں اگر سائلہ ریشماں صدیقی کا بیان درست ہے تو ان کے شوہر نے انہیں ایک مشروط طلاق دی تھی کہ اگر وہ 14، اگست 2006ء (یومِ آزادی) کو 12 بجے دن تک واپس شوہر کے پاس چلی گئیں تو فیہا، ورنہ ایک طلاق واقع ہو جائے گی، اور وہ 14، اگست 2006ء کو 12 بجے دن تک واپس شوہر کے پاس نہیں گئیں، لہذا شرط کے مفقود ہونے پر یہ طلاق رجعی واقع ہو گئی۔ دوسری بات جو شوہر (طارق) نے خط میں اپنی بیوی (ریشماں صدیقی) کو لکھی، یہ ہے کہ: ”دورانِ عدت جب اور جس وقت واپس آنا چاہو، آسکتی ہو، وہ رجوع سمجھا جائے گا، ورنہ عدت پوری ہونے پر تمہیں یہی طلاق بائن ہو جائے گی“۔ سائلہ چونکہ 14، اگست 2006ء بارہ بجے دوپہر تک شوہر کے ہاں نہیں گئی، پس اس بنا پر ایک طلاق رجعی واقع ہو گئی اور اسی تاریخ سے عدت بھی شروع ہو گئی، عدت شروع ہونے کے لئے کسی نیت یا خاص عمل کی ضرورت نہیں ہے، طلاق کے بعد عدت از خود شروع ہو جاتی ہے۔

پھر دورانِ عدت نہ تو شوہر نے رجوع کیا اور نہ ہی بیوی خود شوہر کے پاس گئی، کیونکہ شوہر نے دورانِ عدت اس کے واپس آ جانے پر رجوع کو معلق و مشروط کیا تھا۔ لہذا عدت کے گزرتے ہی یہ طلاق بائن ہوگئی۔ اب یہ خاتون (ریشماں صدیقی) باہمی رضامندی سے اپنے سابق شوہر کے ساتھ بھی نکاح کر سکتی ہے اور کسی دوسرے مرد کے ساتھ بھی۔ سابق شوہر کے ساتھ نکاح کی صورت میں خدا نخواستہ اگر اس نے دوبارہ ایک یا دو طلاقیں دیں، تو تجدیدِ نکاح کے باوجود یہ پہلی طلاق ان کے ساتھ جمع ہونے کے لئے مؤثر رہے گی، یعنی نکاحِ ثانی کے بعد اگر اس نے ایک طلاق دی، تو وہ اس پہلی طلاق کے ساتھ مل کر دو ہو جائیں گی اور اگر دو طلاقیں دیں تو وہ اس پہلی کے ساتھ مل کر تین ہو جائیں گی۔ شرعی تقاضوں کے مطابق شوہر کا یہ خطِ ثبوتِ طلاق کے لئے کافی ہے، قانونی کارروائی اور طلاق کی توثیق کے لئے یو۔ سی ناظم سے رجوع کریں۔

طلاق معلق بالشرط

سوال: 117

گذشتہ چند ماہ سے گھریلو جھگڑے کی وجہ سے میری بیوی اپنے والدین کے گھر گئی ہوئی تھی، میں کئی مرتبہ لینے گیا لیکن بے سود رہا۔ فون پر بات ہوئی، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی بات پر مُصر رہی، میں نے کہا کہ طلاق لکھ کر بھیج دوں؟، پھر ماں باپ کے پاس بیٹھی رہو گی۔ اس نے جواباً کہا کہ میں پوری زندگی آپ کے ساتھ رہوں گی طلاق مجھے قطعاً نہیں چاہئے لیکن میری شرائط وہی ہیں۔ شرائط سے اس کی مراد یہ ہے کہ میں اس کے والدین اور بھائیوں کے ماتحت رہوں اور گھر میں اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہ ہو۔ جب کوئی بات بنتی نظر نہیں آئی تو بقائی ہوش و حواس اور

طبیعت میں سختی کے ساتھ طلاق دینے کی نیت سے میں نے یہ الفاظ کہے ”تین قبول کر“، اس کے بعد (میں نے غالباً)، ”طلاق قبول کرلو“ کے الفاظ کہے اور پھر میں نے فون بند کر دیا۔ ان الفاظ کی ادائی کے دوران بھی وہ اپنی بات پر بضد رہی شاید میری بات پر توجہ بھی نہیں دی اور میرے کہے ہوئے الفاظ شاید اس نے نہیں سنے اور میں نے اپنی بات کہہ کر فون بند کر دیا۔ گھر آ کر میں نے اپنی بہنوں سے کہا کہ میں نے اسے فارغ کر دیا ہے، طلاق دے دی ہے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟، اگر ہو گئیں تو کتنی؟، (معرفت: سید مختار حسین شاہ، امام مسجد محلہ جدون آباد، ہری پور، ہزارہ صوبہ سرحد)۔

جواب :

شوہر کا اپنی بیوی کو طلاق کی نیت سے یہ کہنا کہ: ”تین قبول کر“۔ یہ طلاق کنایہ کے الفاظ ہیں اور چونکہ نیت طلاق موجود ہے، اس لئے تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ اب تحلیل شرعی کے بغیر عدت کے اندر اور عدت کے بعد دونوں کے درمیان نکاح نہیں ہو سکتا۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ولو قال لہا: تو سه وہ ونوی الطلاق، يقع۔

ترجمہ: ”شوہر نے اپنی بیوی کو طلاق کی نیت سے کہا: تجھے تین دیئے، تو طلاق واقع ہو جائے گی، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 380)۔“

خلع

سوال: 118

عرض ہے کہ میرے ایک قریبی عزیز کی بیٹی کا نکاح تقریباً ایک سال پہلے ہوا تھا اور ایک سال کے بعد رخصتی ہونا تھی لہذا گھریلو طور پر عورتوں میں کافی اختلافات

پڑ گئے جس کی وجہ سے خلع تک نوبت آگئی لہذا اب کوئی صورت بات بنتی نظر نہیں آرہی لہذا آپ سے گزارش ہے کہ خلع کی صورت میں شرعی کیا پہلو ہیں؟، (حنیف شیخ بلالی، کراچی)۔

جواب:

خلع زوجین کی رضامندی سے ہوتا ہے، یعنی بیوی کچھ مال دے کر خلع حاصل کرے یا مطالبہ مہر سے دستبردار ہو جائے، اس سے طلاق بائن ہو جاتی ہے۔ مال کے بدلے نکاح زائل کرنے کو خلع کہتے ہیں۔ خلع میں عورت کا قبول کرنا شرط ہے اور اس کے الفاظ معین ہیں ان الفاظ کے علاوہ اور لفظوں سے خلع نہ ہوگا۔ خلع ایک طلاق بائن کے درجے میں ہوتا ہے۔ صورت مسئلہ میں اگر زوجین خلع پر رضامند ہو جاتے ہیں تو چونکہ رخصتی نا حال نہیں ہوئی اور عورت غیر مدخولہ ہے لہذا اس پر عدت نہیں ہے۔

زوج مفقود النحر

سوال: 119

میرے خاوند فاروق قیصر کوٹ لکھپت جیل لاہور میں بطور کانشیبل کام کرتے تھے۔ 1994 میں وہ صبح گھر سے اپنی ڈیوٹی پر گئے، گھر سے نکلتے ہی کچھ لوگوں نے انہیں اغوا کر لیا، شام تک میرے خاوند گھر واپس نہیں آئے، تو ہم نے ان کے آفس (جیل) سے معلوم کیا، تو انہوں نے بتایا کہ وہ اس دن ڈیوٹی پر نہیں آئے۔ ہم نے اس دن ہی ان کی اغوا کی رپورٹ متعلقہ تھانے میں درج کرا دی تھی۔ پولیس نے بھی کافی عرصہ اس کسی کی تفتیش کی، مگر آج تک ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ آج ان کے اغوا کو گیارہ سال کا عرصہ گزر چکا ہے، لیکن اس کا کوئی پتا نہیں ہے۔ عرض یہ ہے کہ میں اس وقت سے اپنے ضعیف والدین کے ساتھ رہ رہی ہوں، میرے تین

بچے ہیں، میرے والدین میری اور میرے بچوں کی اس دن سے کفالت کر رہے ہیں۔ میرے والدین کب تک میرا ساتھ دیں گے۔ دراصل میں اپنا اب گھر بسانا چاہتی ہوں تاکہ باقی ماندہ زندگی با عزت اور شرعی طور پر گزرے۔ میرے میکے والے بھی مجھے قبول نہیں کر رہے ہیں۔ اور نہ میری کفالت کرنے کو تیار ہیں۔ ان تمام حالات کے مد نظر میں نے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ میں اپنا گھر بسا سکوں۔ ان حالات کے تحت کیا میں دوسری شادی کر سکتی ہوں یا نہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ میرے اس مسئلے کا حل بتایا جائے اور اس سلسلے میں ہماری شریعت کیا کہتی ہے، اور شریعت کی ہی رو سے فتویٰ دیا جائے، (نسیم فاروق، مکان نمبر 586/16 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

خاوند کے لاپتہ (مفقود والخبر) ہونے کی صورت میں امام ابو حنیفہ کا موقف: علامہ ابوالحسن مرغینانی لکھتے ہیں کہ:

واذا تم له مائة وعشرون سنة من يوم ولد حکمنا بموته وهذه رواية الحسن عن ابي حنيفة وفي ظاهر المذهب يقدر بموت الاقران وفي المروى عن ابي يوسف بمائة سنة وقدره بعضهم بتسعين والاقيس ان لا يقدر بشئى والارفق ان يقدر بتسعين واذا حکم بموته اعتدت امرأته عدة الوفاة من ذلك الوقت وقسم ماله بين ورثة الموجودين۔

ترجمہ: ”امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ جب مفقود (لاپتہ) کی زندگی کے ایک سو بیس سال پورے ہو جائیں گے تو اس کو مردہ قرار دیا جائے گا اور ظاہر مذہب یہ ہے کہ جب اس کے تمام معاصرین فوت ہو جائیں گے تو اس کو مردہ قرار دیا جائے گا۔ امام ابو

یوسف سے نوے سال کی روایت ہے: بعض مشائخ حنفیہ نے بھی 90 سال مقرر کئے ہیں، زیادہ قیاس یہ ہے کہ وقت مقرر نہ کیا جائے۔ اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ 90 سال مدت مقرر کی جائے اور جب اس کو مردہ قرار دے دیا جائے گا تو اس کی بیوی عدتِ وفات گزارے گی اور اس کا ترکہ وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے گا، (ہدایہ اولین، ص: 598، کتاب المفقود)۔

امام ابوالحسن لکھتے ہیں: امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ لاپتا شخص کا نکاح یقین سے ثابت اور معروف ہے، اور غائب ہو جانا تفریق کو واجب نہیں کرتا اور اس کی موت مشکوک ہے اور یقین شک سے زائل نہیں ہوتا، اس لئے جب تک اتنی مدت نہ گذر جائے، جس میں اس کی موت کا یقین ہو جائے۔ اس وقت تک اس کو مردہ قرار نہیں دیا جائے گا۔ اور عرف اور عادت میں ایک آدمی ایک سو بیس سال سے زیادہ نہیں رہتا یا اپنے تمام معاصرین کی موت کے بعد زندہ نہیں رہتا، اس لئے اس مدت کے گزرنے کے بعد اس کو مردہ فرض کر لیا جائے گا۔ علامہ ابن ہمام نے تخفیف کر کے اس مدت کو ستر سال قرار دیا ہے۔

امام ابوحنیفہ اور مشائخ حنفیہ کی عبارات کو بغور مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس لاپتا شخص کی بیوی کو اس کی عمر کے ایک سو بیس سال یا تمام معاصرین کی موت تک یا ستر یا نوے سال تک انتظار کرنے کا حکم دیا ہے۔ جس کا اتنا مال اور ترکہ موجود ہو، جس کو اس کی بیوی ستر یا نوے سال تک بیٹھ کر کھا سکے۔

سنن دارقطنی میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امرأۃ المسفقۃ امرأۃ حتی یاتیہا البیان ”لاپتا شخص کی بیوی اس کی بیوی قرار پائے گی جب تک کہ کوئی وضاحت نہ آجائے یا کوئی خبر نہ آجائے“۔ علامہ ابن

ہمام فرماتے ہیں، اس حدیث کی سند میں محمد بن شریل ایک ضعیف راوی ہے۔ ابو حاتم نے کہا یہ شخص حضرت مغیرہ کی طرف منکر اور باطل روایات منسوب کرتا ہے۔ ابن قنطار نے کہا اس کا ایک راوی سوار بن معصوب متروکین میں مشہور ہے اور اس سلسلہ میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار اور اقوال متعارض ہیں۔

خاوند کے لاپتا (منفقو والخبر) ہونے کی صورت میں امام مالک کا موقف:

علامہ ابن سحون مالکی نے امام مالک سے پوچھا آیا منفقو کی بیوی امام مالک کے قول کے مطابق حاکم کی اجازت کے بغیر بھی چار سال عدت گزار سکتی ہے؟ امام مالک نے فرمایا: نہیں! امام مالک نے فرمایا: اگر منفقو کی بیوی بیس سال بھی انتظار کرتی رہے، اس کے بعد حاکم کے پاس اپنا مقدمہ پیش کرے تو حاکم اس میں غور و فکر کرے اور جس جگہ وہ شخص گیا تھا، وہاں اس کی تفتیش کرے اور جب اس کا پتا نہ چل سکے اور وہ مایوس ہو جائے تو پھر اس کو چار سال ٹھہرنے کا حکم دے۔ امام مالک سے پوچھا گیا کہ چار سال ٹھہرنے کے بعد چار ماہ دس دن عدت گزارنے کے لئے بھی حاکم کی اجازت ضروری ہے یا وہ یہ مدت از خود بھی گزار سکتی ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ہاں اس کی عدت وفات کے ساتھ حاکم کا کیا تعلق ہے؟، سحون از ابن القاسم از امام مالک از یحییٰ بن سعید از سعید بن مسیب روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب نے فرمایا جس عورت کا شوہر لاپتا ہو جائے، وہ چار سال انتظار کرے پھر چار ماہ دس دن عدت وفات گزارے اس کے بعد وہ نکاح کے لئے حلال ہو جائے گی۔

۶ ربیع الآخر ۱۳۱۸ھ کو مفتی المالکیہ شیخ الجامع الازہر نے گیارہ معاشرتی مسائل میں امام مالک کے مذہب کی نصوص پر مشتمل ایک فتویٰ جاری کیا، جس کی جامع الازہر کے تمام علماء نے تصدیق کی ہے جن میں حنفی علماء بھی شامل ہیں۔ اس فتویٰ کو مصر کی

وزارتِ اوقاف نے فتاویٰ اسلامیہ میں شائع کیا ہے۔ اس فتویٰ سے پہلے علماء ازہر نے فقہ حنفی سے اس پر تصریحات پیش کی ہیں کہ ضرورت کے وقت دوسرے مذہب پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

صدرالافاضل علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ ”فتاویٰ امجدیہ“ کے حاشیے میں، جو یا تو ان کا اپنا املا کرایا ہوا ہے اور یا ان کے تلمیذ رشید اور نائب خصوصی، مفتی اعظم ہند علامہ محمد شریف الحق امجدی رحمہ اللہ تعالیٰ کا تحریر کردہ ہے: لیکن اگر شوہر کے مفقود الخبر ہونے کی وجہ سے عورت دوسری شادی پر اتنی مجبور ہو جائے کہ دوسرا کوئی چارہ کار نہ ہو حالتِ ملکیہ پیدا ہو جائے، تو مذہبِ امام مالک رضی اللہ عنہ پر عمل کرنے کی اجازت ہمارے علماء نے بھی دی ہے۔ خصوصاً اس دورِ پرفتن میں ہمارے علماء کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ اس خصوص میں امام مالک رضی اللہ عنہ کے مذہب پر فتویٰ دیا جائے، مگر اس خصوص میں چند باتیں قابلِ لحاظ ہیں، اول یہ کہ مذہبِ امام مالک رضی اللہ عنہ یہ نہیں کہ شوہر کے غائب ہونے کے دن سے چار سال گزار کر شوہر کی وفات کا حکم دیا جائے، بلکہ یومِ قضاء (یعنی جس دن قاضی لا پتا شوہر کی موت کا حکم لگائے) سے چار سال انتظار کرنا ضروری ہے، جیسا کہ فتاویٰ رضویہ ج ۵، ص ۵۰۰ پر کتاب مَدَوْنۃ کے حوالے سے مذکور ہے، دوسرے یہ کہ اس کے لئے قضاے قاضی شرط ہے، درمختار میں ہے: انما یحکم بموتہ بقضاء لانه امر محتمل فمالہ ینضم الیہ القضاء لایکون حجة۔

ترجمہ: شوہر کی موت کا حکم قضاے قاضی سے دیا جائے، کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو دوسری جہت (زندگی) کا بھی احتمال رکھتا ہے، تو جب تک اس کے ساتھ قاضی کا فیصلہ نہیں ملے گا، یہ حجت نہیں ہوگا، (جلد: ۳، ص: ۳۳۱، کتاب المفقود،

نعمانیہ)۔“ اس زمانے میں جب کہ یہاں حاکم اسلام نہیں، علمائے بلد، جو مرجع فتویٰ ہوں، اس خصوص میں قاضی کے قائم مقام ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم (فتاویٰ امجدیہ دوم، ص: 91 مطبوعہ مکتبہ رضویہ آرام باغ کراچی)۔“

مختصر یہ کہ انتہائی مجبوری کی حالت میں جب عورت کے لئے اپنے نفس پر قابو پانا دشوار ہو جائے، اسے خدشہ ہو کہ بشری کمزوری کی بناء پر وہ حرام میں مبتلا ہو جائے گی، تو ایسے موقع پر امام مالک کے مذہب پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے یا قاضی فیصلہ دے سکتا ہے۔ شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی نے شرح صحیح مسلم جلد ثالث صفحات 1095 تا 1120 میں اس مسئلے پر مفصل و مدلل بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ آثار صحابہ بھی اس سلسلے میں موجود ہیں اور چونکہ امام اعظم ابو حنیفہ نے اثر صحابہ کو اپنی اجتہادی رائے پر ترجیح دی ہے، اس لئے التزاماً مذہب حنفی کے مطابق بھی کہا جاسکتا ہے اور جیسا کہ امام مالک کے قول سے ثابت ہے اور صدر الشریعہ مولانا امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا کہ وہ عورت جس کا خاوند مفقود الخیر (لاپتا) ہے، جب عدالت سے رجوع کرے گی تو قاضی اس کی تلاش کے تمام ذرائع اختیار کرنے کے باوجود لاپتا رہنے پر اس کی وفات کا حکم دے گا اور اس وقت سے وہ عورت چار سال اور عدت وفات گزارنے کے بعد کسی دوسرے شخص سے عقد کر سکے گی۔

علامہ سعیدی نے اس امکانی صورت پر بھی بحث کی ہے کہ اگر ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد عورت کسی شخص سے نکاح کر لیتی ہے اور پھر تقدیر الہی سے وہ شخص واپس آمو جو دہوتا ہے تو کیا کیا جائے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ”جب مفقود لوٹ آئے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ زندہ ہے اور ابھی دوسرے شخص نے اس سے مقاربہ نہیں کی تھی اور نہ ہی اس کو مفقود کے زندہ ہونے کا پہلے علم تھا تو اب یہ مفقود کی زوجہ ہے، خواہ عقد

نکاح ہو چکا ہو، اور اگر دوسرے شوہر کو مفقود کی حیات کا علم تھا تو اس نے مقاربہ کی ہو یا نہ کی ہو مفقود کے لوٹ آنے کے بعد وہ مفقود کی بیوی ہوگی، اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مفقود، دورانِ عدت فوت ہوا ہے یا عدت کے بعد دوسرے نکاح سے پہلے فوت ہوا ہے یا عقد کے بعد مقاربہ سے پہلے فوت ہوا ہے تو وہ عورت مفقود کی وارث ہو سکتی ہے اور اگر مقاربہ کے بعد فوت ہوا ہے تو وہ عورت مفقود کی وارث ہو سکتی ہے اور اگر مقاربہ کے بعد فوت ہوا ہے درآں حالیکہ دوسرے شوہر کو اس کی حیات کا علم نہیں تھا تو اب یہ وارث نہیں ہوگی۔ (شرح صحیح مسلم جلد ثالث ص: 1107 مطبوعہ فرید بک اسٹال، لاہور)۔“

تحریری طلاق نامہ لڑکی کو نہ ملے تب بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے

سوال: 120

میری بیوی اور میرے درمیان کچھ اختلافات ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے میری بیوی ناراض ہو کر اپنے والدین کے گھر چلی گئی تھی، تقریباً عرصہ دس ماہ گزر جانے کے بعد میں نے کافی اثر و رسوخ استعمال کیا، لیکن کوئی مسئلہ حل نہ ہوا۔ اس کے بعد میں وکیل کے پاس چلا گیا، اپنا قصہ سنایا اور پھر اس کو طلاق کا نوٹس تیار کرنے کو کہا۔ وکیل نے تین طلاق کا نوٹس تیار کر دیا اور میں نے طلاق نوٹس کی ایک کاپی سسرال والوں کے پتہ پر بھیج دی۔ اور ایک کاپی یونین کونسل کے پتہ پر روانہ کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد دونوں کاپیاں الگ الگ مجھے مل گئیں، جو وصول نہ ہوئی تھیں، اور نہ ہی ان پر دستخط موجود تھے، اس کے بعد میں نے ایک جرگہ بٹھایا اور پوچھا کہ آپ کو میری طرف سے طلاق کا نوٹس ملا کہ نہیں، جس پر سسرال والوں نے جواب دیا کہ نہیں ملا۔ اور میں نے طلاق کا نوٹس مورخہ 26 اپریل 2005ء کو دیا تھا اور ابھی تقریباً چھ ماہ ہو چکے

ہیں۔

میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آیا طلاق ہوگئی ہے یا نہیں ہوئی؟ مہربانی فرما کر قرآن و سنت کی روشنی میں فتویٰ دیا جائے، میرے دو بچے ہیں، اور میری بیوی بھی دوبارہ میرے ساتھ بخوشی زندگی گزارنا چاہتی ہے، کیا طلاق مؤثر ہے یا غیر مؤثر؟، (محمد یعقوب، تحصیل حاصل پور ضلع بہاولپور)۔

جواب:

کتب فتاویٰ میں یہ مسئلہ درج ہے کہ اگر کسی شخص نے کاتب یا وثیقہ نویس سے کہا کہ میری بیوی کے نام طلاق لکھ دو اور اس نے لکھ دی تو طلاق واقع ہو جائے گی، جیسا کہ فتاویٰ شامی میں ہے: وَلَوْ قَالَ لِلْكَاتِبِ: اَكْتُبْ طَلَاقَ امْرَأَتِي كَانَ اِقْرَارًا بِالطَّلَاقِ وَانْ لَمْ يَكْتُبْ۔

ترجمہ: ”اور اگر اس (شوہر) نے کاتب سے کہا کہ میری بیوی کے نام طلاق لکھ دو تو یہ طلاق کا اقرار ہے، خواہ کاتب نے لکھا نہ ہو (تب بھی طلاق واقع ہو جائے گی)، (رد المحتار علی الدر المختار، ج 4 ص: 337 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی)۔“

چونکہ آپ نے اپنی مرضی سے وثیقہ نویس سے اپنی بیوی کے نام تین طلاقیں لکھوائیں اور اس طلاق نامے پر دستخط کر دیے، تو اسی وقت طلاق واقع ہوگئی، طلاق کے مؤثر ہونے کے لئے بیوی کو تحریری طلاق نامے کا ملنا ضروری نہیں ہے، جس وقت طلاق نامے پر دستخط ہوئے، اسی وقت سے عدت بھی شروع ہوگئی، اب آپ کا اپنی بیوی سے کوئی تعلق باقی نہیں ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے میں کہ ایک میرے قابل احترام بنام مولانا علامہ فتح محمد ولد نظام دین ساکن نئی آبادی کھرالہ تحصیل ضلع جہلم کے رہائشی نے دو شادیاں کی ہوئی ہیں، دوسری شادی 1982ء کو ہوئی تھی۔ اس عورت کو کچھری میں جا کر 50 روپے والے اسٹامپ پیپر پر لفظ طلاق۔ طلاق۔ طلاق لکھ کر (جس طلاق نامے کی فوٹو کاپی ساتھ ارسال خدمت ہے) طلاق دے دی اور بمطابق قانون پاکستان ایک طلاق نامہ جو کہ اصل تھا، مطلقہ بیوی کو ارسال کر دی۔ اب جس عورت کو طلاق دی گئی ہے، وہ عورت طلاق نامہ وصول کرنے سے انکاری ہے اور محترم طلاق دینے والے بزرگوار ماشاء اللہ دسین خداوندی پر عبور حاصل ہے دونوں یہ کہتے ہیں کہ طلاق اگر وصول نہ کی جائے تو طلاق نہیں ہوتی اور یہ دونوں ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں اور ایک ہی جگہ پر رہائش پذیر ہیں۔

جناب عالی! اسلام کی روح سے ان قابل احترام بزرگوار کے بارے میں کیا حکم ہے اور اس طلاق شدہ عورت کے بارے میں کیا احکامات خداوند ہیں، جناب فتویٰ صادر فرمایا جائے تاکہ باقی اس گھر میں رہنے والے فریق خدا کے غضب سے بچ سکیں، (شاہد محمود ولد مولانا فتح محمد، نئی آبادی کھرالہ تحصیل ضلع جہلم)۔

جواب:

ہمیں مذکورہ بالا استفتاء کے ساتھ شوہر کا اسٹامپ پیپر تحریری طلاق نامہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بھی منسلک کر کے ارسال کی گئی ہے جس پر شوہر فتح محمد صاحب اور دو کواہوں محمد ناصر اور حافظ سجاد حیدر کے دستخط بھی ثبت ہیں اور سید صفات احمد شاہ (

اوتھ کمشنر) نے اپنے دستخطوں اور مہر کے ساتھ اس کی توثیق کی ہے، لہذا صورت
 مسئلہ میں چونکہ شوہر نے اپنی بیوی کا نام لے کر تین دفعہ طلاق، طلاق، طلاق کہہ
 کر طلاق دے دی ہے، اس لئے طلاق واقع ہوگئی۔ وقوع طلاق کے لئے بیوی کا
 طلاق نامے کو وصول کرنا ضروری نہیں ہے، بس جس وقت شوہر نے طلاق نامے پر
 دستخط کئے، طلاق اسی وقت سے مؤثر ہوگئی اور عدت بھی شروع ہوگئی اور طلاق مغلظہ
 ہونے کی بنا پر ان کا عدت کے اندر یا عدت کے بعد تحلیل شرعی کے بغیر آپس میں نکاح
 نہیں ہو سکتا، تاہم یہ مطلقہ خاتون عدت اسی سابق مطلق شوہر کے مکان میں گذاریں
 گی، ایامِ عدت کا نفقہ بھی شوہر کے ذمے ہوگا، لیکن دورانِ عدت بھی اس طلاق دینے
 والے شوہر اور اس طلاق یافتہ عورت کا آپس میں معاملہ اجنبی والا ہوگا، ستر و حجاب کی
 پابندی ہوگی، الگ رہنا ہوگا۔ اس طلاق مغلظہ کے بعد ان کا آپس میں میاں بیوی کی
 حیثیت سے رہنا حرام ہے، زنا کے زمرے میں آئے گا، انہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا
 چاہئے اور اس محلے یا بستی کے لوگوں کو انہیں اس پر متوجہ کرنا چاہئے، اگر وہ اس کے
 باوجود باز نہ آئیں تو ان کا سماجی مقاطعہ (Social Boycott) کرنا چاہئے،
 البتہ چونکہ مطلقہ خاتون اسی مطلق شوہر سے صاحبِ اولاد ہیں، ان کے پانچ جوان
 بچے ہیں، لہذا ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ اگر وہ یا ان کی اولاد مالی استطاعت رکھتے ہیں
 تو وہ اپنی اولاد کے ساتھ الگ مکان میں رہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے
 کہ: جو مقامِ تہمت پر ٹھہرا، تو پھر اسے چاہئے کہ بدگمانی کرنے والوں کو ملامت نہ
 کرے (بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرے کہ اس نے خود انہیں موقع فراہم کیا)، لیکن اگر
 ان کی اور ان کی اولاد کی اتنی مالی استطاعت نہیں ہے اور سابق طلاق دینے والے
 شوہر کا مکان اتنا وسیع ہے کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ شرعی ستر و حجاب کی پابندی کو قائم

رکھتے ہوئے اجنبی کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں اور شوہر اپنی اولاد کی ماں ہونے کی حیثیت سے انہیں اس کی اجازت دیتا ہے، تو پھر وہ وہاں اپنی اولاد کے ساتھ رہ سکتی ہیں، لیکن یہ امر واضح رہے کہ شرعاً وہ ایک دوسرے کے لئے ہمیشہ اجنبی رہیں گے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

ثبوت طلاق کے طریقے

سوال: 122

میرا نام اسماء بیگم ہے، میرے شوہر محمد حماد نے مختلف مواقع پر مجھے تین طلاقیں دیں ان الفاظ کے ساتھ ”میں نے تمہیں طلاق دی“ اور طلاق کا کوئی کواہ نہیں ہے، اب میرا شوہر مجھے اپنے ساتھ رہنے کے لئے کہتا ہے، اس بارے میں مجھے آپ اپنے فیصلے سے نوازیں، (اسماء بنت محمد امین شیخ، L-505 سیکٹر 2-B-5 مارٹھ کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئلہ میں بر تقدیر صدق سائلہ مذکورہ شخص نے اپنی منکوحہ کو جو تین طلاقیں دی ہیں، وہ مؤثر ہیں اور دایماً طلاق اسی وقت سے واقع ہوگئی اور آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے شوہر نے جو تین طلاقیں دی ہیں، تو اس پر کوئی کواہ نہیں ہے، عند اللہ طلاق واقع ہونے کے لئے کواہوں کی موجودگی، لازم نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْهَا بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۖ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا۔

ترجمہ: ”پھر اگر (شوہر اپنی بیوی کو دو طلاق دینے کے بعد) اسے تیسری طلاق بھی

دے دے، تو اب وہ عورت اس (سابق شوہر) کے لئے حلال نہیں، یہاں تک کہ (عدت گزارنے کے بعد) وہ (مطلقہ) عورت (اپنے سابق شوہر کے علاوہ) کسی اور مرد سے نکاح کر لے (اور خدا نخواستہ ان کے درمیان نباہ نہ ہو اور وہ شوہر ثانی اسے طلاق دیدے، تو اب عدت گزارنے کے بعد وہ شوہر اول سے نکاح کر سکتی ہے)، (البقرة: 230)۔ وقوع طلاق کے بعد آپ کے شوہر کا آپ کو تحلیل شرعی کے بغیر رکھنے کا ارادہ، گناہ پر جسارت ہے اور ایک کونہ اس پر اپنے قلبی اطمینان کا اظہار ہے۔

لیکن قضاء یعنی دینی احکام کے اعتبار سے ثبوت طلاق کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ شوہر خود طلاق کا اقرار کرے، دوسرا یہ کہ طلاق پر دو گواہ موجود ہوں، اور اگر عورت طلاق طلاق کی مدعیہ ہے مگر شوہر منکر ہے، تو عدالت اسے قسم دے گی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده: ان النبي ﷺ قال في خطبته: "البينة على المدعى واليمين على المدعى عليه"۔

ترجمہ: ”عمر ابن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعی علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو اس سے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1339)۔“

یعنی کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعی علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو اسے قسم دی جائے گی۔ اور اس طرح قضاء نکاح قائم رہے گا، کیونکہ اسلامی احکام کی طرح دنیا کی کوئی

بھی عدالت محض دعوائے مدعی پر اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیتی۔ اگر شوہر جھوٹی قسم کھاتا ہے تو وہ گنہگار ہے، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقت واقعہ کے مطابق فیصلہ ہوگا، اور اس کی ساری زندگی گناہ میں گزرے گی۔

طلاق غیر مدخولہ

سوال: 123

میرا نکاح ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۵ء میں فرقان احمد خان کے ساتھ ہوا تھا، میرا نام عائشہ حیدر خان ہے فرقان احمد خان جو کہ میرے شوہر تھے، انہوں نے اپنی والدہ کے دباؤ میں آکر مجھے طلاق کا نوٹس بھجوا دیا ہے، جس میں تین بار طلاق کا لکھا ہوا ہے، اور ان کے دستخط ہیں، میری رخصتی نہیں ہوئی تھی، میں اپنے گھر میں ہی ہوں اور وہ اپنے گھر میں اب آپ مجھے اس کا فتویٰ دے دیجئے کہ آیا میرا نکاح فرقان احمد خان سے دوبارہ ہو سکتا ہے؟ اور اس کی کیا مدت ہے؟ اور پرانا نکاح ابھی تک برقرار ہے یا نہیں؟ اور میں نے اپنے نکاح کا مہر بھی نہیں لیا ہے، اس صورت میں کیا طریقہ ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں فتویٰ دیجئے، (عائشہ حیدر، R-770/16 ایف بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: اذا طلق الرجل امراته ثلاثا قبل الدخول بها وقع عليها فان فرق الطلاق بانث بالاولیٰ ولم تقع الثانية والثالثة۔ ترجمہ: ”اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو دخول سے پہلے تین طلاق دے دے تو وہ طلاق واقع ہو جاتی ہیں پس اگر علیحدہ علیحدہ الفاظ سے طلاق دی ہو تو پہلی طلاق سے طلاق بائن ہو جائے گی اور دوسری اور تیسری طلاق واقع نہیں ہوگی، (عالمگیری جلد اول

ص: 373)۔“

صورت مسئلہ میں بر تقدیر صدق سائلہ چونکہ ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی اور خلوت صحیحہ (دونوں میاں بیوی کا تنہائی میں جمع ہونا) بھی نہیں پایا گیا اور شوہر نے تین طلاق (مسئلہ طلاق نامہ میں) علیحدہ علیحدہ دی ہیں لہذا پہلی طلاق سے ہی نکاح ختم ہو گیا اور دوسری دو طلاقیں واقع نہیں ہوں گی، اس لئے کہ غیر مدخولہ (جس کے ساتھ مباشرت نہ کی گئی ہو) کو طلاق رجعی نہیں ہوتی بلکہ ایک طلاق دینے سے بھی بائن ہو جاتی ہے اور طلاق بائن دینے کے بعد وہ عورت محل طلاق نہیں رہتی، اس لئے طلاق کے دوسرے الفاظ لغو ہو جاتے ہیں، اس صورت میں یہ شوہر دوبارہ نکاح کر سکتا ہے، عدت اور تکلیف شرعی کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے: یا ایہا الذین امنوا اذ انکم حکتم المؤمنات ثم طلقتموهن من قبل ان تمسوهن فما لکم علیہن من عدة تعتلونها ج

ترجمہ: ”اے ایمان والو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں طلاق دے دو، تو تمہارے لئے ان پر کچھ عدت نہیں، جسے تم شمار کرو، (الاحزاب: 49)۔“

مگر پہلے والے نکاح میں جو مہر مقرر ہوا تھا، شوہر پر واجب ہے کہ آدھا مہر عورت کو ادا کرے، اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وان طلقتموهن من قبل ان تمسوهن وقد فرضتم لهن فريضة فنصف ما فرضتم۔

ترجمہ: ”اور اگر تم نے عورتوں کو چھونے سے پہلے طلاق دے دی، اور تم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے، تو جو مقرر ہوا تھا، اس کا آدھا (واجب) ہے، (البقرة: 237)۔“

تحلیل شرعی کے لئے شخص غیر کی قید

سوال : 124

میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے میں پھر اس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں اور حلالہ کرنا چاہتا ہوں حلالہ غیر مرد کے ساتھ ہوتا ہے لہذا میں اس وقت اس کے لئے غیر مردوں کی کیا یہ کام میں خود کر سکتا ہوں؟، (انیس محمد، لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب :

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْهُ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ط فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا۔

ترجمہ: ”پھر اگر (وہ شوہر) اسے (تیسری) طلاق دے دی تو وہ (عورت) اس (تیسری طلاق) کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت) اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کر لے۔ پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے طلاق دے دے، تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کر کے) آپس میں رجوع کر لیں، (البقرة: 230)۔“

تحلیل شرعی کے لئے آیت میں ”غیرہ“، ”ہ“، ”ہ“ ضمیر مذکر ہے، جس سے مراد زوج اول کے علاوہ دوسرا شخص ہے، آپ حلالے کے متعلق نہ سوچیں۔

حدیث مبارک میں ہے: عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: لعن رسول الله ﷺ المحلل والمحلل له۔

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: حلالہ کرنے اور حلالہ کرانے والے پر (بشرط تحلیل) رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی، (سنن ترمذی رقم الحدیث: 1120)۔“

طلاق ہوئی یا نہیں؟

سوال : 125

میرا میری بیوی سے جھگڑا ہو رہا تھا اس دوران اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے طلاق دے دو، میں نے جواب میں کہا کہ ”تجھے طلاق دوں گا، طلاق دوں گا، طلاق دوں گا“۔ میں حلفیہ کہنے کو تیار ہوں کہ میں نے یہی الفاظ کہے تھے، اور میں نے آئندہ کے لئے کہا تھا فی الحال میں نے طلاق نہیں دی، جبکہ میری بیوی کہتی ہے کہ اس نے مجھے طلاق دی ہے۔ آیا اس صورت میں طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟، (عبدالرحیم، گلستانِ جوہر بلاک 13 کراچی)۔

جواب :

صورتِ مسئلہ میں برصدق بیانِ شوہر کے الفاظ ”تجھے طلاق دوں گا، طلاق دوں گا، طلاق دوں گا“ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ یہ مستقبل میں طلاق دینے کے ارادے کا اظہار ہے اور شرعاً ارادہ طلاق، طلاق نہیں ہے۔ چونکہ آپ کے ادا کردہ تمام الفاظ ارادہ طلاق کو ظاہر کرتے ہیں اور ارادہ طلاق، طلاق نہیں ہے۔ لہذا ان تمام الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ قضاء یعنی دینوی احکام کے اعتبار سے ثبوتِ طلاق کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ شوہر خود طلاق کا اقرار کرے، دوسرا یہ کہ طلاق پر دو گواہ موجود ہوں، اور اگر عورت طلاق کی مدعیہ ہے، مگر شوہر منکر ہے، تو عدالت اسے قسم دے گی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: عن عمرو بن شعيب، عن ابيه، عن حمده: ان النبي ﷺ قال في خطبته: ”البيّنة على المدّعي واليمين على المدّعي عليه“۔

ترجمہ: ”عمر بن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم

ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعی علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے تو اس سے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1339)۔ یعنی کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعی علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے تو اسے قسم دی جائے گی۔ اور اس طرح قضاء نکاح قائم رہے گا، کیونکہ اسلامی احکام کی طرح دنیا کی کوئی بھی عدالت محض دعوائے مدعی پر اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیتی۔ اگر شوہر جھوٹی قسم کھاتا ہے، تو وہ گنہگار ہے، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقت واقعہ کے مطابق فیصلہ ہوگا، اور اس کی ساری زندگی گناہ میں گزرے گی۔

جبری طلاق کی ایک صورت

سوال: 126

ہم نے اپنی بہن کا نکاح ایک جگہ کیا اور سوچا کہ رخصتی کچھ عرصے بعد کریں گے اس رشتے سے ہمارے اور لڑکے کے گھر والے سب خوش تھے، لیکن ہمارے کچھ رشتے دار جنہوں نے اس نکاح سے پہلے ہم سے بہن کا رشتہ مانگا تھا جو ہم نے کسی وجہ سے قبول نہ کیا ان لوگوں کو اس نکاح پر اعتراض تھا انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ یہ نکاح ٹوٹ جائے لڑکی کو اغوا کرنے کی دھمکی بھی دی اور یہ بھی کہا کہ لڑکے کو قتل کر دیں گے۔ ان لوگوں نے دس بارہ افراد کا ایک گروپ بنا کر لڑکے کو گھیر لیا اس وقت ان کے پاس ہتھیار بھی تھے جس کے دم پر انہوں نے لڑکے سے ایک سادہ کاغذ پر دستخط کروا لیا اور کہا کہ اب منہ سے بھی بولو کہ میں نے طلاق دی لڑکے نے انکار کر دیا جس پر

انہوں نے مار پیٹ شروع کر دی آخر کار لڑکے کے منہ سے بھی بلوا لیا، طلاق کے الفاظ یہ تھے، (میں نے علی کو ہر و گن کی بیٹی شازیہ کو طلاق، طلاق، طلاق دی)۔ کیونکہ وہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر وہ نہ کہتا تو اسے واقعی قتل کر دیا جاتا۔ اب اس طلاق کو نہ تو لڑکا قبول کر رہا ہے اور نہ ہی لڑکی، معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ طلاق ہوئی یا نہیں؟، (وقار احمد وگن، D-33 پی ٹی سی ایل کالونی جناح ہسپتال)۔

جواب:

اصولی طور پر فقہ حنفی میں ”طلاق مکرہ“ (یعنی جس سے جبراً طلاق دلائی گئی ہو) معتبر ہے، البتہ اگر ”اکراہ تام“ یا ”اکراہ ملجی“ ہو، یعنی ایسی ضرب شدید جس میں جان یا عضو کے تلف ہونے کا حقیقی خطرہ ہو، جیسے آج کل بندوق کی نوک (Gun Point) پر دھمکی دی جاتی ہے، اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ اس دھمکی پر عمل کر لے گا، تو اسے ”اکراہ ملجی“ یا ”اکراہ تام“ کہتے ہیں۔ ایسے ”اکراہ ملجی“ کی صورت میں ہمارے فقہائے کرام نے کہا ہے کہ اگر جبر کر کے تحریراً طلاق لے لی جائے تو وہ مؤثر نہیں ہوگی، لیکن اگر جبر کر کے زبانی طلاق دلوادی جائے تو وہ مؤثر ہو جائے گی۔ چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وفی ”البحر“ أن المراد الاكراه على التلفظ بالطلاق، فلو اكراه على أن يكتب طلاق امرأته فكيب لا تطلق، لأن الكتابة أقيمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا، كذا في ”الحنانية“ ولو أقر بالطلاق كاذباً أو هازلاً وقع قضاء لا ديانة۔

ترجمہ: ”اور“ البحر الرائق“ میں ہے کہ ”اکراہ“ سے مراد یہ ہے کہ لفظاً طلاق دینے پر مجبور کر دیا گیا ہو، اگر (شوہر) کو مجبور کر دیا گیا ہو کہ اپنی بیوی کو طلاق لکھ دے، پھر اس

نے (بامر مجبوری) لکھ دیا، تو طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ تحریر اس وقت طلاق لفظی کے قائم مقام ہوتی ہے، جب اس کی حاجت ہو اور یہاں اسے حاجت نہیں ہے، (کیوں کہ وہ خود اپنی مرضی سے طلاق نہیں دینا چاہتا)، ”خانیہ“ میں اسی طرح ہے، اور اگر شوہر نے (اپنی بیوی کو) جھوٹ کے طور پر یا بطور مذاق طلاق دینے کا اقرار کیا، تو طلاق قضاۃً واقع ہو جائے گی (یعنی اگر معاملہ عدالت میں گیا تو عدالت وقوع طلاق کا فیصلہ دے گی، کیوں کہ عدالتوں میں معاملات کا فیصلہ ظاہری قرائن و شواہد پر ہوتا ہے، نیتوں پر نہیں ہوتا، جب کہ عند اللہ نیت کا اعتبار ہوگا)، (مگر) دیا گیا نہیں ہوگی، (رد المحتار علی الدر المختار جلد: 4، ص: 324 دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا: کہ ایک شخص نے کسی کے جبر و ظلم سے محض ناچار و مجبور ہو کر اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور طلاق نامہ لکھ دیا تو اس صورت میں طلاق پڑے گی یا نہیں؟۔

آپ نے جواب میں لکھا کہ: طلاق بخوشی دی جائے خواہ بھیر، واقع ہو جائے گی۔ نکاح شیشہ ہے اور طلاق سنگ، شیشہ پر پتھر خوشی سے پھینکے یا جبر سے یا خود ہاتھ سے چھٹ پڑے شیشہ ہر طرح ٹوٹ جائے گا، مگر یہ زبان سے الفاظ کہنے میں ہے، اگر کسی کے جبر و اکراہ سے عورت کو خطرہ میں طلاق لکھی یا طلاق نامہ لکھ دیا اور زبان سے الفاظ طلاق نہ کہے تو طلاق نہ پڑے گی۔ تنویر الابصار میں ہے: ویقع طلاق کل زوج بالغ عاقل ولو مکرہا او مخطئا وفي رد المحتار عن البحر ان المراد الاکراہ علی التلفظ بالطلاق، فلو اکره علی أن یکتب طلاق امرأته فکتب لا تطلق، لأن الكتابة أقيمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا۔

ترجمہ: ”ہر عاقل بالغ خاوند کی طلاق نافذ ہو جائے گی اگر چہ اسے مجبور کیا گیا ہو یا غلطی

سے طلاق دے دی، اور والدہ مختار میں بحر سے منقول ہے کہ جبر سے مراد لفظ طلاق کہنے پر مجبور کیا گیا ہو، اور اگر اس کو اپنی بیوی کو طلاق لکھنے پر مجبور کیا گیا تو اس نے مجبور ہو کر لکھ دی تو طلاق نہ ہوگی، کیونکہ کتابت کو تلفظ کے قائم مقام محض حاجت کی بناء پر کیا گیا ہے اور یہاں خاوند کو حاجت نہیں ہے۔“ مگر یہ سب اس صورت میں جبکہ اکراہ شرعی ہو کہ اسے ضرر رسائی کا اندیشہ ہو اور وہ ایذا پر قادر ہو، صرف اس قدر کہ اس (مکرہ) نے اپنے سخت اصرار سے مجبور کر دیا اور اس کے لحاظ پاس سے اسے لکھتے بنی، اکراہ کے لئے کافی نہیں، یوں لکھے گا تو طلاق ہو جائے گی، کمالا یحییٰ (جیسا کہ ظاہر ہے)، (فتاویٰ رضویہ جلد: 12، ص: 385، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“

صورتِ مسئلہ میں اگر شوہر نے جبر کی بنا پر صرف تحریری طلاق پر اکتفا کی ہوتی تو طلاق واقع نہ ہوتی اور ان کا نکاح بدستور قائم رہتا، لیکن چونکہ لفظاً بھی طلاق دے دی ہے، لہذا فقہ حنفی کی رو سے طلاق واقع ہوگئی۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: اذا طلق الرجل امراته ثلاثا قبل الدخول بها وقعت علیہا فان فرق الطلاق بانث بالاولی ولم تقع الثانية والثالثة۔

ترجمہ: ”اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو دخول سے پہلے تین طلاق دے دے تو وہ طلاق واقع ہو جاتی ہیں پس اگر علیحدہ علیحدہ الفاظ سے طلاق دی ہو تو پہلی طلاق سے طلاق بائن ہو جائے گی اور دوسری اور تیسری طلاق واقع نہیں ہوگی، (عالمگیری جلد اول ص: 373)۔“

صورتِ مسئلہ میں مسئلہ تحریری ”طلاق نامہ“ کے مطابق تین طلاقیں واقع ہو چکی ہیں، اور زوجین میں حرمتِ مغلطہ قائم ہو چکی ہے اور رجعت کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور چونکہ رخصتی نہیں ہوئی اور زوجین میں خلوت صحیحہ نہیں ہوئی، اس لئے مطلقہ پر کوئی عدت

نہیں ہے، وہ طلاق کے وقت سے ہی کہیں بھی نکاح کرنے کے لئے آزاد ہے، اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ فَمَالَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَمِدُونَهَا۔

ترجمہ: ”اے ایمان والو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں طلاق دے دو، تو تمہارے لئے ان پر کچھ عدت نہیں، جسے تم شمار کرو، (الاحزاب: 49)۔“

اور مطلقہ اپنے سابق شوہر سے نصف مقررہ مہر کی بھی حقدار ہے، اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنَصْفُ مَا فَرَضْتُمْ۔

ترجمہ: ”اور اگر تم نے عورتوں کو چھونے سے پہلے طلاق دے دی، اور تم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے، تو جو مقرر ہوا تھا، اس کا آدھا (واجب) ہے، (البقرة: 237)۔“

مطلقہ غیر مدخولہ کا مہر (1)

سوال: 127

میرے لڑکے ذیشان مسعود ولد محمد مسعود نے اپنی بیوی طاہرہ ولد محمود کو طلاق کا نوٹس بھیجا جو کہ اس نے وصول کیا، نوٹس کے الفاظ یہ تھے:

”فریق اول (ذیشان مسعود ولد محمد مسعود) نے تین طلاقیں دو گواہوں کی موجودگی میں 27 اپریل 2006ء کو دی۔“

دونوں کا صرف نکاح ہوا تھا رخصتی نہیں ہوئی تھی ذیشان مسعود سسرال جاتے تھے تنہائی میں بھی بیٹھتے تھے مگر کوئی ملاپ یا ازدواجی تعلقات استوار نہیں ہوئے، کھلے کمرے میں

بیٹھتے تھے جس میں گھر والوں کا گزر ہوتا تھا، مہر کی رقم پچیس ہزار روپے ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے آیا حق مہر ادا کیا جائے گا یا نہیں؟، (محمد مسعود، B.10/38 جوہر اسکواری گلستا ن جوہر کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئلہ بر صدق بیان سائل چونکہ شوہر نے ایک لفظ میں تین طلاقیں دی ہیں لہذا تین طلاق واقع ہو گئیں اور بغیر تحلیل شرعی کے دوبارہ ان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ سائل کے بیان کے مطابق چونکہ دونوں کے درمیان نہ تو ازدواجی تعلقات استوار ہوئے اور نہ ہی خلوت صحیحہ ہوئی لہذا شوہر پر نصف مہر کی ادائیگی لازم ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَان طَلَقْتُمُوھن مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمْسُوھنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَھنَّ فَرِیضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ

ترجمہ: ”اور اگر تم نے عورتوں کو چھونے سے پہلے طلاق دے دی، اور تم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے، تو جو مقرر ہوا تھا، اس کا آدھا (واجب) ہے، (البقرة: 237)۔“

مطلقہ غیر مدخولہ کا مہر (2)

سوال: 128

میرا نام کنول رانی ہے، میرا نکاح شیخ ہمایوں سے 3، اپریل 2002ء کو ہوا لیکن رخصتی نہیں ہوئی اور ہمارے درمیان کسی قسم کے ازدواجی تعلقات استوار نہیں ہوئے۔ ایک بار ہمایوں نے غصے میں ہم سے کہا کہ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ تم جس سے

چاہو شادی کر لو اور میرے والدین بھی میرے لئے لڑکیاں تلاش کر رہے ہیں اور جب

ہم نے کہا کہ یہ لکھ کر دیں تو وہ مکر گئے اور کہنے لگے کہ چاہے کچھ بھی کر لو میں تمہیں لٹکا کر رکھوں گا مگر طلاق نہیں دوں گا، تب ہم نے اپنے مسئلے کے حل کے لئے کورٹ سے رجوع کیا، کورٹ نے 16 جولائی 2004ء کو خلع کے آرڈر جاری کر دیئے، کورٹ سے جو خلع لی گئی ہے وہ کتنی موثر ہے؟، (کنول رانی، دستگیر، کراچی)۔

جواب :

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ولو قال تزوجی ونوی الطلاق أو الثلاث صح وان لم ينو شيئاً لم يقع كذا في العتابة۔

ترجمہ: ”اگر شوہر نے اپنی بیوی سے کہا کہ تو نکاح کر لے، ایک طلاق کی نیت سے یا تین طلاق کی نیت سے، تو صحیح یہ ہے کہ طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر طلاق کی نیت نہ ہو تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 376 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔“

صورتِ مسئلہ میں برصدق بیانِ سائلہ شوہر کے الفاظ ”چاہے کچھ بھی کر لو میں تمہیں لٹکا کر رکھوں گا مگر طلاق نہیں دوں گا“ سے واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ الفاظ بہ نیت طلاق نہیں کہے گئے، لہذا اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔

قاضی مجازِ عدالت نکاح کو فسخ کرے تو یہ ”طلاقِ بائن“ کے درجے میں ہے، اس کے نتیجے میں ”فسخ نکاح“ کے بعد زوجین عدت کے اندر ریاعت گزرنے کے بعد باہمی رضامندی سے تجدیدِ نکاح کر سکتے ہیں اور بیوی کی رضامندی نہ ہو تو وہ عدت کے بعد اپنی آزادانہ مرضی سے جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ

فما لكم عليهن من علة تعتذون بها ج

ترجمہ: ”اے ایمان والو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں طلاق دے دو، تو تمہارے لئے ان پر کچھ عذت نہیں، جسے تم شمار کرو، (الاحزاب: 49)۔“

ادائیگی مہر کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وان طلقتموهن من قبل ان تمسوهن وقد فرضتم لهن فريضة فنصف ما فرضتم۔

ترجمہ: ”اور اگر تم نے عورتوں کو چھوٹنے سے پہلے طلاق دے دی، اور تم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے، تو جو مقرر ہوا تھا، اس کا آدھا (واجب) ہے، (البقرة: 237)۔“

خلع کورٹ کے ذریعے نہیں ہوتا بلکہ زوجین کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے، جس میں بیوی اپنے مطالبہ مہر کے حق سے دستبردار ہو کر کہے کہ تم مجھے اس کے عوض طلاق دے دو اور شوہر اس کے مطالبے کو قبول کرتے ہوئے کہے کہ میں نے تمہیں خلع دیا، یہ خلع ہے اور طلاق بائن کے حکم میں ہے۔

عدالتی نکاح دراصل حاکم مجاز کی جانب سے فسخ نکاح ہے، اس کے لئے وجوہ شرعیہ کا ہونا ضروری ہے کہ شوہر بیوی کو طلاق دینے پر بھی آمادہ نہ ہو اور اسے مکمل حقوق کی ادائیگی کے ساتھ رکھے بھی نہیں، نان نفقہ نہ دے، ظلماً مارے پیٹے، حقوق زوجیت ادا نہ کرے اور معلق (Hung) رکھے، وغیرہ۔ لہذا عدالتی طلاق کے موثر ہونے کا مدا ر اس پر ہے کہ اس سلسلے میں جج نے حدود شرعیہ اور احکام شرعیہ کو ملحوظ رکھا یا نہیں، صرف اتنی بات خلع کے جواز کا سبب نہیں بن سکتی کہ عورت یہ کہے کہ: میں اس شوہر کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ میرے شوہر نے مجھے ٹیلی فون پر تقریباً سات یا آٹھ مرتبہ کہا کہ ”میں نے تمہیں طلاق دی“، یہ الفاظ تقریباً سات یا آٹھ مرتبہ کہے اب وہ اس بات پر مصر ہے کہ ہم رجوع کر سکتے ہیں۔ کیا اس کا رجوع کرنا صحیح ہے؟۔ واضح رہے کہ میرے شوہر کا مسلک شافعی ہے اور میں اہلسنت و جماعت سے تعلق رکھتی ہوں، برائے کرم قرآن و سنت کی روشنی میں جواب دیں، (میرا، M-C703 گرین ٹاؤن شاہ فیصل کالونی، کراچی)۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ ۙ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۚ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا ۚ

ترجمہ: ”پھر اگر (شوہر اپنی بیوی کو دو طلاق دینے کے بعد) اسے تیسری طلاق بھی دے دے، تو اب وہ عورت اس (سابق شوہر) کے لئے حلال نہیں، یہاں تک کہ (عدت گزارنے کے بعد) وہ (مطلقہ) عورت (اپنے سابق شوہر کے علاوہ) کسی اور مرد سے نکاح کر لے (اور خدا نخواستہ ان کے درمیان نباہ نہ ہو اور وہ شوہر ثانی اسے طلاق دیدے، تو اب عدت گزارنے کے بعد وہ شوہر اول سے نکاح کر سکتی ہے)۔ (البقرة: 230)۔“ اس کے علاوہ ان کے رجوع کی حلال اور جائز کوئی صورت نہیں ہے۔

علامہ یحییٰ بن شرف الدین نووی شافعی لکھتے ہیں:

وقد اختلف العلماء فيمن قال لا امر أنه انت طالق ثلاثا فقال الشافعي ومالك

وابو حنیفۃ احمد و جماہیر العلماء من السلف و الخلف یقع الثلاث ۔

ترجمہ: ”ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: تجھے تین طلاق (یا تجھے تین طلاقیں دیتا ہوں)، تو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، امام شافعی، امام مالک، امام اعظم ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ اجمعین اور جمہور علماء سلف و خلف کا رحمہم اللہ اجمعین کے نزدیک تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی، (شرح صحیح مسلم للنووی جلد 1 ص 478 مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی)۔“

صورتِ مسئلہ میں بر صدق بیان سائلہ اس کے شوہر نے تقریباً سات یا آٹھ مرتبہ کہا کہ ”میں نے تمہیں طلاق دی“، تین بار کی ادائیگی سے طلاق مغلظہ واقع ہو گئیں اور باقی طلاقیں لغو ہو گئیں، بغیر تحلیل شرعی کے دونوں کامیاں بیوی کے حیثیت سے رہنا ناجائز و حرام ہے، اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی تین طلاق سے عورت حرام ہو جاتی ہے اور بغیر تحلیل شرعی کے ان کے رجوع کی حلال اور جائز کوئی صورت نہیں ہے، واللہ اعلم بالصواب ۔

انکار طلاق کی صورت میں شرعاً کیا حکم ہے

سوال: 130

میرا نام افشاں انجم بنت سید رحمت علی ہے، میری شادی 20 سال قبل زبیر احمد بن قاضی معیز الدین سے ہوئی میرے تین بیٹے ہیں، میں پانچ سال سے لاہور میں مقیم ہوں اور میرے شوہر راولپنڈی میں ہوتے ہیں میں پانچ سال سے اپنے شوہر سے الگ رہ رہی ہوں اور بچے میرے ساتھ ہی لاہور میں ہیں جہاں وہ اپنی تعلیم مکمل کر رہے ہیں اور شوہر کوئی نان و نفقہ نہیں دے رہے ہیں ہمارے درمیان مستقل لڑائی جھگڑے رہتے تھے اور میرے شوہر ان جھگڑوں کے دوران طلاق کے الفاظ ادا کرتے

رہتے تھے کبھی ایک بار اور کبھی دوبار بھی ادا کرتے کہ ”میں تمہیں طلاق دیتا ہوں“ اور پھر ایک دو دن کے اندر رجوع کر لیتے اور جب میں اعتراض کرتی کہ تم نے مجھے طلاق دے دی ہے تو قرآن پاک اٹھا کر کہتے کہ میں نے ایسا نہیں کہا اور ایک بار میرے شوہر نے مسجد کے امام صاحب کے سامنے قرآن پاک اٹھا کر کہا کہ میں نے طلاق کے الفاظ ادا نہیں کئے بلکہ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ دے دوں گا اور میرے پاس کوئی گواہ نہ ہوتے جو میری بات کی تصدیق کرتے اسی وجہ سے کوئی میری بات کا یقین نہیں کرتا اب جبکہ مجھے اپنے شوہر سے الگ رہتے پانچ سال ہو رہے ہیں کبھی کبھی ان سے فون پر بات ہوتی ہے، ایک بار میں اور میرے بچے ان کو لینے گئے تھے تو شوہر نے ہم سے جھگڑا شروع کیا اور وہاں پر موجود ایک مرد اور ایک عورت کے سامنے انہوں نے کہا کہ میں نے طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی اور میرا نام لیکر انہوں نے یہ الفاظ ادا کئے تھے مگر جب ان سے پوچھا تو قسمیں کھانے لگے کہ وہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں، میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ پھر ہم یعنی میں اور بچے واپس لاہور آ گئے۔ اب آپ مجھے بتائیے کہ کیا مجھے طلاق ہو گئی ہے اور اگر ہو گئی ہے تو مجھے اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کیا کرنا ہوگا مجھے اپنے مسئلے کیلئے فتویٰ چاہئے تاکہ میرے پاس ثبوت ہو اور اگر طلاق نہیں ہوئی ہے تو اس 5 سال کی علیحدگی کے بارے میں کیا حکم ہے، وہ کوئی خرچہ نہیں دیتے ہیں، اب بھی فون پر کبھی کبھی بات چیت ہوتی ہے، ان حالات میں مجھے کیا کرنے چاہئے برائے مہربانی مجھے تحریری طور پر جواب دے دیں، (افشاں انجم، نیوکالونی مصطفیٰ آباد، لاہور)۔

جواب :

صورت مسئلہ میں بر تقدیر صدق سائلہ شوہر نے کئی مرتبہ طلاق کے یہ الفاظ

ادا کئے ہیں کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں ان الفاظ سے طلاق واقع ہو جاتی ہے اور تین مرتبہ ادا کئے جا چکے ہوں تو تین طلاق منقطع ہو جائیں گی اور رجوع کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، رجوع یا تجدید نکاح کا اختیار صرف دو طلاق تک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ ۚ فَمَا مَسَاكُكُمْ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيعِ
بِاحْسَانٍ ط

ترجمہ: ”طلاق (رجعی) دوبار ہے، پھر (عدت میں) حسن سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کے بعد) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے، (البقرہ 229)۔“

تیسری طلاق دینے کے بعد بغیر تحلیل شرعی کے دونوں کا شوہر بیوی کی حیثیت سے رہنا حرام ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ مَّا بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ط فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَتَرَاجَعَا۔

ترجمہ: ”پھر اگر (شوہر اپنی بیوی کو دو طلاق دینے کے بعد) اسے تیسری طلاق بھی دے دے، تو اب وہ عورت اس (سابق شوہر) کے لئے حلال نہیں، یہاں تک کہ (عدت گزارنے کے بعد) وہ (مطلقہ) عورت (اپنے سابق شوہر کے علاوہ) کسی اور مرد سے نکاح کر لے (اور خدا نخواستہ ان کے درمیان نباہ نہ ہو اور وہ شوہر ثانی اسے طلاق دیدے، تو اب عدت گزارنے کے بعد وہ شوہر اول سے نکاح کر سکتی ہے)، (البقرہ: 230)۔“

قضاء یعنی دینوی احکام کے اعتبار سے ثبوت طلاق کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ شوہر خود طلاق کا اقرار کرے، دوسرا یہ کہ طلاق پر دو گواہ موجود ہوں، اور اگر عورت

طلاق کی مدّعیہ ہے، مگر شوہر منکر ہے، تو عدالت اسے قسم دے گی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: عن عمرو بن شعيب، عن ابيه، عن جده: ان النبي ﷺ قال في خطبته: ”البينة على المدعى واليمين على المدعى عليه“۔

ترجمہ: ”عمرو ابن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ کواہ پیش کرے (ورنہ کواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعی علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے تو اسے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1339)۔“

یعنی کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ دو عادل مرد بطور کواہ پیش کرے (ورنہ کواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعی علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے تو اسے قسم دی جائے گی، شوہر کی قسم کے بعد فیصلہ ہوگا اور اس طرح قضاء نکاح قائم رہے گا، کیونکہ اسلامی احکام کی طرح دنیا کی کوئی بھی عدالت محض دعوائے مدعی پر اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیتی۔ اگر شوہر جھوٹی قسم کھاتا ہے، تو وہ گنہگار ہے، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقت واقعہ کے مطابق فیصلہ ہوگا، اور اس کی ساری زندگی گناہ میں گزرے گی۔

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

”بحالت اختلاف، طلاق کا ثبوت کواہوں سے ہوگا اور دو کواہ عادل شرعی شہادت پر وجہ شرعی ادا کریں کہ اس شخص نے اپنی زوجہ کو طلاق دی، طلاق ثابت ہو جائیگی، پھر اگر شوہر نفی کے کواہ دے گا یا اس بات کے کہ مطلقہ بعد طلاق اس سے بولی کچھ اصلاً مسموع نہ ہوگا، ہاں! اگر عورت کواہ پر وجہ شرعی نہ دے سکے تو شوہر پر حلف رکھا جائیگا اگر حلف سے کہہ دے گا کہ اس نے طلاق نہ دی، طلاق ثابت نہ ہوگی اور اگر

حاکم شرعی کے سامنے حلف سے انکار کرے گا تو طلاق ثابت مانی جائیگی، (فتاویٰ رضویہ جلد: 12 صفحہ 453، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔ اگر شوہر تین طلاقیں دے کر منکر ہو جاتا ہے اور طلاق کے وقت کوئی کواہ موجود نہیں تھے اور اس کے بعد بدستور اسی مطلقہ عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارتا ہے تو یہ شرعاً حرام اور زنا کی زندگی ہے، کیونکہ خلق کو تو دھوکہ دیا جاسکتا ہے، خالق کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا۔ مذکورہ صورت میں سائلہ تین طلاق کی مدعیہ ہے اور شوہر اس سے منکر ہے اور یہ بیان مدعیہ اس کے پاس اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے دو عادل مرد کواہوں کا موجود ہونا ضروری ہے لیکن اس کے پاس مذکورہ نصاب مکمل نہیں، ایسی صورت میں بیوی کو چاہئے کہ وہ اپنے شوہر کو قائل کریں کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور آخرت کے عذاب سے ڈرو، اور وہ تین طلاق جو آپ زبانی دے کر منکر ہو گئے ہیں، ان کا اقرار کر لیں اور لکھ کر دے دیں، اگر انہیں خوفِ خدا آجائے تو شریعت پر عمل کریں۔ اور اگر خدا نخواستہ وہ بدستور انکار پر ڈٹے رہیں تو ان کے انکار اور کواہوں کے نہ ہونے کی وجہ سے قضاءِ حرمت اور تفریق کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، لہذا بظاہر حکماً نکاح قائم رہے گا، اگرچہ دیامیاً اور اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں جو ابد ہی کے اعتبار سے وہ نکاح باقی نہیں ہے، دنیا میں احکام شرعی کا اطلاق ظاہر حال، قرائن اور شہادتوں یا اقرار و انکار پر ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقتِ حال کے مطابق فیصلے ہوں گے، یعنی ظاہر حال کے مطابق دنیوی عدالتوں سے جو فیصلے جاری ہوتے ہیں اور نافذ ہو جاتے ہیں، وہ حقیقتِ حال کو تبدیل نہیں کرتے۔

اگر آپ کو کامل یقین ہے کہ شوہر آپ کو تین طلاق دے چکا ہے تو ان حالات میں آپ کے لئے جائز شرعی اور قانونی راستہ یہ ہے کہ آپ عدالت سے رجوع کریں اور

عدالت کے ذریعے فسخ نکاح کرائیں، چونکہ جائز شرعی وجوہ موجود ہیں، اس لئے یہ فسخ نکاح شرعاً و قانوناً معتبر ہوگا، واللہ اعلم بالصواب۔

طلاق مدہوش

سوال: 131

میرا نام ریحان حسین خان ہے میری بیوی کا نام شازیہ ہے ہماری شادی کو بارہ سال ہو گئے ہیں اور ہماری 3 بیٹیاں ہیں، پچھلے کئی سالوں سے مجھے دماغ کی ایک بیماری ہے جس کو ڈاکٹر ز Panic Disorder کہتے ہیں اور ان دوروں (Attacks) کے درمیان مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں مر رہا ہوں اور یہ اٹیک ایک جنون کی طرح ہوتا ہے اور جتنی دیر اٹیک رہتا ہے، مجھے کچھ یاد نہیں رہتا اور مجھے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ میں نے کیا کیا، یا کیا کہا ہے جب بھی ہوتا ہے میرے گھر والے مجھے بتاتے ہیں کہ تم نے ایسا ایسا کیا تھا، پہلے یہ دورے زیادہ ہوتے تھے، لیکن علاج ہوتے رہنے کی وجہ سے ان میں کچھ کمی آئی ہے۔ میرا مستقل علاج آغا خان ہسپتال، کراچی میں ہو رہا ہے۔ 18، جون 2006ء اتوار کو میرے بھائی کے گھر رہنے گئیں ان کے ساتھ والدہ بھی تھیں رات کو مجھے بھی وہیں رکنے جانا تھا رات کو جب میں وہاں گیا تو میرا اپنی بیوی سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور میں وہاں سے اپنے گھر آ گیا ڈاکٹر ز نے مجھے ٹینشن لینے سے منع کیا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے اٹیک بڑھ جاتے ہیں، بہر حال جب میں گھر آ گیا تو مجھے پھر اٹیک ہوا اس وقت میں اپنی بیوی کو فون کر رہا تھا اس کے بعد مجھے کچھ پتہ نہیں کیا ہوا! میں زمین پر پڑا ہوا تھا اور میرے چاروں طرف میری الٹیاں (قے) تھیں، صبح جب میں بیوی بچوں کو لینے گیا تو میری بیوی نے بتایا رات کو آپ نے فون کیا تھا اور فون پر مجھے طلاق دی، مگر مجھے کچھ بھی یاد نہیں، ہاں صرف اتنا

یا دہے کہ میں اپنی بیوی سے لڑ کر آیا تھا سب ہم سب پریشان ہیں کہ اس کا شرعی مسئلہ کیا ہوگا؟، (ریحان حسین خان فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب :

صورتِ مسئلہ میں برصدق بیانِ سائل اگر طلاق دینے والے کی طلاق دیتے وقت وہی کیفیت تھی جیسا کہ سائل نے بیان کی ہے کہ وہ اس وقت دورے (Attack) کی حالت میں تھا تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ شرعاً درستی عقل شرط طلاق ہے اور اختلال عقل مانع طلاق ہے۔ ہدایہ میں ہے: **ولا يقع طلاق المصبی والمجنون والنائم لقوله عليه السلام كل طلاق جائز الا طلاق المصبی والمجنون ولان الاهلية بالعقل المميز وهما عديما العقل والنائم عديم الاختيار۔**

ترجمہ: ”اور بچے کی اور مجنوں (جنون والے) کی، اور سوئے ہوئے شخص کی طلاق واقع نہیں ہوگی، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا قول ہے کہ ہر (طلاق دینے والے شخص کی) طلاق جائز (واقع) ہے مگر بچے کی اور مجنوں کی جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ دونوں عقل سے تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور دونوں میں عقل کا عنصر نہیں پایا جاتا اور سویا ہوا شخص (چونکہ) اختیار نہیں رکھتا، (ہدایہ اولین جلد 2 ص: 338 مطبوعہ محمد علی کا رخاں اسلامی کتب کراچی)۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا يقع طلاق المصبی وان كان يعقل والمجنون والنائم والمبرسم والمغمى عليه والمدهور هكذا في فتح القدير۔

ترجمہ: ”اور بچے (نابالغ) کی طلاق واقع نہیں ہوگی اگرچہ وہ عقل رکھتا ہو اور مجنوں کی اور سوئے ہوئے شخص کی، ذات الجنب (برسام) کے مریض کی طلاق، مغمی (بیمار

جس پر بے ہوشی طاری ہو) مدہوش کی طلاق واقع نہیں ہوگی، فتح القدیر میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 353 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کورنہ)۔

اگر صورت مند بچہ بالاصحیح اور واقعی ہے اور سائل پر بوقت طلاق دورہ (Panic Attack) پڑا تھا اور اس نے اس حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دی تو وہ طلاق شرعاً لغو و باطل قرار دی جائے گی، یہ جواب صحت سوال و بیان مذکور پر مبنی ہے اور اگر سوال و بیان صحیح نہ ہوں تو جواب بھی یہ نہیں ہوگا۔

فیملی کورٹس کے فاضل جج صاحبان کی خدمت میں مؤذبانہ گزارشات

آج کل بد قسمتی سے ہمارے معاشرے میں ماضی کے مقابلے میں طلاق کی شرح ویسے بھی زیادہ ہو چکی ہے، اسی تناسب سے ”عدالتی فسخ نکاح“ کی شرح میں بھی اضافہ ہوا ہے، جسے عرف عام میں ”خلع“ کہا جاتا ہے، حالانکہ یہ شرعی ”خلع“ نہیں ہے۔ شرعی خلع یہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يَقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۖ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ۚ تِلْكَ

حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولَٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ O

ترجمہ ”اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ یہ دونوں (زوجین) اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے، تو عورت نے جو بدل خلع دیا ہے (شوہر کے اسے لینے میں) تم دونوں پر کوئی حرج نہیں ہے، یہ اللہ کی حدود ہیں، سو تم اللہ کی حدود سے تجاوز نہ کرو۔ اور جنہوں نے اللہ کی حدود سے تجاوز کیا، تو وہی لوگ ظالم ہیں، (البقرہ: 229)۔“ اس ارشاد باری تعالیٰ کی رو سے ”خلع“ یہ ہے کہ میاں بیوی اس نتیجے پر پہنچ جائیں کہ وہ ”محقوق زوجین“ کی بابت اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود کو قائم نہ رکھ پائیں گے، باہمی اعتماد نہ رہا یا نفرت پیدا ہوگئی یا کوئی اور داخلی یا خارجی سبب بن گیا اور شوہر یک طرفہ طور پر طلاق دینے پر آمادہ نہیں

ہے، تو پھر بیوی نے نکاح کے موقع پر جو ”حق مہر“ لیا ہے، وہ شوہر کو واپس کر دے اور شوہر اس کے عوض اسے طلاق دے دے، یہ ”طلاق بائن“ ہوتی ہے، اس کے بعد شوہر کو عدت کے اندر بھی یک طرفہ رجوع کا حق نہیں رہتا، البتہ باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ایک ہی طلاق دی ہو۔ ”مخلع“ قاضی کے یک طرفہ حکم سے نافذ نہیں ہوتا، اس پر زوجین کی رضامندی ضروری ہے اور قاضی کو چاہئے کہ ترغیب یا ترہیب (جس میں وہ تعزیراً حوالات میں بھی رکھ سکتا ہے) سے شوہر کو آمادہ کرے۔ فیملی کورٹس کے جج صاحبان عام طور پر شرعی حدود و قیود کی رعایت نہیں کرتے، بس صرف قانونی تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اب لگتا ہے کہ اس سلسلے میں ضابطہ کار (Procedural Law) کو اور آسان بنا دیا گیا ہے اور بعض جج صاحبان چیمبر میں ہی بیٹھ کر نکاح کو فسخ (Dissolve) کر دیتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جس تیز رفتاری سے حکومت جدید روشن خیالی (Enlightened Moderation) اور آزاد خیالی (Liberalism) لانا چاہتی ہے، ہمارا معاشرہ اس کا ساتھ نہیں دے پا رہا۔ اس لئے آئے دن لوگ عدالت سے ”فسخ نکاح“ کی ڈگری (Decree) لے کر دارالافتاء میں آتے ہیں کہ یہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں؟، نہ صرف یہ کہ مفتی کے لئے ہر فیصلے کی تائید و توثیق دشوار ہوتی ہے، بلکہ ”عدالتی ڈگری“ کے باوجود اسے معاشرہ بھی آنکھیں بند کر کے قبول کرنے لئے تیار نہیں ہوتا اور معاشرتی اخلاقی اقدار (Social Ehtical values) اور معاشرتی مزاحمت (Social Resistance) کی بھی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ بیشتر فیصلے ”قضا علی الغائب“ (IN ABSENTIA) ہوتے ہیں۔ چونکہ ہمارے ججز بھی ماشاء اللہ مسلمان ہیں اور انہیں یہ معلوم ہے کہ مجرّد دعویٰ ثبوت مقدمہ کے

لئے کافی نہیں ہوتا بلکہ ہر مقدمے میں مدعی سے اس کے دعوے کے حق میں ثبوت مانگا جاتا ہے، ”مدعی علیہ“ (Respondent) کو اپنی صفائی اور وضاحت کا موقع دیا جاتا ہے کہ یا تو وہ اعتراف جرم (Confession) کرے اور یا اپنی براءت پیش کرے۔ آج کل بالعموم یہ ہو رہا ہے کہ ”مدعی علیہ“ نہ تو اصلاً (Personally) عدالت میں حاضر ہوتا ہے اور نہ ہی وکالتاً (Through Attorney)، اس کو عدالت کی جانب سے رسمی طور پر طلبی کا نوٹس (Summon) بھیج دیا جاتا ہے، یلغ چلا جاتا ہے، اس کے دروازے پر نوٹس چسپاں کر آتا ہے یا اخبارات میں اشتہار ”اطلاع عام بابت طلبی بہ عدالت فلاں“ دیدیا جاتا ہے۔ ججز، وکلاء اور عام لوگ کب اطلاع عام کے ان روزہ مڑہ اشتہاروں کو پڑھتے ہیں یا وہ اخباران کی دسترس میں ہوتا ہے۔ جج کے منصب کو اتھارٹی اور قوت مملکت اور سربراہ مملکت کی طرف سے حاصل ہوتی ہے، لہذا جج پر لازم ہے کہ وہ حکومت یعنی پولیس کو پابند بنائے کہ وہ ”مدعی علیہ“ کو عدالت میں پیش کرے، کیونکہ یہ محض دادرسی اور حق طلبی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ حلال و حرام کا بھی مسئلہ ہے۔ حالانکہ جب ہم معلوم کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ عام طور پر ”مدعی علیہ“ اسی شہر یا ملک میں موجود ہوتا ہے، اس کا صحیح پتا بھی فریق مخالف کو معلوم ہوتا ہے۔ یہ استثناء صرف ان مقدمات میں معتبر ہو سکتا ہے، جہاں ”مدعی علیہ“ یا تو بالکل لاپتا (مفقود الخبر) ہوتا ہے یا ملک سے باہر ہوتا ہے، تاہم وہاں بھی ممکنہ طور پر پاکستانی سفارت خانے کی مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔ نیز جج کو اس بات کا پابند ہونا چاہئے کہ وہ ان وجوہ کو باقاعدہ قلمبند کرے، جن کی رو سے اس کے اطمینان اور شرح صدر اور پیش کردہ ثبوت و شواہد (Proof & Evidence) کے مطابق عورت کے لئے عملاً ممکن نہیں رہا کہ وہ شرعی حدود کو قائم رکھتے ہوئے رہنے

ازدواج کو قائم رکھ سکے یا اس کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، ہم ان میں سے بعض وجوہ کا تذکرہ آگے چل کر کریں گے۔ یہیں سے ”فسخ نکاح“ (Dissoution) اور خلع کے معاملات کو الگ کر دینا چاہئے۔ ”فسخ نکاح“ کے مقدمے میں صرف اتنی بات کافی نہیں کہ عورت کہے کہ میں شوہر کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی، جب کہ اس کی معقول وجوہ موجود نہ ہوں۔ اگر خدا نخواستہ قانون میں سقم ہے تو جج صاحبان کو پھر بھی شریعت کی رعایت، شرعی حدود و قیود، خوفِ خدا، فکرِ آخرت اور حلال و حرام کی نزاکت اور حساسیت کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ بعض حضرات ایک حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ قاضی (Judge) کو معقول وجوہ و اسباب کے بغیر بھی ”فسخ نکاح“ کا اختیار حاصل ہے، چنانچہ ارشاد رسول اللہ ﷺ ہے:

عن ابن عباس : أنَّ امرأةً ثابت بن قيس أتت النبي ﷺ فقالت: يا رسول الله، ثابت بن قيس، ما أعتبُ عليه في خلق ولا دين، ولكني أكره الكفر في الإسلام، فقال رسول الله ﷺ: اتريدين عليه حديقته قالت: نعم، قال رسول الله ﷺ: اقبل الحديقة وطلقها تطليقة۔

ترجمہ: ”عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! ثابت کے دین اور اخلاق کے بارے میں مجھے کوئی شکایت نہیں ہے، مگر یہ کہ میں اسلام میں رہتے ہوئے کفر (ناشکری اور شوہر کی نافرمانی) سے ڈرتی ہوں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اس کا وہ باغ (جو ثابت نے نکاح کے وقت مہر میں دیا تھا) واپس کر دو گی، انہوں نے عرض کیا: جی ہاں: چنانچہ انہوں نے (مہر میں لیا ہوا) وہ (باغ) شوہر کو واپس کر دیا، رسول اللہ ﷺ نے (ثابت سے) فرمایا: باغ قبول کر لو

اور اسے ایک طلاق دے دو، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5273)۔“

صحیح بخاری میں اس سے اگلی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اسے (ثابت کو) طلاق کا حکم فرمایا اور ثابت نے طلاق دے دی، اس سے آگے ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ثابت کو حکم فرمایا تو انہوں نے بیوی سے (بذریعہ طلاق) علیحدگی اختیار کر لی۔ یہ حدیث ”فسخ نکاح“ سے متعلق نہیں ہے، یعنی یہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بذاتِ خود بحیثیت حاکم و قاضی نکاح فسخ فرمایا بلکہ آپ نے بیوی کو مہر واپس کرنے اور شوہر کو طلاق دینے پر آمادہ فرمایا اور یہی خلع ہے۔ اور میری خواہش ہے کہ ہمارے فیملی کورٹس کے جج فسخ نکاح (Dissolution of Marriage) کو آخری اور ناگزیر امکانی صورت (Option) کے طور پر اختیار کریں۔ جج کی پہلی ترجیح مصالحت (Reconciliation) ہونی چاہئے، دوسری ترجیح شوہر کو رضا کارانہ طلاق پر آمادہ کرنا اور تیسری دونوں کو خلع پر آمادہ کرنا ہونی چاہئے، کیونکہ اگرچہ شریعت نے انتہائی ناگزیر صورتِ حال میں زوجین میں طلاق یا تفریق کی گنجائش رکھی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام حلال امور میں یہ سب سے زیادہ اس کے غضب کا باعث ہے، امام ابو داؤد اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابغض المحلال الى الله عز وجل الطلاق، ترجمہ: ”یعنی حلال امور میں اللہ عز وجل کے نزدیک سب سے زیادہ مبغض چیز طلاق ہے، (سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: 2171)۔“۔ ہبل کے مقام پر دو فرشتے ہاروت و ماروت بنی اسرائیل کو بطور آزمائش جادو سکھاتے تھے اور قرآن مجید میں ان کے جادو سیکھنے کا جو سب سے مذموم پہلو بتایا، وہ یہ ہے کہ نفیت علمون منہما ما یفرقون بین المرء و زوجته ط،

ترجمہ: ”یعنی وہ لوگ دونوں فرشتوں سے اس (جاو) کو سیکھتے تھے، جس کے ذریعے مرد اور عورت میں علیحدگی کرا دیں، (البقرہ: 102)۔“ اس لئے جیسا کہ میں نے عرض کیا، فیملی کورٹس کے جج صاحبان کو زوجین میں علیحدگی (Separation) کا عدالتی اختیار انتہائی ناگواری کے ساتھ آخری ناگزیر و ناپسندیدہ ترجیح (Option) کے طور پر استعمال کرنا چاہئے۔ جہاں تک رسول اللہ ﷺ کی ذات کا تعلق ہے، آپ کو ویسے بھی مومنوں پر والدیت نامہ اور مکمل تصرف کا حق حاصل ہے، اس سے زیادہ جتنا کسی عام حاکم یا قاضی کو یا کسی ولی اقرب کو حاصل ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسہم۔ ترجمہ: ”نبی کو مومنوں پر اس سے زیادہ تصرف کا حق حاصل ہے، جتنا خود ان کو اپنی ذات پر ہے، (الاحزاب: 6)۔“ اس لئے رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ بہر حال نافذ ہے اور آپ ﷺ وجوہ کو بتانے کے پابند نہیں ہیں، جبکہ عام جج، قاضی اور حاکم کی ولایت شرعی حدود و قیود کے ساتھ مشروط ہے۔ فقہ حنفی میں ”عدالتی فسخ نکاح“ کے بارے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا گیا ہے اور یہ تقریباً ناممکن العمل ہے، احتیاط میں یہ شدت اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ یہ حلال و حرام کا مسئلہ ہے، تاہم دیگر ائمہ مثلاً شافعی کے نزدیک بعض حدود و قیود کے ساتھ اس کی گنجائش موجود ہے۔ اور فقہ حنفی میں بھی یہ اصول مسلم و مختار ہے کہ ضرورت شدیدہ کی بنا پر فسخ نکاح کے لئے دوسرے ائمہ کرام کے قول پر فیصلہ دیا جاسکتا ہے، ان میں سے چند صورتیں یہ ہیں:

(1) شوہر بے انتہا مار پیٹ کرتا ہے، جسمانی و ذہنی اذیت (Physical & Mental Torturing) میں مبتلا رکھتا ہے، نہ حقوق ادا کرتا ہے نہ طلاق دے کر گلو خلاصی کرتا ہے، بس اسے معلق (Hung) رکھنا چاہتا ہے، تو ایسی صورت میں جج

ثبوت و شواہد اور قرائن قطعیہ کی بنا پر ”فسخ نکاح“ کا فیصلہ دے سکتا ہے، لیکن اسے وجوہ ریکارڈ پر لانی چاہئیں۔

(2) شوہر نان نفقہ نہیں دیتا اور بیوی کے پاس کفالت کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے، اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: (الف) یہ کہ شوہر مالدار ہے مگر ظلماً نہیں دیتا، اگر اس کا مال ظاہر ہو تو جج حکومت کے ذریعے جبراً شوہر سے نان نفقہ یعنی مصارف ضروریہ دلائے یا اسے قید کر دے جب تک وہ خود رضا کارانہ طور پر دینے پر آمادہ نہ ہو۔ (ب) اور اگر شوہر مفلس اور نادار ہے اور بظاہر اس بات کے آثار بھی نہیں ہیں کہ وہ جلد بیوی کا نفقہ دینے کے قابل ہو جائے گا اور بیوی کے لئے کوئی متبادل ذریعہ بھی دستیاب نہیں ہے، نہ ہی کوئی اور کفیل ہے اور نفقہ سے عجز کی بنا پر بیوی کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، ایسی صورت میں جج نکاح فسخ کر سکتا ہے اور اسے تفصیلی وجوہ فیصلے میں درج کرنی چاہئیں۔

(3) شوہر کسی موزی مرض میں مبتلا ہے، جیسے برص و جذام یا کینسر وغیرہ اور نکاح کے وقت بیوی کو معلوم نہیں تھا، اسے دھوکے میں رکھا گیا تھا، بعد میں اس پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی، اگر وہ اس کے باوجود رشتہ ازدواج کو قائم رکھنا چاہے تو یہ اس کے لئے سعادت کی بات ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں اجر پائے گی، لیکن اگر وہ کسی طور پر بھی آمادہ نہ ہو تو جج نکاح فسخ کر سکتا ہے اور تفصیلی وجوہ اپنے فیصلے میں درج کرے۔

(4) شوہر کو خدا نخواستہ طویل قید (جیسے پندرہ سال یا عمر قید) ہو گئی ہے اور بیوی جو اس عمر ہے، اس کے لئے اپنے فطری جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے حدود شرع میں رہنا ممکن نہیں ہے اور گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے یا کوئی اس کا کفیل نہیں ہے اور وہ عدالت سے فسخ نکاح کا مطالبہ کرتی ہے تو جج فسخ نکاح کا فیصلہ دے سکتا ہے۔

(5) شوہر بلا سبب و بلا عذر مرض وغیرہ مسلسل طویل عرصے تک حقوق زوجیت ادا نہیں کرنا تو جج تنبیہ کے بعد اور تنبیہ کے غیر موثر ہونے کے بعد نکاح فسخ کر سکتا ہے۔

(6) شوہر مجنون ہو گیا، مناسب وقت گزرنے پر بھی علاج سے صحت یاب نہ ہو سکا، اس کے جنون سے بیوی کے جسم و جاں کو خطرہ لاحق ہے یا وہ اب حقوق زوجیت کی ادائیگی اور بیوی کی کفالت کا اہل ہی نہیں رہا تو جج نکاح فسخ کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی خدا ترس ماہر ڈاکٹر یہ کہے کہ شوہر کی یہ کیفیت عارضی ہے اور مناسب وقت میں اسے افادہ ہو جائے گا تو ”فسخ نکاح“ سے پہلے مناسب مہلت دینی چاہئے۔

(7) عنین (Impotent) شوہر اور مفقود الخیر یعنی لاپتا شوہر کے فسخ نکاح کے مسائل تفصیل طلب ہیں، اس لئے ان پر کسی مناسب موقع پر الگ تفصیل سے بات ہوگی۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم جلد ثالث (صفحات: 1094 تا 1121) میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے اور ”فسخ نکاح“ کے بارے میں ائمہ اربعہ کے مسلک کو اصل مآخذ کے حوالہ جات کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ کون کون سے مواقع ہیں جہاں دوسرے ائمہ کے قول پر فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں ”مجلس قضائے شرعیہ“ بہار، اکابر علماء اہلسنت نے قائم کی تھی اور انہوں نے ”فسخ نکاح“ کے بارے میں کچھ اصول متفقہ طور پر طے کئے تھے، جن میں سے ”فسخ نکاح“ کے بارے میں بعض متفقہ وجوہ کا تذکرہ مفتی عبدالواجد قادری نے ”فتاویٰ یورپ“ میں کیا ہے۔

آخر میں میری دردمندانہ گزارش ہے کہ اگر کوئی عورت خدا نخواستہ خوفِ خدا سے عاری ہے، اس پر نفسانی خواہشات یا ہوسِ زر کا غلبہ ہے یا عشرتوں کی دلدادہ ہے اور کسی بھی

جائز سبب کے بغیر شوہر کے ساتھ بہر صورت رہنے کے لئے تیار نہیں ہے، تو ایسی صورت حال میں شوہروں کو چاہئے کہ وہ رضا کارانہ طور پر خلع پر آمادہ ہو جائیں یا ایک طرفہ طور پر طلاق دے دیں، اس پر وہ عند اللہ اجر پائیں گے اور عورت فتنہ اور گناہ میں مبتلا ہونے سے بچ جائے گی۔ اور اگر شوہر رضا کارانہ طور پر اس پر آمادہ نہ ہو تو عدالت مناسب دباؤ ڈال کر اس سے طلاق دلوائے۔

ماں کا حق نگہداشت ساقط ہونے کی صورتیں

سوال: 132

منکہ مسمیٰ شعیب یونس ولد محمد یونس کی شادی مسماۃ فارینہ بنت امان اللہ سے 11 اگست 2001ء کو ہوئی تھی۔ اس سے میرا ایک ساڑھے چار سالہ بیٹا محمد مصطفیٰ ہے۔ اس تمام عرصے میں میری بیوی کا رویہ مجھ سے کبھی محبت کا نہیں رہا اور اکثر اوقات وہ میکے میں رہنے کی خواہشمند رہتی جس پر کبھی کبھی ناراضی بھی ہوتی تھی ایک دن اچانک مجھ پر ایک عجیب انکشاف ہوا اور اس روز میں نے اسے ایک ایسے موبائل فون پر کسی لڑکے کو SMS کرتے ہوئے پکڑا جو میں نے اسے نہیں دلایا تھا اور مجھ سے خفیہ رکھا ہوا تھا، رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد اس نے اعتراف کیا کہ اس کے تعلقات دوسرے لڑکوں سے ہیں۔ اس موبائل پر تقریباً 750 SMS آئے اور تقریباً 500 گئے، جس کی تفصیل پرنٹ کے ساتھ منسلک ہے۔ یہ سب جاننے کے بعد میری غیرت نے کوارہ نہ کیا کہ ایسی عورت کو اپنے ساتھ رکھوں مگر پھر بھی میں نے ہوش میں رہتے ہوئے اس کے والدین کو بلایا اور ساری صورت حال ان کے سامنے رکھی اور ایک طلاق دے کر ان کے ساتھ بھیج دیا اس پر اس کے والدین نے نہ کسی شرمندگی کا اظہار کیا اور نہ ہی معافی مانگی اور میرے بچے کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ میرا

تعلق ایک دین دار گھرانے سے ہے، میں نے اس وقت مماتا کے جذبات کو ٹھیس پہنچنے کے خیال سے بچے کو ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی، مگر اس کی بے راہ روی اور غیر اخلاقی حرکات کو دیکھتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ اپنے بچے کو ساتھ رکھوں اور اس کی پرورش دینی ماحول میں کروں۔

محترم مفتی صاحب ان حالات میں آپ کا مشورہ اور فتویٰ درکار ہے تاکہ میں اپنے بچے کو اس گندے ماحول سے نکال کر اپنے پاس رکھوں اور اس کی تربیت دینی ماحول میں کر سکوں، جب وہ میرے پاس تھا تو اسکول بھی جاتا تھا لیکن اس کی ماں نے چار ماہ سے اسے اسکول نہیں بھیجا، بچے کا مستقبل خراب ہو رہا ہے۔ برائے مہربانی بچے کی کفالت اور حصول کے لئے شرعی اور قانونی رہنمائی فرمائیں تاکہ بچے کا مستقبل محفوظ ہو اور وہ ایک دین دار انسان بن سکے، (محمد شعیب، C-205، پرنس ایونیو، گارڈن، کراچی)۔

جواب:

شرعاً بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہوتا ہے لیکن اگر ایسے اسباب پائے جائیں جو اس کے حق کو ساقط کر دیں، تو بچے کو اس کی پرورش میں نہیں دیا جائے گا، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

أحق الناس بحضانة الصغير حال قيام النكاح أو بعد الفارقة إلا أن تكون مرتدة أو فاجرة غير مأمونة كذا في الكافي۔

ترجمہ: ”نکاح قائم رہے یا (بذریعہ طلاق) تفریق ہو جائے، (دونوں صورتوں میں) بچے کی پرورش کا سب سے زیادہ حق اس کی ماں کو حاصل ہے، لیکن اگر وہ مرتدہ ہو جائے یا (فسق و) فجور میں مبتلا ہو جائے، بچے کی صحیح نگہداشت نہ کرے تو (پھر اس

کا حق ساقط ہو جاتا ہے) ”کافی“ میں بھی اسی طرح ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں
 نو كذا لو كانت سارقة أو مغنية أو نائحة فلا حق لها هكذا في النهر الفائق

ترجمہ: ”اور اسی طرح اگر وہ (ماں) چور یا گانے والی یا نوحہ خوانی کا پیشہ اختیار کئے
 ہوئے ہے، تو اس کے لئے حق پرورش نہیں ہے، ”النهر الفائق“ میں اسی طرح مذکور
 ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1 ص: 541 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔
 علامہ علاؤ الدین ہسکفی لکھتے ہیں:

”تربیت الولد (تثبت للام) النسبية (ولو بعد الفرقة الا أن تكون مرتدة أو
 فاجرة) فحسراً يضيع الولد به، كزنا وغناء وسرقة ونباحة، كما في ”البحر“
 و”النهر“ بحثاً۔ قال المصنف: والذي يظهر العمل باطلاقهم كما هو
 منذهب الشافعي أن الفاسقة بترك الصلاة لا حضائنة لها۔ وفي ”القنية“
 ”الأم أحق بالولد ولو سيئة السيرة معروفة بالفجور ما لم يعقل ذلك (أو
 غير مأمونة) ذكره في ”المحتجب“ بأن تخرج كل وقت وتترك الولد
 ضائعاً۔

ترجمہ: ”بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے، اگرچہ زوجین کے درمیان جدائی واقع
 ہوگئی ہو، لیکن اگر وہ (ماں) مرتدہ ہوگئی ہے یا فاجرہ ہے اور فسق ایسا ہے، جس سے بچے
 کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو، مثلاً زنا،، گانا بجانا، چوری، اور نوحہ کرنا جیسا کہ
 ”البحر الرائق“ اور ”النهر الفائق“ کی بحث میں کہا گیا ہے مصنف کہتا ہے: بظاہر
 اس قول کے اطلاق پر عمل کریں گے جیسا کہ امام شافعی کا مذہب ہے کہ اگر فاسقہ ماں
 نماز کی ناکار کہ ہے، تو اسے بھی بچے کی پرورش کا حق نہیں رہتا، اور قنیۃ“ میں ہے: ماں

بچے کی پرورش کی زیادہ حق دار ہے اگرچہ وہ اپنی سیرت و کردار میں برائی کے حوالے سے جانی جاتی ہو، بچہ اس وقت تک ماں کی پرورش میں رہے گا جب تک اسے اچھائی برائی کی تمیز نہ ہو (جب وہ باشعور ہو جائے تو اسے ماں سے علیحدہ کر لیں تاکہ ماں کو دیکھ کر اس کا کردار خراب نہ ہو) ایسے ہی اس عورت کی پرورش میں بھی نہیں دیا جائے گا، جس کے پاس بچہ غیر محفوظ ہو یعنی وہ ہر وقت بچے کو چھوڑ کر آزادانہ گھومتی پھرتی رہے، ”الجبّی“ میں اسی طرح ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

”والحاصل أنّ الحاضنة ان كانت فاسقة فسقاً يلزم منه ضياع الولد عندها سقط حقها، والا فهي أحق به الى أن يعقل فيترع كالكتابية۔

ترجمہ: ”اور حاصل کلام یہ ہے کہ پرورش کرنے والی (ماں) اگر فاسقہ ہے اور اس کے پاس رہنے سے بچے کے ضائع ہونے (یا اس کی عادات و اطوار بگڑنے) کا اندیشہ ہے تو اس (ماں) کا حق پرورش ساقط ہو جائے گا، اور اگر فاسق نہ ہو تو بچے کے باشعور ہونے تک زیادہ حق دار وہی ہے، اس کے بعد اس سے لے لیا جائے گا، جیسے ”کتابیہ“ ماں کا حکم ہے، (رد المحتار علی الدر المختار جلد 5 ص: 204, 205 دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

آپ نے سوال میں جو صورت درج کی ہے، اس کی رو سے ایسی ماں کی سرپرستی اور نگہداشت میں بچے کے کردار کے متاثر ہونے کا خدشہ ہے اور اس نے بچے کو اسکو ل سے بھی روک دیا ہے، لہذا آپ اس سے بچے کا مطالبہ کریں، اگر حوالے نہ کرے تو پنچائیت یا عدالت کے ذریعے حاصل کریں۔

بچوں کی کفالت

سوال: 133

میرا بیٹا اختر محمود 15 نومبر 2006ء کو قضائے الہی سے انتقال کر گیا ہے،

لواحقین میں درج ذیل افراد ہیں:

(1) بیوہ اختر محمود عمر 25 سال (2) ایک بیٹی عمر 4 سال

(3) ایک بیٹا عمر 2 سال (4) والد (محمود احمد)

عمر 60 سال

۱۔ وراثت کی تقسیم میں شرعی احکامات کی رو سے ہر ایک کو کس قدر حصہ ملے گا؟

۲۔ مرحوم پر جو قرض ہے اس کی ادائیگی کے متعلق بھی شرعی فیصلے سے مطلع فرمائیں؟

۳۔ بیوہ اگر نکاح ثانی کرتی ہے تو کیا ان دونوں کمسن بچوں کی کفالت ان کے دادا کے

ذمے ہوگی؟، (محمود احمد لطفی، 502- سیکٹر B-5 سر جانی ٹاؤن، کراچی)۔

جواب:

از روئے شرع کسی بھی متوفی شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین حقوق

متعلق ہوتے ہیں: (1) ترکہ کے سے اس کے مصارف تکفین و تدفین وضع کئے جاتے

ہیں (2) اس کے بعد اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو، تو اس میں سے اس کی ادائیگی کی

جاتی ہے (3) اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکہ

کی حد تک اس سے نافذ کیا جاتا ہے، بشرطیکہ وہ وصیت کسی وارث شرعی کے حق میں نہ

ہو، یہ تین امور تقسیم وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ

ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔ متوفی اختر محمود کی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ 72 حصوں میں

منقسم ہوگی، متوفی کے والد (محمود احمد) کو 12 حصے، بیوہ کو 9 حصے، بیٹے کو 34 حصے،

بٹی کو 17 حصے ملیں گے۔ جہاں تک بچوں کفالت اور حق حضانت (کوڈ لینے اور پرورش) کا تعلق ہے، شرعاً اس کے استحقاق کی ترتیب درج ذیل ہے:

علامہ علاؤ الدین حنفی لکھتے ہیں:

تربيت الولد (ثبت للام) النسبية (ثم) أى بعد الأم بأن ماتت أو لم تقبل أو أسقطت حقها أو تزوجت بأجنبي (أم الأم وان علقت) عند عدم أهلية القريب (ثم أم الأب وان علقت) بالشرط المذكور ، وأما أم ابى الأم فتزجر عن أم الأب بل عن الحالة أيضاً .

ترجمہ: ”بچے کی پرورش کا حق نسب ہی ماں کو حاصل ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: ترجمہ: ”ماں فوت ہو جائے یا بچے کو قبول نہ کرے یا اپنا حق حضانت ساقط کر دے، یا کسی ایسے شخص کے ساتھ نکاح کر لے جو بچے کے لئے اجنبی ہے تو پھر ماں کے بعد نانی کو پرورش کا حق ہے یہ استحقاق بالترتیب اوپر تک جائے گا، اگر قریب والے میں پرورش کی اہلیت نہ ہو، پھر دادی کو اور مذکورہ کے ساتھ یہ سلسلہ اوپر تک جائے گا، پھر نانا کی ماں، دادی بلکہ خالہ سے بھی موثر ہے۔

مزید لکھتے ہیں: والحاضنة أما أو غيرها (أحق به) أي بالغلام حتى يستغنى
عن النساء وقد ربيهم وبه يفتى لأنه الغالب

ترجمہ: ”پرورش کرنے والی عورت خواہ وہ بچے کی ماں ہو یا کوئی اور اس کو یہ حق اس وقت تک حاصل ہے جب تک لڑکا عورتوں کی نگرانی سے مستغنی نہ ہو جائے، جس کی مدت کا اندازہ سات سال لگایا گیا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، کیونکہ اکثر صورتوں میں یہ ضرورت اسی عمر تک رہتی ہے۔“

مزید لکھتے ہیں:

(والأم والحلة) لأم أو لأب (أحق بهما) بالصغيرة (حتى تحيض و غيرهما
أحق بها حتى تستهي) وقدر بتسع وبه يفتى -

ترجمہ: ”ماں اور نانی اور دادی لڑکی کے حیض آنے تک ان کی پرورش کا استحقاق رکھتی
ہیں، (ان کی عدم موجودگی یا عدم دستیابی کی صورت میں) دوسری پرورش کرنے والی
عورتوں کا استحقاق لڑکی کے مشہدۃ (قریب البلوغ) ہونے تک ہے اور اس کی مدت
کا اندازہ 9 سال لگایا گیا ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے، (رد المحتار علی الدر المختار، جلد 5 ص:
210 تا 216 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

صورت مسئلہ میں دونوں بچے مذکورہ بالا عمر تک ماں کے پاس رہیں گے بشرطیکہ
ماں کسی ایسے شخص کے ساتھ نکاح نہ کرے جو بچے کے لئے اجنبی ہے، اس کے بعد دادا
کو ان کی کفالت کا حق حاصل ہوگا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ بچوں کو ماں سے اس
طرح جدا کر دیا جائے کہ اس سے ملنے تک نہ دیں یہ حرام اور سخت حرام ہے۔ حدیث
مبارک میں ہے: عن ابی موسیٰ قال لعن رسول اللہ ﷺ من فرق بین
الوالدة وولدها، و بین الاخی و بین الخیہ۔

ترجمہ: ”ابی موسیٰ اشعری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص پر لعنت
فرمائی کہ جو ماں اور اس کے بچے میں جدائی پیدا کرے اور ایک بھائی کو دوسرے
بھائی سے جدا کرے، (سنن ابن ماجہ: رقم الحدیث: 2250)۔“

WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿کتاب العت﴾

عت

سوال: 134

کیا عورت کو جو مہینہ آتا ہے وہ تین بار آجائے تو کیا عت پوری ہو جاتی ہے؟، (انیس محمد، مکان 4/887 لیاقت آباد کراچی)۔

جواب:

جی ہاں! اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: والمطلقات یتربصن بانفسھن ثلاثۃ قروء۔

ترجمہ: ”اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (عقدِ ثانی سے) روکے رکھیں، (البقرہ: 228)۔“

سوال: 135

میری بیوی حلالے کے بعد بچوں کی وجہ سے عت کرنا نہیں چاہتی، کیونکہ بچوں کو اسکول اور مدرسے چھوڑنا، گھر کا سامان لانا، بچوں کی بیماری اور گھر کے دیگر بہت سارے کام ہوتے ہیں اور یہ کام کرنے والا کوئی نہیں ہے، میرے چھ بچے ہیں کیا اس صورت میں عت لازم ہے مہربانی فرما کر میری مشکل آسان فرمادیں، (انیس محمد، مکان 4/887 لیاقت آباد کراچی)۔

جواب:

عت کا پورا کرنا لازمی ہے اور دورانِ عت اس کا اور بچوں کا نفقہ ادا کرنا آپ کے ذمے لازم ہے اور جو اعذار آپ نے پیش کئے ہیں وہ شرعاً قابلِ قبول

ہیں۔ اذا طلقتم النساء فطلقوهن لعدتهن واحصوا العدة۔

ترجمہ: ”جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو، تو ان کی عدت کے وقت (سے پہلے طہر میں) انہیں طلاق دو اور عدت کا شمار رکھو، (الطلاق: 1)۔“

کیا میں دورانِ عدت طلاق گھر سے باہر جاسکتی ہوں؟

سوال: 136

مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کے چار ماہ بعد میں بہت بیمار ہو گئی اور اپنی والدہ کے گھر آ گئی تھی، اس دوران میرا میرے شوہر سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہا نہ ہی انہوں نے کسی قسم کا خرچہ دیا میرے والدین نے سارا خرچہ اٹھایا اب میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی ہے تو جناب عدت کے بارے میں فرمائیے کہ میری عدت ہوگی، کتنے دن کی ہوگی؟، میں چونکہ ڈپریشن کی مریضہ بن گئی تھی تو ڈاکٹر نے مصروف رہنے کا کہا تھا اور پونے دو سال علاج بھی ہوا میں نے ابھی تین ماہ قبل ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھانا شروع کیا ہے۔ کیا میں عدت کے دوران اسکول جاسکتی ہوں یا نہیں؟ اسکول میں پڑھانے سے میری دماغی حالت میں کافی بہتری آئی ہے ہم دونوں پونے دو سال سے جدا تھے، اولاد کا سلسلہ بھی کوئی نہیں ہوا، (فردوس جبین، بلاک 1 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب :

ہر مطلقہ مدخول بہا پر عدت لازم ہے، شوہر سے جدائی کتنی ہی طویل مدت سے ہو طلاق کے بعد عدت ضروری ہے اور غیر حاملہ جسے حیض آتا ہو، اس کی عدت بعد از طلاق تین حیض پورے کرنے ہیں، قرآن مجید میں ہے:

والمطلقات يتربصن بأنفسهن ثلثة قروء۔

ترجمہ: ”اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (عقدِ ثانی سے) روکے رکھیں، (البقرة: 228)۔“

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: لا تخرجوهن من مبیوتھن ولا ینخرجن۔

ترجمہ: تم انہیں (عدت میں) ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ خود (بھی) نہ نکلیں، (الطلاق: 1)۔“

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے: نوفي الحمام مع الصغير المطلقة تعتد في بيت كانت قبل الفرقه فيه ولا تخرج ليلاً ولا نهاراً في العدة۔

ترجمہ: جامع صغیر میں ہے مطلقہ عورت اپنے گھر میں عدت گزارے گی، دورانِ عدت رات و دن میں کسی وقت گھر سے نہیں نکلے گی، (جلد ثانی ص: 119 مطبوعہ مکتبہ حبیبیہ، کوئٹہ)۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: لا تخرج ليلاً ولا نهاراً سواء كان الطلاق ثلاثاً أو بائناً أو رجعياً۔

ترجمہ: ”رات و دن میں کسی بھی وقت (معتدہ) اس مکان سے جہاں وہ طلاق سے پہلے رہائش پذیر تھی، نہیں نکلے گی، خواہ اسے تین طلاق دی گئی ہوں یا طلاق بائن یا طلاق رجعی، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 534 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔“

صورتِ مذکورہ میں چونکہ آپ اپنے والد کی کفالت میں ہیں اور کوئی معاشی ضرورت یا مجبوری درپیش نہیں ہے اور ملازمت کرنا آپ کی معاشی مجبوری نہیں ہے، لہذا عدت کے ایام میں گھر سے نہ نکلیں، ڈپریشن وغیرہ کا عذر مسموع نہیں ہے۔

سوال: 137

میرے شوہر محمد الطاف کا انتقال ۳ فروری ۲۰۰۶ء کو ہوا ہے اور میرے پانچ بچے ہیں، جن میں سب سے بڑی بیٹی ۷ سال کی، دوسری بیٹی ۵ سال کی، بیٹا ۱۱ سال کا اور دو چھوٹے جڑواں ڈیڑھ سال کے بچے ہیں۔ میرے شوہر کا جڑی بوٹیوں کا سپلائی کا کام ہے، اور ان کا تمام پیسہ کاروبار میں لگا ہوا ہے، میرے والد کا بھی انتقال ہو چکا ہے اور میرا کوئی سگا بھائی بھی نہیں ہے۔ میں اس سلسلے میں بہت پریشان ہوں، اس لئے مجھے آپ سے یہ فتویٰ چاہئے کہ میں پردے میں رہ کر اپنے شوہر کے کاروبار کو چلا سکتی ہوں اور دکان پر کاروباری لوگوں سے بات چیت کر سکتی ہوں، فی الحال میرے ماموں زاد بھائی کاروبار کو سنبھال رہے ہیں، مگر وہ اس کا رو بار کی پیچیدگیوں سے واقف نہیں ہیں جبکہ میں اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں کئی مرتبہ کاروبار سنبھال چکی ہوں اور کاروبار کی تمام باریکیوں سے واقف ہوں، اس لئے اگر اشد ضرورت پڑے تو پردے میں گھر میں یا باہر جا کر کاروبار سنبھال سکتی ہوں، کیونکہ میرا بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ میری جوان بیٹی کاروبار کے سلسلے میں غیر مردوں کے سامنے جائے، آپ اس سلسلے میں فتویٰ دے کر میری رہنمائی کریں، (شہناز الطاف، D-120/A گلی نمبر ۱، موسیٰ کالونی، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید میں عدت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: وَالنِّسَاءُ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيُنَرُّونَ اِذَا جَاؤُاْ بِمِصْرٍ اَوْ اَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَعَشْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ

فلا جناح عليكم فيما فعلن في انفسهن بالمعروف ط ترجمہ: اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور (اپنی) بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن، پھر جب وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو کوئی حرج نہیں تم پر اس بات میں جو دستور (شرع) کے موافق وہ اپنے حق میں کریں، (البقرہ: 234)۔

عورت کو زمانہ عدت میں گھر سے نکلنا حرام ہے، ہاں! اگر عدت موت کی ہو اور اس کے پاس کھانے کو نہ ہو، بغیر گھر سے نکلے کام نہ چل سکے گا یا نقصان پہنچے گا تو اس ضرورت سے اسکے لئے جاسکتی ہے اور رات اسی گھر میں گزارے اور بغیر ضرورت شرعیہ نکلنا حرام ہے۔

در مختار میں علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: (ومعتلة موت تخرج في الحائضين، وتبيت) اکثر الليل (في منزلها) لان نفقتها عليها، فتحتاج للخروج۔

ترجمہ: ”اور جو عورت عدت وفات گزار رہی ہو وہ بوقت ضرورت دن یا رات میں نکل سکتی ہے، لیکن رات کا اکثر حصہ گھر میں گزارے، اس لئے کہ وہ اپنے اخراجات کی ذمہ دار خود ہے پس وہ اس کے لئے باہر نکلنے کی محتاج ہے، (در مختار جلد 5 صفحہ 180، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

علامہ علاؤ الدین ابی بکر بن مسعود لکھتے ہیں: نوأما المتوفى عنها زوجها فلا تخرج ليلاً ولا باس بان تخرج نهاراً في حوائجها لانها تحتاج الى الخروج بالنهار لاكتساب ما تنفق له لأنه لا نفقة لها من الزوج المتوفى بل نفقتها عليها فتحتاج الى الخروج لتحصيل النفقة۔

ترجمہ: ”پس وفات پا گیا ہو جس عورت کا شوہر وہ رات میں نہ نکلے، اور اپنی ضروریات کیلئے دن کے وقت نکلنے میں حرج نہیں اس لئے کہ وہ محتاج ہے دن کے وقت نکلنے کی تاکہ اپنا نفقہ حاصل کرے، کیونکہ اس کا نفقہ اسکے متوفی شوہر پر نہیں بلکہ وہ خود اس پر ہے پس وہ باہر نکلنے کی محتاج ہے تاکہ اپنا نفقہ حاصل کرے، (بدائع الصنائع جلد 3 صفحہ 299، مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، کجرات، ہند)۔“

صورت مسئلہ میں فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق یہ واضح ہوتا ہے کہ معتدہ وفات اپنے اخراجات اور روزگار کے لئے دن کے وقت باپردہ باہر نکل سکتی ہے۔ لہذا آپ کے لئے باپردہ ہو کر شوہر کے کام کی دیکھ بھال کے سلسلے میں نکلنا جائز ہے۔

مدتِ عدت

سوال: 138

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ: ایک عورت کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ عورت حاملہ ہے، تو اس کی عدت کتنی ہوگی؟، نیز عدتِ طلاق اور عدتِ وفات کی مدت کتنی ہے؟، آیا عدت کے دوران عورت گھر سے باہر جاسکتی ہے؟، (زاہد اللہ، کراچی)۔

جواب :

عدت (عین کی زیر کے ساتھ) کے لفظی معنی ہیں: گنتی کرنا اور عدت (عین کے پیش کے ساتھ) کے معنی ہیں: کسی معاملے کی تیاری کرنا۔ اور اصطلاحی معنی ہیں: نکاح ختم ہونے کے بعد ایک خاص مدت تک عورت کا (عقدِ ثانی سے) رکے رہنا۔ اگر عورت کو شوہر نے طلاق دے دی ہے اور وہ طلاقِ مُغلطہ ہے، یا طلاقِ رجعی ہے، مگر عدت کے اندر رجوع نہیں کیا، تو اس مطلقہ (طلاق یافتہ) عورت کو اگر حیض

(Menses) آتا ہے، تو اس کی عدت تین حیض ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: نو علی المصطلقات یتربصن بانفسھن ثلثة قروء۔ ترجمہ: ”اور طلاق یافتہ عورتوں پر لازم ہے کہ وہ (کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرنے سے پہلے) اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں (البقرہ: 228)۔“

حیض اور طہر (پاکی کے ایام) کا دورانیہ ہر عورت کا اپنا اپنا ہوتا ہے۔ اور اگر عورت کو حیض نہیں آتا، خواہ کسی طبعی یا طبی سبب سے ہو یا کم عمر ہے اور حیض آنا شروع ہی نہیں ہوا یا وہ عمر کے اس حصے میں داخل ہو گئی ہیں، جب کہ فطری طور پر حیض کا سلسلہ موقوف ہو جاتا ہے، ان کے لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: واللائى یئسن من الم حیض من نساءکم ان ارتبتم فعدتھن ثلثة اشھر واللائى لم یحضن۔ ترجمہ: ”اور تمہاری جو عورتیں حیض سے ناامید ہو چکی ہوں یا انہیں سرے سے حیض آنا ہی نہیں اور تمہیں اس امر میں شبہ ہو (کہ ان کی عدت کیا ہے؟) تو ان کی عدت تین ماہ ہے، (الطلاق: 4)۔“

جو عورت طلاق کے وقت حالت حمل میں ہو، تو اس کی عدت وضع حمل (Delivery of the child) یعنی بچہ پیدا ہونے تک ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: والائى الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن۔ ترجمہ: ”اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کا وضع حمل ہے، (الطلاق: 4)۔“

جن عورتوں کے شوہر وفات پا جائیں اور بیوہ رہ جائیں، تو ان کی عدت چارہ ماہ اور دس دن ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

والذین یتوفون منکم ویاترون ازواجاً یتربصن بانفسھن اربعة اشھر وعشرا۔ ترجمہ: ”اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور (اپنے پیچھے) بیویاں چھوڑ جائیں، تو وہ عورتیں (عتقہ ثانی سے پہلے) اپنے آپ کو چارہ ماہ دس دن

تک روکے رکھیں، (البقرة: 234)۔ اگر عورت بیوہ ہوگئی ہے اور وہ حاملہ ہے، تو اس صورت میں اس کی عدت وضع حمل تک ہی رہے گی، چنانچہ عدت وفات کے تحت علامہ علاء الدین ہسکفی لکھتے ہیں: (و) العدة (الموت اربعة اشهر وعشر مطلقا) وطئت اولا ولحرم صغيرة او كتابية تحت مسلم الا الحامل۔

ترجمہ: ”یعنی عدت وفات جو چار ماہ دس دن ہے یہ مطلقاً سب کے لئے ہے، خواہ اس سے شوہر نے مباشرت کی ہو یا نہ کی ہو، خواہ نابالغ ہو یا کوئی اہل کتاب عورت ہو جو کے کسی مسلمان کے نکاح میں تھی، سوائے حاملہ کے (کہ اس کی عدت شوہر کی وفات کی صورت میں وضع حمل ہی رہے گی)، رد المحتار علی الدر المختار، جلد: 5، ص: 150، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

عدت کی اصل حکمت ”استبراء رحم“ یعنی اس امر کا یقین کہ عورت حاملہ نہیں ہے، اس کے لئے مدت کا تعین وحی ربانی سے ہوا ہے، اسی لئے مطلقہ حاملہ کی عدت وضع حمل کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ البتہ شوہر کی وفات کی صورت میں ایک طرح سے سوگ بھی ہو جاتا ہے۔ اگر کسی عورت کا نکاح ہو گیا ہے، لیکن باقاعدہ رخصتی نہیں ہوئی یا میاں بیوی میں خلوت صحیحہ قائم نہیں ہوئی، (خلوت صحیحہ سے مراد دونوں کا تنہائی میں اس طرح سے جمع ہونا کہ ازدواجی تعلق میں کوئی طبعی مانع حائل نہ ہو) تو طلاق کی صورت میں اس عورت پر بالکل عدت نہیں ہے۔ اور وہ طلاق کے فوراً بعد کسی بھی شخص کے ساتھ اپنی مرضی سے نکاح کر سکتی ہے۔

ازدواجی تعلقات نہ ہوں تب بھی عدت ضروری ہے

سوال: 139

تقریباً 11 سال پہلے میرے گھر لڑکے کی ولادت کے بعد سے میرے شوہر میرے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم رکھنے سے محروم ہیں، اس وجہ انہوں نے 15 دن قبل مجھے طلاق دے دی ہے، تین مرتبہ انہوں نے کہا کہ ”میں نے تم کو طلاق دی“۔ تحریری طور پر بھی دینے کو تیار ہیں۔ کیا میں فوری طور پر نکاحِ ثانی کر سکتی ہوں؟ یا مجھے عدت گزارنا ہوگی اگر عدت گزارنی ہے تو کتنے دن؟، (شاہدہ رشید، R-1947/2 عزیز آباد، کراچی)۔

جواب :

ہر مطلقہ مدخول بہا پر عدت لازم ہے، شوہر سے جدائی کتنی ہی طویل مدت سے ہو طلاق کے بعد عدت ضروری ہے اور غیر حاملہ جسے حیض آتا ہو، اس کی عدت بعد از طلاق تین حیض پورے کرنے ہیں، قرآن مجید میں ہے:

والمطلقات يتربصن بأنفسهن ثلثة قروء۔

ترجمہ: ”اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (عقیدہ ثانی سے) روکے رکھیں، (البقرة: 228)۔“

صورتِ مسئلہ میں عدت پوری کئے بغیر نکاحِ ثانی ہرگز نہیں کیا جاسکتا اور عدت طلاق دینے کے فوراً بعد شروع ہو جاتی ہے اور اس کی مدت تین حیض کا گزرنہ ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

میری والدہ عدت میں ہیں ان کی عمر 53 سال ہے ان کی عدت کے دوران میری چچی کے والد کی وفات ہوگئی اور بغیر کسی بڑے کے پوچھے تمام بہن بھائیوں کے منع کرنے کے باوجود وہاں چلی گئیں۔ مگر وہ پورے پردے میں تھیں برقع پہن کر نقاب لگا کر گئی تھیں اور رات دس بجے واپس لوٹی تھیں۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ انہیں میت کے بعد دس قدم بھی نہیں نکالے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور اگر امی سے یہ غلطی سرزد ہوگئی ہے تو اس کا اگر کوئی کفارہ ہے تو بتادیں اور یہ کہ لوگ کہتے ہیں کہ عدت شوہر کے لئے تحفہ ہے انہیں کیا صداقت ہے؟ اور عدت میں کیا شرعی کام کرنے چاہئیں؟، (عارفہ عباسی، دستگیر سوسائٹی F.B ایریا، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: لَا تَخْرُجُوهُنَّ مِنْ بَيْوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا

ان ياتين بفاحشة مبينة۔

ترجمہ: تم انہیں (عدت میں) ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ خود (بھی) نہ نکلیں مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں۔ (الطلاق: 1)

عورت کے لئے عدت اسی مکان میں واجب ہے، جہاں وہ شوہر کی وفات کے وقت رہتی تھی۔ علامہ علاؤ الدین ہسکمی لکھتے ہیں:

(طلاق) أو مات وهي زائرة (في غير مسكنها عادات اليه فوراً) أو جوبه عليها (وتعتدان) أي معتدة طلاق وموت (في بيت وجبت فيه) ولا يخرجان منه (إلا أن تخرج، أو ينهدم المنزل أو تخاف) انهدامه، أو تلف

مسألهما، أو لاتتحد كراء البيت) ونحو ذلك من الضرورات، فتخرج لأقرب موضع إليه۔

ترجمہ: ”عورت کو طلاق دی گئی یا اس کا شوہر وفات پا گیا اور وہ اپنے گھر کے علاوہ کہیں اور گئی ہوئی تھی تو اسے چاہئے کہ فوراً اپنے گھر لوٹ آئے، کیونکہ یہ اس پر واجب ہے، عورت عدت طلاق گزار رہی ہو یا عدت وفات، ان دونوں کو چاہئے کہ اسی گھر میں عدت گزاریں جہاں پر عدت گزارنا، ان پر واجب ہوا ہے، ہوائے اس کے کہ انہیں (اس گھر سے) نکال دیا جائے یا مکان گر جائے یا اس کے گرنے کا خدشہ ہو یا اس کا مال تلف ہونے کا خطرہ ہو یا (مکان کرائے کا ہونے کی صورت میں کرایہ ادا کرنے کی استطاعت نہ ہو) ان جیسی صورتوں (یا مجبوریوں) کی بناء پر اس کے لئے جائز ہے کہ وہاں سے نکل کر اس سے قریب ترین جگہ پر عدت گزارے، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 5 ص: 180 دار احیاء التراث العربی بیروت)۔“ عورت کو زمانہ عدت میں گھر سے نکلنا حرام ہے، ہاں! اگر عدت وفات ہو اور اس کے پاس کھانے کو نہ ہو، گھر سے نکلے بغیر گذراؤقات مشکل ہو، تو وہ دن دن میں ان ناگزیر ضرورتوں کے لئے نکل سکتی ہے، اور رات اسی گھر میں گزارے اور بغیر ضرورت شرعیہ نکلنا حرام ہے۔ علامہ علاؤ الدین ابی بکر بن مسعود لکھتے ہیں:

وأما المتوفى عنهما زوجها فلا تخرج ليلاً، ولا بأس بان تخرج نهاراً في حوائجها لانها تحتاج الى الخروج بالنهار لاكتساب ما تنفقه لانه لا نفقة لها من الزوج المتوفى بل نفقتها عليها فتحتاج الى الخروج لتحصيل النفقة۔

ترجمہ: ”ایسی عورت جو عدت وفات میں ہے، تو وہ رات کو گھر سے (ہرگز) نہ نکلے

، البتہ دن کے وقت اپنی ضروریات کے لئے نکل سکتی ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اس لئے کہ وہ محتاج ہے دن کے وقت نکلنے کی تاکہ اپنا نفقہ حاصل کرے، کیونکہ اس کا نفقہ اسکے متوفی شوہر پر نہیں بلکہ وہ خود اس پر ہے پس وہ باہر نکلنے کی محتاج ہے تاکہ اپنا نفقہ حاصل کرے، (بدائع الصنائع جلد 3 صفحہ 299، مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، کجرات، ہند)۔“

صورتِ مسئلہ میں نہ تو آپ کی والدہ نفقہ اور دیگر ضروریات کے لئے باہر نکلنے کی محتاج ہیں اور نہ ہی دورانِ عدت جنازے میں جانا ضرورتِ شرعی ہے، اور ضرورت وہ ہوا کرتی ہے جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو جیسا کہ ابتداء میں بیان کیا گیا عدتِ حکم شرعی ہے جس کی پابندی ضروری ہے، شرعی کام صرف عدت ہی میں نہیں بلکہ تمام زندگی کرنے چاہئیں، اور اس کے لئے ضروریاتِ دین کو سیکھئے اور مستند کتب کا مطالعہ کیجئے، واللہ اعلم بالصواب۔

نفاذ اسلام

WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿کتاب الفرائض﴾

ترکہ کی تقسیم

میرے چند سوالات کا اسلامی شریعت اور حدیثوں کے حوالے سے تحریری جواب عنایت فرمائیں۔

اگر کوئی شادی شدہ عورت جو کہ تین بچوں کی ماں ہو، اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں اپنے گھر میں کسی غیر مرد سے ناجائز تعلقات کی مرتکب ہوئی ہے، جس کی وجہ سے اس کے شوہر نے اس عورت کو طلاق دے کر اس کو گھر سے نکال دیا۔

سوال: 141

- 1۔ کیا اس عورت کے والد اس کو اپنی جائیداد سے خارج کر سکتے ہیں؟۔
- 2۔ کیا اس عورت کے والد اپنی زندگی میں اس عورت کو اپنی جائیداد میں سے کچھ حصہ دے سکتے ہیں، صلہ رحمی کے طور پر؟۔
- 3۔ والد صاحب کے پاس ایک عدو گھرا اور ایک عدو فلیٹ بھی ہے، انہوں نے جب والدہ حیات تھیں تو باقاعدہ یہ کہہ دیا تھا کہ گھر بیٹے کا ہے اور فلیٹ بیٹی کا ہے اور گھر بیٹے کے نام کئے ہوئے اٹھارہ سال گزر چکے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں والد صاحب بیٹے کو گھر اور بیٹی کو فلیٹ دے سکتے ہیں، جبکہ دونوں کی قیمت میں دس گنا کا فرق ہے۔ اب والد صاحب کا مطالبہ ہے کہ جو گھر میں نے تم کو دیا تھا وہ مجھے واپس کر دو، (محمد فاروق عمران، A-10، کے ڈی اے سوسائٹی، کراچی)۔

جواب:

ہر عاقل و بالغ شخص اپنے ہر قول و فعل کا ذمہ دار ہے۔ شریعت کی رو سے بھی اور قانون کی نظر میں بھی، لہذا کسی شخص پر اپنی بالغ اولاد کے کسی فعل یا لین دین کی ذمہ

داری عائد نہیں ہوتی۔ جہاں تک اولاد کو وراثت سے محروم کرنے کا سوال ہے تو اس کا اختیار شرعاً والدین کو نہیں ہے، کیونکہ وراثت یا ترکہ اس مال کو کہتے ہیں جو کوئی شخص چھوڑ کر مر جاتا ہے۔ اس متروکہ مال میں مرنے والے کو زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال پر وصیت کے ذریعے تصرف کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ وہ وفات سے پہلے اپنی زندگی میں ایسی وصیت کر چکا ہو، لیکن وصیت میں بھی یہ شرط ہے کہ وارث کے حق میں وہ معتبر و موثر نہیں ہوتی۔ باقی متروکہ مال پر وراثت کے احکام قرآن کا ثابت شدہ قانون ہے اور اس کے رد کرنے یا اس میں رد و بدل کرنے کا کسی کو اختیار نہیں ہے، کسی ایک وارث کے حق میں بھی وصیت کو اس لئے ناقابل اعتبار اور غیر موثر قرار دیا گیا ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ کے مقررہ نظام وراثت میں تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

”سمعت أبا أمامة سمعت رسول الله ﷺ يقول: إن الله قد أعطى كل ذي حق حقه فلا وصية لوارث“

ترجمہ: ”ابو امامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے: بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے، (سنن ابی داؤد جلد 3 رقم الحدیث 2862 مطبوعہ، مؤسسة الريان، بیروت)۔“

اس غرض سے اپنا تمام مال اور جائیداد کسی ایک وارث کو دینا تا کہ دوسرے ورثاء محروم ہو جائیں ناجائز اور باعہث گناہ ہے، بلا وجہ شرعی وارث کو محروم کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔ حدیث مبارک میں فرمایا: عن أنس بن مالك: قال: قال رسول الله ﷺ: ”من فتر من ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة“۔

ترجمہ: جو شخص اپنے وارث کو میراث (پہنچنے سے) راہ فرار اختیار کرے، اللہ تعالیٰ اس کی میراث جنت سے قطع کر دے گا، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 2703 مطبوعہ دار الفکر بیروت)۔

اولاد میں سے کسی کو اپنے ماں باپ سے ان کی زندگی میں یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ اپنے مال یا جائیداد یا وراثت میں سے ہمیں حصہ دو۔ ہر عاقل و بالغ زندہ شخص کو اپنے مال پر شرعی حدود میں تصرف کرنے کا پورا پورا حق ہے۔ اور جب تک کوئی شخص زندہ ہے، اس کا مال اس کی ملکیت ہے، ترکہ یا وراثت نہیں ہے کہ کوئی وارث بن کر اس میں سے اپنے حصے کا مطالبہ کرے۔

کسی شخص کی زندگی میں، اس کا ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتی، وہ اپنے مال کا مالک و مختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے تو شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ وہ تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، مگر یہ تقسیم وراثت نہیں کہلائے گی بلکہ ”نصبہ“ کہلائے گا اور ”نصبہ“ میں اولاد کے درمیان مساوات کی ترغیب دی گئی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی حدیث مبارک ہے:

حدثني النعمان بن بشير أنَّ أُمَّةَ بِنْتِ رَوَاحَةَ سَأَلَتْ أَبَاهُ بَعْضَ الْمَوْهَبَةِ مِنْ مَالِهِ لِابْنِهَا، فَالْتَوَى بِهَا سَنَةً، ثُمَّ بَدَأَ لَهُ فَقَالَتْ: لَا أَرْضِي حَتَّى تُشْهَدَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَيَّ مَا وَهَبْتُ لِابْنِي، فَاخَذَ أَبِي بَيْدِي، وَأَنَا يَوْمَئِذٍ غُلَامٌ، فَاتَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ! إِنَّ أُمَّ هَذَا بِنْتَ رَوَاحَةَ، أَحَبُّهُمَا أَنْ أُشْهَدَكَ عَلَيَّ الَّذِي وَهَبْتُ لِابْنِهَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: "يَا

بشیراً ألك ولدٌ سوى هذا؟“ قال: نعم، فقال: اكلهم وهبت له مثل هذا؟
قال: لا۔ قال: فلا تشهدني إذن، فأتى لا يشهد على جورٍ“۔

ترجمہ: ”نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ان کی والدہ حضرت بنت رواحہ نے ان کے والد سے درخواست کی کہ وہ اپنے مال میں سے کچھ ان کے بیٹے (حضرت نعمان) کو ہبہ کر دیں، میرے والد نے ایک سال تک یہ معاملہ ملتوی رکھا، پھر انھیں اس کا خیال آیا، میری والدہ نے کہا میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گی جب تک کہ تم میرے بیٹے کے ہبہ پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ نہ کر لو، میرے والد میرا ہاتھ پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے۔ اس وقت میں نو عمر لڑکا تھا، انہوں نے کہا! یا رسول اللہ ﷺ! اس کی ماں بنت رواحہ یہ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو اس چیز پر گواہ کر لوں، جو میں نے اپنے اس لڑکے کو ہبہ کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا، اے بشیر! کیا اس کے علاوہ تمہاری اور بھی اولاد ہے؟، انہوں نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے سب کو اتنا ہی مال ہبہ کیا ہے؟، انھوں نے کہا نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: پھر مجھے گواہ نہ بناؤ، کیونکہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا۔“۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4104، جلد: 7، مطبوعہ نزار مصطفیٰ الباز الریاض، مکۃ المکرمۃ)

مذکورہ حدیث سے واضح ہوا کہ جب کوئی شخص اپنی حیات میں اپنی اولاد کو کچھ ہبہ کرے تو تمام اولاد کے درمیان مساوات کو روارکھے، لیکن اگر کوئی خاص شرعی وجہ موجود ہو تو اپنی اولاد میں کسی کو زیادہ بھی دے سکتا ہے مثلاً زیادہ فرماں بردار ہے یا معذور ہے تو دیگر ورثاء کی رضامندی سے اسے زیادہ دے سکتا ہے۔ تاہم باپ کی زندگی میں اولاد کو اس سے یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنی وراثت تقسیم

کر دیں، کیونکہ ابھی تو ماشاء اللہ وہ حیات میں ہیں، اور ان کا مال ترکہ تو ان کے انتقال پر بنے گا، اُس وقت جو شرعی ورثاء موجود ہوں گے، وہ حسب احکام شریعت اپنے اپنے حصے کے حق دار ہوں گے۔

ہبہ کر کے اس سے رجوع کرنے کو حدیث پاک میں ایک معیوب اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے اور یہ مکروہ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(۱) المعائد فی ہبۃ کالعائد فی قیۃ۔ ”ہبہ کر کے اس سے رجوع کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو تے کر کے دوبارہ اسے چاٹ لے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۰۶۲)۔“

(۲) مثل الذی رجع فی صدقۃ کمثل الکلب یقی ثم یعود فی قیۃ فیما کله۔ ”جو شخص صدقہ کر کے اس سے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال اس کتے کی ہے جو تے کرتا ہے، پھر لوٹ کر اسے کھا لیتا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۰۵۸)۔“

ایک یا دو اشخاص کا دیگر ورثاء کی موجودگی میں تمام جائیداد پر قابض ہو جانا

سوال: 142

عرض یہ ہے کہ میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے والد کا فیڈرل بی ایریا میں ڈبل اسٹوری مکان ہے، جس میں اوپر نیچے دو بھائی رہتے ہیں، ہم کل آٹھ بہن بھائی (تین بھائی اور پانچ بہنیں) ہیں، باقی بھائی بہنوں کی خواہش ہے کہ انہیں ان کا حصہ دے دیا جائے جب بڑے بھائی سے میں نے کہا کہ تم ماں باپ کے مرنے کے بعد اس مکان میں نا جائز رہ رہے ہو اس میں سب کا حق ہے تو اس نے کہا کہ فتویٰ لے آؤ، آپ قرآن و سنت کی روشنی میں فتویٰ دے دیں، (ارشاد، کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں، تو ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارف تکفین و تدفین، ادائی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک بمنفذ وصیت اگر متوفی نے کی ہو) شرعی ترتیب کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ”للذکر مثل حظ الانثیین“ (ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11) کے تحت تقسیم ہوگا۔ یہ درست ہے کہ ترکہ تمام ورثاء کے درمیان اصول وراثت کے قوانین کے مطابق جلد تقسیم ہو جانا چاہئے تھا اور اس ترکے میں تمام ورثاء کا حصہ ہے، کسی بھی وارث کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے۔ متوفی کے ترکے کے گیارہ حصے ہوں گے، ہر بھائی کو دو حصے اور ہر بہن کو ایک حصہ ملے گا۔ جب تمام ورثاء اپنے حصے کے طلبگار ہوں، تو کسی ایک یا دو ورثاء کا زبردستی دوسروں کے حصے پر غاصب و قابض بن کر رہنا درست نہیں ہے۔

لاوصیہ لوارث

سوال: 143

ایک سروے زمین جس کے سروے نمبر: 522, 99, 96, 94 ہیں، جو تقریباً 122 ایکڑ رقبے پر واقع ہے ملھہ تپو درسا نو چھنومرا دیمن کوٹھ ضلع ملیہ کراچی میں واقع ہیں۔ جس کا اصل مالک مرحوم حاجی روز و ولد بیت حاجی انکارو مرحوم ہیں، حاجی روز و کے انتقال کے بعد تین بیٹے بنام، عبد، الیاس، یوسف اور چار بیٹیاں (بشمول حاجیانی مریم) ہیں۔ کورٹمنٹ سندھ (ریونیوڈ پارٹمنٹ) کے مطابق پوری زمین صرف تین بیٹوں کے نام کر دی گئی ہے اور بیٹیوں کو اپنے حق سے محروم رکھا گیا ہے اور

ریکارڈ میں یہ لکھا گیا ہے کہ حاجی روزو نے اپنی زندگی میں پوری زمین صرف اپنے بیٹوں کے نام کر دی ہے۔ اس کاریکارڈ میں نہ کوئی گواہ ہے نہ ہی شہادت۔ ہمیں اس بات کا خدشہ ہے کہ ریکارڈ میں غلط اندراج کیا گیا ہے۔ شرعی نقطہ نظر سے حاجیانی مریم جو حاجی روزو مرحوم کی حقیقی وارث ہے اس کا مندرجہ بالا سروے نمبر میں اس صورت حال میں حق بنتا ہے کہ نہیں؟، (عبداللہ میمن، 814، بلاک 16 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارف تکفین و تدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک سمفیذ وصیت اگر متوفی نے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 10 حصوں میں منقسم ہوگا۔ تین بیٹوں کو 6 حصے (ہر ایک کو 2 حصے) چار بیٹیوں کو 4 حصے (ہر ایک کو ایک حصہ) ملیں گے، کورنمنٹ سندھ (ریوینیو ڈیپارٹمنٹ) کے مطابق کاغذات میں جن بیٹوں کو نامزد (Nominate) کیا ہے، محض نامزد کرنے سے وہ اس کے مالک نہیں اور اگر مرحوم نے اپنی زندگی میں بیٹوں کے نام کیا ہو تو شرعاً جائز نہیں اور اگر وصیت بھی کی ہو تو وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

”سمعت أبا أمامة، سمعت رسول الله ﷺ يقول: إن الله قد أعطى كل ذي حق حقه فلا وصية لوارث“۔

ترجمہ: ”ابو امامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے: بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، تو

(اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے، (سنن ابی داؤد جلد 3 رقم الحدیث 2862 مطبوعہ، مؤسسة الریان بیروت)۔“

اس غرض سے اپنا تمام مال اور جائیداد کسی ایک وارث کو دینا تا کہ دوسرے ورثاء محروم ہو جائیں ناجائز اور باعث گناہ ہے، بلا وجہ شرعی وارث کو محروم کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔ حدیث مبارک میں فرمایا: عن أنس بن مالك: قال: قال رسول الله ﷺ: ”من فتر من ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة“۔ ترجمہ: جو شخص اپنے وارث کو میراث (پہنچنے سے) راہ فرار اختیار کرے، اللہ تعالیٰ اس کی میراث جنت سے قطع کر دے گا، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 2703 مطبوعہ دار الفکر بیروت)۔

بہر حال صورتِ مسئلہ میں مرحوم روزو خان کا ترکہ اس کے تمام ورثاء میں اصول وراثت کے قوانین کے مطابق تقسیم کیا جائے گا، واللہ اعلم بالصواب۔

تقسیم ترکہ میں مقدم کون؟

سوال: 144

چوہدری سردار خان کا انتقال 1939ء میں ہوا، ان کی اولاد اور پسماندگان میں متعدد ورثاء تھے، جن کو ایک نقشے کی صورت میں ہم نے ان سب کی توارخ وفات کے ساتھ مرتب کر کے اس استفتاء کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ ان کے پوتے وحید اسلم کا 1986ء میں انتقال ہوا، متوفی وحید اسلم کے ورثاء میں ان کے تین حقیقی چچا، دو حقیقی پھوپھیاں اور چار سو تیلے چچا اور دو سو تیلی پھوپھیاں ہیں۔ لیکن وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات سے پہلے ان کے تینوں حقیقی چچا اور ایک حقیقی پھوپھی وفات پا چکی تھیں، ان کی وفات کے وقت ان کی چار سو تیلے (علاقی) چچا اور ایک حقیقی اور دو سو تیلی

پھوپھیاں حیات تھیں۔ اسکے علاوہ حقیقی چچاؤں کی اولاد (یعنی چچا زاد) کی اولاد بھی ہو
 جو تھی۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ وحید اسلم متوفی 1986ء کے والد کے نکاح میں دو بیویا
 ں تھیں، وحید اسلم کی حقیقی والدہ ان سے پہلے 1948ء میں وفات پا چکی تھیں جبکہ ان
 کی سوتیلی والدہ رحیم جان نے وحید اسلم کے بعد 1989ء میں وفات پائی۔ ہم نے
 چوہدری سردار خان کے ورثاء کا مفصل نقشہ بھی منسلک کر دیا ہے، کتاب وسنت اور فقہ
 حنفی کی روشنی میں بتائیں کہ وحید اسلم متوفی 1986ء کی وراثت کے حقدار کون کون
 ہیں، اور کون سے ورثاء محروم رہیں گے؟، (محمد امجد ریٹائرڈ سیشن جج، ماڈل ٹاؤن، بہا
 ول پور)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے، اور متوفی وحید اسلم کے ورثاء وہی ہیں، جو
 سوال میں مذکور ہیں، اور وہ لاولد ہے، تو از روئے شرع سب سے پہلے اس کے ترکے
 سے اسکی تکفین و تدفین کے مصارف وضع کئے جائیں گے، اس کے بعد اس کے ذمہ
 اگر کسی کا کوئی قرضہ تھا، تو وہ ادا کیا جائے گا، اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو
 گی تو بقیہ ترکے کی زیادہ سے زیادہ ایک تہائی حد تک وہ نافذ العمل ہوگی۔ بعد ازاں جو
 ترکہ بچے گا، شریعت کے قانون وراثت کے مطابق اس کے شرعی وارثوں میں تقسیم ہو
 گا، اس کا ترکہ چار حصوں پر منقسم ہوگا اور اس کے سوتیلے چچاؤں میں سے ہر ایک کو
 ایک ایک حصہ ملے گا (یعنی فی کس 1/4 حصہ)۔

ہمیں استفتاء میں چوہدری سردار خان کے ورثاء کا مفصل نقشہ فراہم کیا گیا ہے، لیکن اس
 میں جو

جواب مطلوب ہے، وہ چوہدری سردار خان مرحوم کے پوتے وحید اسلم ولد محمد اسلم خان

متوفی 1986ء کے ترکے سے متعلق ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ وحید اسلم متوفی 1986ء کے حصہ میں جو مورثی مال آیا ہے وہ اس کے والد محمد اسلم خان ولد چوہدری محمد سردار خان متوفی 1984ء کا ترکہ ہے، ممکن ہے اس کا اپنا کوئی کمایا ہوا مال بھی ہو، تو وہ بھی اس کے مجموعی ترکے میں شامل ہوگا، البتہ محمد اسلم خان ولد چوہدری سردار خان کا جو ترکہ وحید اسلم کو منتقل ہوگا، اس میں سے ایک 1/8 حصہ محمد اسلم خان کی بیوہ رحیم جان متوفی 1989ء (جو کہ وحید اسلم کی سوتیلی والدہ ہیں) کو ملے گا، جو محمد اسلم کی وفات کے وقت حیات تھیں، چونکہ بعد میں یہ 1989ء میں وفات پا گئیں، اس لئے ان کا ترکہ ان کے اُن شرعی ورثاء کو منتقل ہوگا، جو ان کی وفات کے وقت موجود تھے۔ وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات کے وقت ان کے حقیقی چچا وفات پا چکے تھے، البتہ ان کے چار سوتیلے چچا زندہ تھے، اور ان کی ایک حقیقی پھوپھی اور دو سوتیلی پھوپھیاں زندہ تھیں۔ حقیقی چچا اس لئے محروم ہو گئے کہ جو وارث، مورث (جس کی وراثت تقسیم ہو رہی ہے) کی وفات سے پہلے فوت ہو گیا ہو، وہ اس کا وارث نہیں بنتا، حق وراثت ان لوگوں کیلئے ہوتا ہے جو مورث (وفات یافتہ شخص) کی وفات کے وقت زندہ ہوں، وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات کے وقت اس کی حقیقی پھوپھی جنت بی بی متوفی 1991ء، سوتیلی پھوپھی متوفی 2003ء اور شفیقہ بیگم (بدستور حیات) زندہ تھیں، لیکن یہ سب وراثت سے محروم رہیں گی، کیونکہ یہ پھوپھیاں ذوی الارحام بنتی ہیں اور چار سوتیلے چچا عصبات، اور اسلام کے قانون وراثت کا شرعی اصول یہ ہے کہ عصبات ورثاء کی موجودگی میں ذوی الارحام ورثاء ترکے سے محروم رہیں گے، اسی طرح وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات سے پہلے ان کے وفات یافتہ حقیقی چچاؤں کی اولاد بھی جو کہ وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات کے وقت بقید حیات تھے، ان کے ترکے سے محروم رہیں

گے، کیونکہ اسلامی قانون وراثت کا مسلمہ اصول ہے کہ قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کر دیتا ہے، اور یہاں سوتیلے چچا ایک قرابت کے حامل ہونے کے باوجود حقیقی چچاؤں کی اولاد (یعنی ابنائے اعمام) کے ذوقرائتین ہونے کے باوجود ان کے قریب سے ہیں لہذا سارا تر کہ سوتیلے چچاؤں کو ملے گا اور حقیقی چچا زاد محروم رہیں گے۔ یہاں تک ہم نے مسئلے کا خلاصہ آسان الفاظ میں لکھ دیا ہے، اب سطور ذیل میں فنی بنیاد پر دلائل کے

ساتھ جواب ملا حظہ فرمالیجئے:

”یر تقدیر صدق بیان سائل صورة مستفسره میں مرحوم وحید اسلم کی وراثت چاروں سوتیلے چچاؤں کو ملے گی۔ اور بعد ادائے حقوق مترتبہ متقدمہ، تکلفین و تحمیز اور ادائے قرض اور مال کے تیسرے حصہ سے تمفیذ وصیت، کل جائیداد کے چار حصے کئے جائیں گے اور ہر ایک سوتیلے چچا کو ایک ایک حصہ آئے گا۔ حقیقی چچاؤں کی اولاد حقیقی پھوپھی اور سوتیلی پھوپھیاں جو کہ مرحوم کے وفات کے وقت زندہ تھیں حقیقی چچاؤں کی مذکر اولاد کو اس لئے محروم ہوگی کہ عصبیات اقرب اگرچہ اضعف ہو، البعد کو محروم کر دیتا ہے اور یہاں اگرچہ سوتیلے چچا ذوات قرابتین نہیں اور حقیقی چچاؤں کی مذکر اولاد ذوات قرابتین ہیں لیکن سوتیلے چچے میت سے اقرب ہونے کی وجہ سے حقیقی چچاؤں کی مذکر اولاد کو محروم کر دیں گے اور مرحوم کی حقیقی اور سوتیلی پھوپھیاں اور حقیقی چچاؤں کی مؤنث اولاد ذوی الارحام میں سے ہیں اور عصبیات کے ہوتے ہوئے ذوی الارحام محروم ہوتے ہیں۔

در مختار میں ہے:

ثم جزء جلدہ العم لا یورین ثم لا ب ثم ابنہ لا یورین ثم لا ب۔

ترجمہ: میت کے دادا کی جزی یعنی چچا حقیقی پھر سوتیلے چچا حقیقی چچا کا بیٹا پھر سوتیلے چچا کا بیٹا (ص: 547 مکتبہ ماجدیہ)

معلوم ہوا اگر حقیقی چچا ورثاء میں موجود نہ ہو تو سوتیلے چچا وارث ہوتا ہے اور حقیقی چچا کا بیٹا اس وقت وارث ہوگا جب سوتیلے چچا ورثاء میں موجود نہ ہوں یہ عبارت بعینہ صورت مسئلہ کا جواب ہے۔

تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق کے متن میں ہے:

ثم الاعمام ثم الالب ثم اعمام الجد علی الترتیب۔

ترجمہ: پھر متوفی کے چچا پھر متوفی کے باپ کے چچا پھر دادا کے چچا ترتیب پر۔

شارح علیہ الرحمہ نے فرمایا: (قولہ علی الترتیب) ای علی الترتیب الذی ذکرنا فی الاخوة وهو ان يقدم العم لاب وام علی العم لاب ثم العم لاب علی ولد العم لاب وام کذا یعمل فی اعمام الاب يقدم منهم ذو قرابتین عند الاستواء فی الدرجة وعندا لتفاوت فی الدرجة يقدم الاعمی۔

ترجمہ: ”(ماتن کا قول علی الترتیب) یعنی چچاؤں میں ترجیحات اسی ترتیب پر ہوں گی، جس ترتیب کو ہم نے بھائیوں میں ذکر کیا، وہ یہ کہ حقیقی چچا سوتیلے چچا، سے مقدم ہوگا، پھر سوتیلے چچا حقیقی چچا کی اولاد سے مقدم ہوگا، اسی طرح باپ کے چچاؤں میں ان میں سے دو قرابت والوں کو مقدم رکھا جائے گا جبکہ درجے میں مساوی ہوں اور درجے میں تفاوت کی صورت میں اقرب (Nearest) کو مقدم کیا جائے گا، (تبیین الحقائق جلد 6 ص: 632، بحر الرائق شرح کنز الدقائق جلد 4 ص: 498 مکتبہ سعید ایچ، ایم کمپنی)۔“

نیز ”البحر الرائق شرح کنز الدقائق میں ہے: ”واذا استوئ ابناء فی درجة من

العصبات وفي احدهما قرابة زائدة فهي اولیٰ، الا ان يكون الاخ اقرب الى الميت، مثال القرابة الزائدة اخ لا ب وام واخ لا ب، فالاخ من الاب والام اولیٰ، ومثال السبق اخ لا ب وابن اخ لا ب وام، فالاخ اولیٰ لانه اسبق الى الميت۔

ترجمہ: ”اگر عصبات میں دو بیٹے درجے میں مساوی ہوں، اور ان میں سے ایک میں زائد قرابت ہو، تو زائد قرابت والا اولیٰ ہوگا، مگر یہ کہ بھائی میت کے زیادہ قریب ہو، قرابت زائدہ کی مثال یہ ہے کہ مثلاً ایک حقیقی بھائی ہے اور ایک علاقائی (باپ شریک) بھائی ہے، تو حقیقی بھائی علاقائی بھائی سے زیادہ قریب ہے، اور سبقت کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک علاقائی بھائی ہے اور ایک حقیقی بھتیجا ہے، تو علاقائی بھائی حقیقی بھتیجے کی بہ نسبت میت سے زیادہ سبقت رکھتا ہے“، (ص: 98 جلد 4)۔

درمختار کی عبارت: ”ثم لا ب ثم ابنه لا برین“ اور ”ثمین الحقاق“ اور ”الحرا لائق“: ”ثم العم لا ب علی ولد العم لا ب وام“۔

صورت مسئلہ کے جواب میں نص ہے لہذا امر حرم وحید اسلم کی جائیداد چاروں سوتیلے چچاؤں میں برابر تقسیم ہوگی اور باقی افراد محروم ہونگے، واللہ اعلم بالصواب۔

تقسیم ترکہ اور برٹش لاء

سوال: 145

برائے مہربانی قرآن اور حدیث کی روشنی میں فتویٰ عنایت فرمائیں۔ ایک شخص چوہدری سردار خان، جس کا انتقال 1939ء میں ہوا۔ اس کے سات بیٹے، چار بیٹیاں اور دو بیوہ تھیں۔ جائیداد کا انتقال ان کی وفات کے بعد بیٹوں کے نام ہو گیا، اور اس جائیداد کو پچھلے ماہ 2006ء میں فروخت کیا گیا۔ بیٹے کہتے ہیں کہ چونکہ

اس وقت پرنس لاء تھا اور بیٹیوں اور بیوگان کو جائیداد میں حصہ نہیں ملتا تھا، اس لئے ان کا اس رقم میں کوئی حصہ نہیں بنتا۔ جبکہ ہماری گزارش ہے کہ قرآن اور حدیث کا قانون جو سورۃ نساء میں ہے، اس کے مطابق فیصلہ ہونا چاہئے، برائے مہربانی آپ اس کے بارے میں فتویٰ عنایت فرمائیں اور جو اس پر عمل نہیں کرے گا آخرت میں اس کی کیا سزا ہوگی؟، (ندیم الحق، اسٹاف آفیسر ٹو چیئر مین PIA، اسلام آباد)۔

جواب:

از روئے شرع کسی بھی متوفی شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین امور کا خیال رکھنا ضروری ہے: (1) اس سے اس کے مصارف تکفین و تدفین وضع کئے جاتے ہیں (2) اس کے بعد اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو، تو اس میں سے اس کی ادائیگی کی جاتی ہے (3) اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکہ کی حد تک اس سے نافذ کیا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ وصیت کسی وارث شرعی کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیم وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔ پرنس لاء سے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا مقررہ قانون وراثت منسوخ نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ کا قانون سب پر غالب ہے اور مسلمانوں کو احکام الہی پر عمل کرنا چاہئے نہ کہ پرنس لاء پر، اگرچہ برطانوی دور میں ہندوستان میں مسلم پرسنل لاء نافذ تھا، اور اسلام کا قانون وراثت قانون نافذ العمل تھا، لہذا یہ موقف سراسر باطل ہے۔

صورت مسئلہ میں متوفی چوہدری سردار خان کا ترکہ کل 144 حصوں میں منقسم ہوگا، ان میں سے دو بیوگان کو 18 حصے (یعنی فی کس 9/144 حصے)، سات بیٹیوں کو 98 حصے (یعنی فی کس 14/144 حصے)، چار بیٹیوں کو 28 حصے (یعنی فی کس

7/144 حصے) ملیں گے۔ اگر کوئی کسی شخص کا حق غصب کرے گا، اس کے لئے رسول اللہ ﷺ کی وعید ہے: ”من اقتطع شبراً من الارض ظلماً، طوّقه الله اياه يوم القيامة من سبع ارضين“۔

ترجمہ: ”جو شخص کسی شخص کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا ظلماً اور ناحق لے گا، تو اسے سزا کے طور پر قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4055)۔ اس کے بعد ان میں سے جو افراد وفات پا چکے ہیں، تو ان کا حصہ وراثت ان کے وارثوں کو منتقل ہو جائے گا، تا آنکہ ان کے موجودہ حیات وارثوں تک پہنچے گا، تقسیم وراثت کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر کسی مورث (ترکہ چھوڑ کر وفات پانے والا شخص) کے انتقال کے فوراً بعد اس کی وراثت تقسیم نہ کی گئی ہو اور پھر اس پر کافی عرصہ گزر چکا ہو، یہاں تک کہ اس دوران کچھ ورثاء وفات پا چکے ہوں تو انہیں زندہ فرض کر کے ان کا حصہ وراثت ان کے نام پر منتقل ہوگا، اور پھر وہی حصہ مرحلہ بہ مرحلہ ان کے موجودہ حیات وارثوں تک پہنچ جائے گا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

اولد چچا کے ترکے میں بھتیجے اور بھتیجیوں کا حق وراثت

سوال: 146

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ش کی کوئی اولاد نہیں تھی، زوجہ کا بھی انتقال ہو چکا ہے اور نہ ہی کوئی بھائی یا بہن ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے دو بھتیجوں کو کاروبار میں 50% کا حصہ دار قرار دیا۔ ش کا انتقال ہو چکا ہے اور دونوں بھتیجے دوسرے حصہ دار سے معاملات طے کر کے کاروبار کو ختم کر رہے ہیں۔ اور دونوں بھائی ان کی جائیداد میں سے حصہ لے رہے ہیں جبکہ ان بھتیجوں کی 4 بہنیں بھی ہیں۔ ان بھتیجوں اور بھتیجیوں کی شادی بھی چچا نے کی ہے۔ کیا چچا کی اس

وراثت میں بھتیجیاں حصہ لینے کی حقدار ہیں یا نہیں؟۔ براہ کرم تفصیل سے قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے مطلع فرمائیں، (کوثر پروین، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

از روئے شرع کسی بھی متوفی شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین امور کا خیال رکھنا ضروری ہے: (1) اس سے اس کے مصارف تکفین و تدفین وضع کئے جاتے ہیں (2) اس کے بعد اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو تو اس میں سے اس کی ادائیگی کی جاتی ہے (3) اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکہ کی حد تک اس سے نافذ کیا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ وصیت کسی شرعی وارث کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیم وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔ ایسا مؤرث (وراثت چھوڑ کر وفات پانے والا شخص) جو لاولد ہو، اس کے ماں باپ بھی اس سے پہلے وفات پا چکے ہوں، بیوی نہ ہو یا وفات پا چکی ہو، اسے قرآن کی اصطلاح میں ”کلالہ“ کہتے ہیں۔ اس کی وراثت کے احکام ”سورۃ النساء“ میں بیان کئے گئے ہیں۔ صورت مسئلہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں تو چونکہ متوفی کے ورثاء میں اس کے دو بھتیجے اور چار بھتیجیاں ہیں اور ذوی الفروض میں کوئی قرابت دار موجود نہیں، لہذا دونوں بھتیجے عصبہ بنیں گے اور کل ترکہ انہیں ملے گا، بھتیجیاں محروم رہیں گی۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: المحقر الفرائض بأهلها فما بقى فهو لأولى رجل ذکر۔

ترجمہ: ”ذوی الفروض (یعنی وہ ورثاء جن کے حصیر آن میں مقرر ہیں) کو ان کے

مقررہ حصے دے دو، سو جو کچھ ان سے بچ رہے تو وہ قریب ترین مرد وارث کے لئے ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 6735)۔

علامہ ابن عابدین شامی بحوالہ ”سراجی“ لکھتے ہیں:

لا فرض لهما من الاناث واخوهما عصبۃ لا تصیر عصبۃ بأخیہا كالعم والعمۃ المال کله للعم دون العمۃ۔

ترجمہ: ”وہ عورتیں جن کا کوئی فرض حصہ مقرر نہیں اور ان کا بھائی عصبہ ہے تو وہ اپنے بھائی کے ساتھ عصبہ نہیں بنیں گی، جیسا چچا اور پھوپھی کہ کل ترکہ چچا کو ملے گا نہ کہ پھوپھی کو، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد: 10، ص: 429، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

اس کی شرح میں مفتی یار محمد قادری لکھتے ہیں: كذلك ابن العم یرث دون بنت العم وابن الاخ یرث دون بنت الاخ۔

ترجمہ: ”اور اسی طرح چچا کا بیٹا وارث بنے گا نہ کہ چچا کی بیٹی اور اسی طرح بھتیجا عصبہ بنے گا نہ کہ بھتیجی، (مشکوٰۃ الحواشی فی شرح السراجی، ص: 60)۔“

لا ولد پھوپھی کے ترکے میں مقدم سگے یا سوتیلے بھتیجے

سوال: 147

ایک شخص فضل دین کا انتقال ہوا اور اس کی دو بیویاں تھیں ان دونوں کا انتقال فضل دین سے پہلے ہو چکا تھا۔ ایک بیوی سے دو بیٹے اور ایک بیٹی دوسری بیوی سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ دوسری بیوی سے جو ایک بیٹی سید خانم ہیں ان کے شوہر کا انتقال پہلے ہو چکا تھا وہ لا ولد تھیں۔ میں سید خانم کا سگا بھتیجا ہوں، اور اپنے والدین

کا اکلوتا بیٹا ہوں، میری پھوپھی سید خانم کے سگے بھائی اور دوسو تیلے بھائیوں اور سوتیلی بہن کا انتقال ان سے پہلے ہو چکا تھا۔ سید خانم کے سوتیلے بہن بھائیوں کی اولاد حیات ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ سید خانم کا ترکہ صرف مجھے (حقیقی بھتیجے) کو ملے گا یا ان کے سوتیلے بھتیجوں اور بھتیجیوں کو بھی ملے گا، (محمد یوسف، کراچی)۔

جواب:

از روئے شرع کسی بھی متوفی شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین حقوق متعلق ہوتے ہیں (1) اس سے اس کے مصارف تکلفین و تدفین وضع کئے جاتے ہیں (2) اس کے بعد اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو تو اس میں سے اس کی ادائیگی کی جاتی ہے (3) اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکہ کی حد تک اس سے نافذ کیا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ وصیت کسی وارث شرعی کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیم وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔ فضل دین کا ترکہ 8 حصوں میں منقسم ہوگا، اس میں سے ان کے تین بیٹوں کو 6 حصے (فی کس 2 حصے) اور 2 بیٹیوں کو 2 حصے (فی کس ایک حصہ) ملے گا، لہذا آپ کی پھوپھی سید خانم کا اپنے والد کے ترکہ میں سے $\frac{1}{8}$ حصہ بنے گا۔

صورت مسئلہ میں آپ کی پھوپھی لا ولد تھیں آپ کے بیان کے مطابق ان کے شوہر کا انتقال ان سے پہلے ہو چکا تھا اور آپ اپنی پھوپھی کے صرف ایک ہی حقیقی بھتیجے ہیں اور باقی ان کے سوتیلے (یعنی علاقائی) بھتیجے بھانجیاں ہیں، لہذا آپ ان کے عصبہ وارث بنیں گے اور مرحومہ سید خانم کا پورا ترکہ آپ کو ملے گا، ہر اجی میں ہے: و ابن الاخ لا پ وام اولیٰ من ابن الاخ لا پ۔ ترجمہ: ”یعنی حقیقی بھتیجا، علاقائی (صرف باپ شریک) بھتیجے سے ترکہ پانے میں مقدم ہے۔“

مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان وراثت

سوال: 148

ایک شخص نے ایک کتابیہ (عیسائی) عورت سے شادی کی، اس سے اس کی اولاد ہوئی پھر اس (شوہر) کا انتقال ہو گیا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(1) کیا وہ عیسائی عورت اپنے شوہر کی وارث بنے گی؟۔

(2) اور اس کی اولاد نے اگر عیسائی مذہب اختیار کر لیا ہے، تو کیا وہ وارث بن پائیں گے؟۔

(3) اگر بچے نابالغ ہیں، تو کیا وہ وارث بنیں گے؟، (ایم، عتیق الرحمن سیال)۔

جواب:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: عن اسامة بن زيد ان النبی ﷺ قال:

لا يرث المسلم الكافر ولا يرث الكافر المسلم:

ترجمہ: ”حضرت اسامہ بن زید بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے، نہ کافر مسلمان کا وارث ہوتا ہے، (صحیح مسلم رقم الحدیث: 4028، ابی داؤد رقم الحدیث: 2901)۔“

اس حدیث کے تحت علامہ نووی لکھتے ہیں:

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا اور جمہور صحابہ اور فقہاء، تابعین اور بعد کے علماء کے نزدیک مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں ہوتا، (شرح مسلم للنووی، جلد 2 ص: 34، نور محمد اصح المطابع)۔“

میراث سے محروم کرنے والے چار اسباب ہیں، ایک سبب دین کا اختلاف ہے، یعنی میت اور وارث کا دین ایک دوسرے سے مختلف ہو۔

عن عمرو بن شعيب ، عن ابيه ، عن جده عبد الله بن عمرو قال: قال رسول الله ﷺ: لا يورث اهل ملتين شتى -

ترجمہ: ”حضرت عمرو بن شعيب اپنے والد اور دادا عبد اللہ بن عمرو سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو مختلف ملتوں کے افراد ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں گے، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: 2903)۔“

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

واختلاف الدين ايضا يمنع الارث والمراد به الاختلاف بين الاسلام والكفر واما اختلاف ملل الكفار كالنصرانية واليهودية والمجوسية وعبدة الوثن فلا يمنع الارث حتى يسحري التوارث بين اليهودي والنصراني والمجوسي واختلاف الدارين يمنع الارث كذا في التبيين- ولكن هذا الحكم في حق اهل الكفر لا في حق المسلمين -

ترجمہ: ”اور دین کا اختلاف بھی مانع ارث ہے، اور اس سے مراد اسلام اور کفر کے درمیان اختلاف ہے اور جب اختلاف کفار قوموں کے درمیان ہو، جیسا کہ نصرانی اور یہودی اور مجوسی اور بت پرست، تو پھر وہ وراثت سے مانع نہیں ہوگا (یعنی یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں)۔ یہاں تک کہ یہودی اور نصرانی اور مجوسی کے درمیان وراثت جاری ہوگی اور دار کا مختلف ہونا (یعنی دار الاسلام و دار الحرب) مانع وراثت ہے، جیسا کہ تبیین میں بیان کیا گیا ہے اور یہ حکم اہل کفر کے حق میں ہے نہ کہ مسلمان کے حق میں، (عالمگیری جلد 6 ص: 454 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔“

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(واختلاف الدين) واسلاماً و کفراً -

ترجمہ: ”(اور دین کا مختلف ہونا) مانعِ وراثت ہے یعنی کہ اسلام اور کفر کا اختلاف۔“
اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قيد به لأن الكفار يتوارثون فيما بينهم وإن اختلف مللهم عندنا، لأن الكفر
كله ملة واحدة۔

ترجمہ: ”یہ قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ ہمارے نزدیک کفار ایک دوسرے کے وارث
ہو سکتے ہیں اگرچہ ان کا تعلق مختلف ملتوں سے ہو، اس لئے کہ تمام کفر مذمتِ واحدہ ہے،“
ردالمحتار علی الدر المختار جلد 10 ص : 418، مطبوعہ دار احیاء التراث
العربی، بیروت۔“

اس مسلمہ شرعی اصول کے تحت کتابیہ عورت (خواہ نصرانی ہو یا یہودی) اپنے متوفی
مسلمان شوہر کی وارث نہیں بن سکتی۔ مسلمان شوہر اور کتابیہ عورت کی اولاد اگر نابالغ
ہے تو وہ دین میں ”خیر الابوین“ کے تابع ہے، یعنی انہیں مسلمان تصور کرتے ہوئے
ان کے مسلمان باپ کی وراثت میں حصہ دیا جائے اور اگر وہ بالغ ہیں تو مسلمان
ہونے کی صورت اپنے باپ کے وارث بنیں گے، لیکن اگر خدا نخواستہ بالغ ہونے کے
بعد وہ نصرانی یا یہودی بن گئے ہیں تو مسلمان باپ کی وراثت سے محروم رہیں گے۔
علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(والولد يتبع خیر الأبوين دیناً) ان اتحدت الدار ولو حکماً، بان کان
الصغير فی دارنا والأب ثمة،

ترجمہ: ”اور اولاد دین میں خیر الابوین (یعنی ماں باپ میں سے جس کا دین
بہتر ہو، جیسے ایک یہودی یا نصرانی ہے اور دوسرا مسلم، تو نابالغ اولاد مسلم تصور ہوگی،
اگر ایک نصرانی ہے اور دوسرا مجوسی یا مشرک، تو نابالغ اولاد نصرانی تصور ہوگی) کے

تابع ہوتی ہے، اگر وار ایک ہی ہو، خواہ حکماً ہی سہی، جیسے نابالغ اولاد وار الاسلام میں ہے اور باپ بھی وہیں ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد: 4 ص: 276 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

تقسیم وراثت سے متعلق چند اہم اصولی امور کی وضاحت

ہمیں روزنامہ ایکسپریس کی معرفت ترکے اور وراثت کے متعدد سوالات موصول ہوئے ہیں۔ سوالات کا براہ راست جواب دینے سے پہلے ہم چند امور کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں، جن کا جاننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے، اور ہر ترکے کی تقسیم سے پہلے ان کا نفاذ ضروری ہے، ہم نے یہ وضاحت اس لئے مناسب سمجھی تا کہ وراثت کے ہر سوال کے جواب میں ان کا بار بار تکرار نہ ہو، وہ امور یہ ہیں: (1) کوئی شخص زندگی میں اپنا مال اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہے تو یہ تقسیم وراثت یا تقسیم ترکہ نہیں کہلائے گی بلکہ ہبہ (Gift) کہلائے گا، یہ ایک رضا کارانہ عمل ہے، اس لئے اس شخص کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے کہ کتنا مال تقسیم کرے اور کتنا اپنے لئے پس انداز کرے۔ (2) بیوی شوہر کو یا شوہر بیوی کو جتنا مال ہبہ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ (3) اولاد کو ہبہ کرنا ہو تو مستحسن اور مستحب امر یہ ہے کہ بیٹے بیٹیوں کو مساوی حصہ دیا جائے، امتیاز نہ برتنا جائے، رسول اللہ ﷺ نے اسے ظلم سے تعبیر فرمایا ہے۔ (4) (الف) اگر اولاد میں سے کسی کو اس کی غیر معمولی خدمات کا لحاظ کر کے یا اس کی کسی ذہنی یا جسمانی پسماندگی کی بنا پر یا نسبتاً زیادہ ضرورت مند ہونے کے سبب یا دینی فضیلت کی بنا پر نسبتاً زیادہ دینے کا ارادہ ہو تو دوسروں کو اعتماد میں لے لیا جائے، تو بہتر ہے۔ (ب) اگر اولاد میں سے کوئی آوارہ و بدکردار ہے، حرام کاری اور عیاشیوں میں مبتلا ہے، تو اسے ہبہ کے وقت محروم رکھا جاسکتا ہے یا اس کے حصے میں کمی کی جاسکتی

ہے۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا کہ: ایک شخص کی اولاد ایک لڑکے اور تین لڑکیوں پر مشتمل ہے، لڑکا بد چلن اور بد وضع ہے، اپنی بہنوں اور باپ کو نہایت اذیت اور تکلیف دیتا ہے، زید اسے عاق کرنا چاہتا ہے کہ وہ ترکے میں سے حصہ نہ پائے۔ آپ نے جواب دیا: ”عاق کرنا شرع میں کوئی چیز نہیں، نہ وہ اس کے سبب ترکے سے محروم ہو سکتے ہیں، ہاں اگر واقعی فاسق و آوارہ ہے تو یہ جائز ہے کہ اپنا سب مال بذریعہ وقف علی الاولاد یا بذریعہ بیع نامہ جدا جدا تقسیم کر کے قبضہ دے کر بذریعہ ہبہ نامہ اپنی بیٹیوں کے نام کر دے، یوں بیٹے کو آپ ہی کچھ نہ پہنچے گا، (فتاویٰ رضویہ، جلد: 26، ص: 364، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“ (5) اولاد کو ماں باپ کی زندگی میں تقسیم وراثت کے مطالبے کا کوئی حق نہیں ہے، کیونکہ ”ترکہ“ یا ”وراثت“ اسے کہتے ہیں، جو مال کوئی شخص اپنی موت کے بعد پیچھے چھوڑ جائے۔ (6) میت کے ترکے میں سب سے پہلے تین قسم کے مصارف ترجیح ذیل کے مطابق وضع کئے جانے لازمی ہیں: (الف) میت کی تکفین و تدفین کے مصارف، اگر کوئی ایک وارث رضا کارانہ طور پر اپنی طرف سے کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ (ب) اس کے بعد اگر میت کے ذمہ کسی کا کوئی قرضہ ہے، تو وہ ادا کیا جائے گا۔ (ج) اگر وفات یافتہ شخص نے بیوی کا حق مہر اپنی زندگی میں ادا نہیں کیا، نہ ہی بیوی نے اپنا مہر معاف کیا ہے، تو ترکہ میں سے بیوی کا دین مہر قرض کے طور پر ہی وضع کیا جائے گا۔ (د) قرض کی منہائی کے بعد، اگر میت نے کوئی وصیت (امور خیر، صدقہ جاریہ وغیرہ سے متعلق) کی ہے، تو اسے ترکے میں سے پورا کیا جائے گا، لیکن وصیت کی تنفیذ زیادہ سے زیادہ ایک تہائی ترکے کی حد تک ہوگی، اس سے زائد باطل (Invalid) قرار پائے گی۔ البتہ اگر کوئی ایک یا بعض یا سب ورثاء بالغ ہیں اور وہ رضا کارانہ اپنے متوفی باپ/ماں

یا عزیز کی پوری وصیت نافذ کرنا چاہتے ہیں، جو تہائی ترکے سے زائد ہے، تو وہ ایسا کر سکتے ہیں اور اس پر یقیناً انہیں بھی اجر ملے گا۔ (7) جہاں تک میت کے لئے ایصالِ ثواب کے مصارف کا تعلق ہے، تو اگر اس نے اپنی وفات سے پہلے ایسی کوئی وصیت کی ہے، تو وہ زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک نافذ العمل ہوگی۔ (8) اگر وصیت نہیں کی تو بالغ ورثاء اپنی طرف سے یا ترکے میں سے اپنے حصے سے کرنا چاہیں تو رضا کارانہ طور پر کر سکتے ہیں، انہیں بھی اس کا اجر ملے گا، کوئی وارث اس پر رضا مند نہ ہو تو اس کے حصے میں سے ایصالِ ثواب کے مصارف وضع نہیں کئے جاسکیں گے۔ (9) نابالغ ورثاء کے حصے میں سے ایصالِ ثواب کے مصارف وضع نہیں کئے جاسکیں گے۔

شوہر اور بیوی کی مشترکہ کمائی سے بنائی ہوئی جائیداد اور تقسیم ترکہ

سوال: 149

ایک پلاٹ جو بیوی اور شوہر نے مشترکہ طور پر خریدا یعنی بیوی بھی فیکٹری میں کام کرتی تھی اور شوہر بھی۔ دونوں کی کمائی سے پلاٹ خریدا گیا اور شوہر نے وہ پلاٹ اپنی بیوی کے نام سے خریدا۔ بیوی کے انتقال کے بعد پلاٹ کا مالک کون ہوگا؟ جبکہ ورثاء میں اس کا شوہر اور ایک آٹھ سالہ بیٹا بھی ہے کیا بیوی کے والدین اور بھائی حصے دار یا دعوے دار بن سکتے ہیں، جھگڑا کر کے پلاٹ پر زبردستی قبضہ کر سکتے ہیں؟۔

جواب:

صورتِ مسئلہ میں اگر ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں تو وفات یافتہ خاتون کا ترکہ 12 حصوں میں منقسم ہوگا، جس میں اس کے والد کو 2/12 حصے، والدہ

کو 2/12 حصے، شوہر کو 3/12 حصے اور بقیہ 5/12 حصے بیٹے کو ملیں گے، اس کے بھائی محروم رہیں گے۔ پلاٹ کی خرید میں بیوی اور شوہر کے حصے کا تناسب وہی ہوگا، جو پلاٹ کی قیمت میں ان کے حصے کا تناسب تھا، اگر یہ پلاٹ شراکت کی نیت سے خریدا تھا۔ اور اگر شوہر نے اپنا حصہ بیوی کو ہبہ کر دیا تھا تو پھر پورے پلاٹ کی وہی مالکہ ہوگی اور اب وہ اس کے ترکے میں شامل ہوگا۔ بیوی کے والدین اس کے شرعی وارث ہیں، اس کے بیٹے کی موجودگی میں اس کے بھائی محروم رہیں گے، کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ کرنے والے کے لئے بڑی وعید آئی ہے، حدیث پاک میں ہے:

”مَنْ اقْتَطَعَ شِبْرًا مِنَ الْأَرْضِ ظُلْمًا، طَوَّقَهُ اللَّهُ أَيَّامَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرْضِينَ“۔

ترجمہ: ”جو شخص کسی شخص کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا ظلماً اور ناحق لے گا، تو اسے سزا کے طور پر قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4055)۔“

بیوی کا واجب الادا قرضہ کس کے ذمے ہوگا؟

سوال: 150

کسی شخص کی بیوی کے انتقال کے بعد اس کی بیوی پر واجب الادا قرض کی ادائیگی کون کرے گا۔ کیا شوہر اپنی جائیداد مکان وغیرہ فروخت کر کے بیوی کا قرضہ ادا کرے گا؟ ان سوالات کے تفصیلی جواب ایکسپریس میں عنایت فرمائیں، بڑی نوازش ہوگی، (محمد فاروق، ملت ٹاؤن، ملیر کراچی)۔

جواب:

متوفیہ کے ترکے سے اس کا قرض ادا کیا جائے گا، اگر شوہر نے اس کی زندگی

میں اس کا مہر ادا نہیں کیا تھا، تو وہ شوہر کے ذمہ اس کا قرض ہے، وہ بھی اس کے ترکے میں شامل ہو جائے گا۔ اسے بھی اس کا قرض ادا کرنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں، اگر متوفیہ کا ترکہ اس کے قرض کی ادائی کے لئے نا کافی ہو، تو اس کے شوہر اور دیگر ورثاء اگر تبرع و احسان کر کے اس کا قرض ادا کر دیں تو آخرت کے مواخذے سے اُسے نجات مل جائے گی اور ان لوگوں کو اس کا اجر بھی ملے گا، ورنہ قرض خواہوں سے درخواست کی جائے کہ رضاء الہی کے لئے اس کے ذمہ اپنا قرض معاف کر دیں یا کوئی اور صاحب خیر یہ قرض ادا کر دے، ورنہ حدیث پاک میں ہے:

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال اتدرون ما المفلس قالوا المفلس فینا من لا درہم لہ ولا متاع فقال ان المفلس من امتی یأتی یوم القیامۃ بصلوۃ وصیام وزکوۃ ویأتی قد شتم ہذا وقذف ہذا واکل مال ہذا وسفک دم ہذا وضرب ہذا فیعطی ہذا من حسناتہ و ہذا من حسناتہ فان فنت حسناتہ قبل ان یقضی ما علیہ اخذ من خطایا ہم فطرحت علیہ ثم طرح فی النار۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہوتا ہے؟ صحابہ نے کہا: ہمارے نزدیک مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس درہم ہو نہ کوئی متاع ہو، آپ نے فرمایا: میری امت کا مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ لے کر آئے گا اور اس شخص نے (دنیا میں) کسی کو گالی دی تھی، کسی کو تہمت لگائی تھی، کسی کا مال کھایا تھا، کسی کا خون بہایا تھا، کسی کو مارا تھا، پھر اسے اس کی نیکیاں مل جائیں گی اور اس سے اس کی نیکیاں جائیں گی اور اگر ان کے حقوق پورے ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں تو ان کے

گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے اور اس کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 6457)۔“

زندگی میں وراثت تقسیم نہیں ہوتی

سوال: 151

میرے سات بچے (چار بیٹے، تین بیٹیاں) ہیں، بڑے بیٹے اور تین بیٹیوں کی شادی کر دی ہے۔ میرے پاس جائیداد کی صورت میں ایک مکان ہے شوہر بھی حیات میں ہیں۔ شرعی طور پر جائیداد کی تقسیم کس طرح ہوگی؟، (ثریا ناز، بلاک 3 گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب :

زندگی میں جائیداد کی تقسیم بطورِ ترکہ و میراث نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ دیا جاتا ہے وہ ہبہ کہلاتا ہے اور مستحسن و مستحب امر یہ ہے کہ بیٹے بیٹیوں کو مساوی حصہ دیا جائے شوہر کو اپنی صوابدید پر جتنا چاہیں دی سکتی ہیں، اپنے لئے جو پس انداز کرنا چاہیں، یہ ان کا حق ہے، آپ کی وفات کے بعد یہ ترکہ شریعت کے مطابق تمام وارثوں میں تقسیم ہوگا۔

کیا سوتیلے بیٹا اکیلا وارث بن سکتا ہے

سوال: 152

میرے والد صاحب نے پہلی شادی کی تو اس سے ہم تین بہنیں پیدا ہوئیں ہماری والدہ زندہ تھیں کہ والد صاحب نے دوسری شادی کر لی۔ دوسری بیوی کا ایک لڑکا تھا، جو اس کے پہلے خاوند سے تھا وہ بھی ہمارے والد صاحب نے ساتھ ہی لے لیا

۔ بعد میں ہماری دوسری والدہ کے ہاں دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ اس طرح ہم پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔

ہمارے والد صاحب کے لئے تقسیم جائیداد کا طریقہ کیا ہے؟

اگر اولاد میں جائیداد کی تقسیم نہ کی جائے تو اس کے کیا احکام ہیں؟

کیا اولاد میں سے کسی کو جائیداد سے محروم کیا جاسکتا ہے؟

کیا کسی ایک شخص کو پندرہ سال پہلے ساری جائیداد کا وارث بنایا جاسکتا ہے؟ کہ وہ اکیلا استعمال کرتا رہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں مکمل وضاحت فرمائیں، (م۔، مارووال، پنجاب)۔

جواب:

آپ نے سوال میں اس امر کی وضاحت نہیں کی کہ آپ کے والد صاحب حیات ہیں یا وہ وفات پا چکے ہیں، اگر وہ بدستور حیات ہیں تو زندگی میں ان کا ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔ اسی طرح یہ بھی واضح نہیں کہ آپ کی دوسری والدہ بدستور حیات ہیں یا نہیں؟ کسی شخص پر لازم نہیں ہے کہ اپنی زندگی میں اپنی جائیداد اپنی اولاد پر تقسیم کرے، یہ اس کی اپنی صوابدید ہے، چاہے تو اولاد کو ہبہ کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے۔ البتہ اولاد کے درمیان ہبہ میں رسول اللہ ﷺ نے مساوات کی ہدایت فرمائی ہے۔ کسی شخص کی وفات کے بعد اس کا ترکہ اللہ تعالیٰ کے قانون وراثت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے، اس میں مرنے والے کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا، نہ ہی وہ کسی کو وراثت سے محروم کر سکتا ہے۔ کسی شخص کی بیوی کا وہ بیٹا جو کسی سابق شوہر سے ہے، اس کا وارث نہیں بن سکتا، نہ منہ بولا بیٹا وارث بن سکتا ہے، البتہ وہ اپنی ماں کا وارث ہوگا۔ سوال میں درج پانچ بیٹیوں کو والد کی وفات کی صورت میں ترکہ کا 2/3 حصہ

ملے گا، جس میں ہر ایک کا حصہ برابر برابر ہوگا، باقی دیگر ورثاء کا ہوگا۔ اپنا تمام مال اور جائیداد کسی ایک وارث کو دینا تا کہ دوسرے ورثاء محروم ہو جائیں، ناجائز اور باعث گناہ ہے، بلا وجہ شرعی وارث کو محروم کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔ حدیث مبارک میں ہے: عن أنس بن مالك قال قال رسول الله ﷺ: "من فتر من ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة"۔ ترجمہ: جو شخص اپنے وارث کو (حق) میراث پانے سے فرار (کی صورتیں) اختیار کرے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جنت سے اس کی میراث منقطع فرما دے گا، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 2703 مطبوعہ دار الفکر بیروت)۔

ترکے کی تقسیم موجودہ قیمت کے مطابق

سوال: 153

ہمارے والد صاحب مرحوم نے دو شادیاں کیں، دوسری شادی پہلی زوجہ کے انتقال کے بعد کی۔ پہلی زوجہ سے والد صاحب کا ایک بیٹا تھا۔ دوسری زوجہ کا انتقال والد صاحب کے انتقال کے بعد ہوا، دوسری زوجہ سے ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں، لہذا مسئلہ یہ ہے کہ:

۱۔ والد صاحب کے مکان کی شرعی تقسیم کس طرح ہوگی۔

۲۔ مکان کی کون سی قیمت معتبر ہوگی، والد صاحب کے انتقال کے وقت کی یا حالیہ قیمت؟۔

مہربانی فرما کر تفصیل سے جواب مرحمت فرمائیں، (عامر عارفین شمش، 1425/14 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب :

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارف تکفین و تدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک بمنفید وصیت اگر کوئی متوفی نے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 40 حصوں میں منقسم ہوگا، مرحوم کی پہلی زوجہ کے بیٹے کو 10 حصے، دوسری بیوی کے بیٹے کو 12 حصے اور تین بیٹیوں کو 18 حصے (ہر ایک کو 6 حصے) ملیں گے، مکان چونکہ اب فروخت کیا جائے گا لہذا جو قیمت مکان کی اب حاصل ہوگی اسے ورثاء کے درمیان اصول وراثت کے قوانین کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

غیر وارث کو ترکے سے حصہ

سوال : 154

میرے والد صاحب شیخ محمد الیاس کا انتقال 28 جولائی 2006ء کو ہو گیا ہے۔ ان کے ورثاء جو حیات ہیں وہ ایک بیٹا شیخ عبدالخالق، تین بیٹیاں اور ایک بیوہ ہیں، جبکہ دو بیٹوں (محمد یونس اور عبدالملک) اور ایک بیٹی نفیسہ کا انتقال 13 سے 20 سال پہلے ہو چکا ہے۔ مہربانی فرما کر تحریر فرمائیں کہ شرعی طور پر کس کا کتنا حصہ بنتا ہے؟ جس اولاد کا والد کی زندگی میں انتقال ہو گیا ہے شرعی طور پر ان کے بیٹے یا بیٹیوں کا کوئی حصہ بنتا ہے یا نہیں؟، (عبدالخالق، F-153 بلاک 5 سکیم 5 کلنٹن، کراچی)۔

جواب :

از روئے شرع کسی بھی شخص کی وفات کے بعد جو ترکہ وہ چھوڑ جاتا ہے، اس

میں تقسیم وراثت سے پہلے بالترتیب مندرجہ ذیل مصارف وضع کئے جاتے ہیں:

(1) مصارف تکفین و تدفین (2) اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض باقی ہے تو اس کو ادا کرنا

(3) اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو ادائے قرض کے بعد جو ترکہ بچ رہے گا، اسکی زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مقدار تک وصیت پر عمل درآمد ہوگا، بشرطیکہ یہ وصیت کسی وارث کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیم وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد، بقیہ ترکہ ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔ متوفی شیخ محمد الیاس کا ترکہ 40 حصوں میں منقسم ہوگا، بیوہ (محمد الیاس) کو 5 حصے، ایک بیٹا عبدالحق کو 14 حصے، تین بیٹیوں کو 21 حصے (ہر ایک کو 7 حصے) ملیں گے۔

صورتِ مسئلہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے اور متوفی یا متوفیہ کی براہ راست اپنی اولاد بیٹے اور بیٹیاں بوقت وفات زندہ ہیں، تو ان کی اُس بیٹی یا بیٹی کی اولاد (پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں)، جو مورث (ترکہ چھوڑ کر وفات پانے والے اپنے ماں یا باپ) کی وفات سے پہلے وفات پا چکی ہے، وراثت سے محروم رہے گی، کیونکہ تقسیم وراثت کا ایک مسئلہ اصول ہے کہ: ”قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کر دیتا ہے“، اسے ”اصولِ حجب“ بھی کہتے ہیں، یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی شخص کی وفات کے وقت اس کے والد بھی زندہ ہیں اور دادا بھی، تو والد کا رشتہ چونکہ میت سے قریب ترین ہے، اس لئے والد کو ترکہ سے حصہ ملے گا اور دادا محروم رہے گا، البتہ اگر ایسی صورت ہو جائے کہ کسی شخص کی وفات کے وقت اس کا دادا تو زندہ ہے لیکن والد پہلے وفات پا چکا ہے، اب ترکہ کا جو حصہ بصورتِ حیات والد کو ملنا چاہئے تھا، وہ دادا کو ملے گا۔ یہی صورتِ حال میت کے بیٹے، بیٹیوں کی موجودگی میں پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی ہے۔

تاہم اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينُ فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُ
وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۝

ترجمہ: ”اور جب (ترکے کی) تقسیم کے موقع پر قرابت دار، یتامی اور مساکین
آجائیں (جو شرعاً وارث نہیں بن سکتے) تو انہیں بھی (رضا کارانہ طور پر) ترکے میں
سے کچھ دے دو اور ان سے اچھی بات کہو، (النساء: 8)۔“

قرآن کا یہ حکم ایجابی (Obligatory) تو نہیں ہے، استحبابی ہے، اس کی حیثیت
مقاصد خیر کے لئے سفارش اور مشاورت کی ہے، لہذا جتنا حصہ ان یتیم نواسے نواسیوں
کی والدہ کے حیات ہونے کی صورت میں انہیں ملنا چاہئے تھا، اگر تمام ورثاء اتفاق
رائے سے اتنا یا اس سے کچھ کم بیڑ عاً اور استحساناً رضا کارانہ طور پر تقسیم ترکہ سے پہلے ان
بچوں کو بطور حصہ دیدیں تو یہ ایک مستحسن امر ہوگا، صلہ رحمی کا باعث ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی
رضا کا باعث ہوگا، اور اس کا اجر انہیں ملے گا۔ قرآن مجید حکیمانہ انداز میں ارشاد
فرماتا ہے: وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكَوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافاً خَلْفُوا عَلَيْهِمْ
فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيداً ۝ ترجمہ: ”اور لوگ (یہ سوچ کر) ڈریں کہ اگر وہ
(اپنی وفات) کے بعد (خدا نخواستہ) کمزور (بے سہارا) اولاد چھوڑ جاتے تو انہیں ان
کے (رُ لئے اور بے یار و مددگار ہونے کا کتنا) خوف ہوتا تو انہیں چاہئے کہ اللہ سے
ڈرتے رہیں اور درست بات کہیں، (النساء: 9)۔“ تو قرآن نے بتایا کہ اپنے
پسماندگان پر کسی ایسے مشکل مرحلے کا تصور کر کے غیر وارث نادار اور کمزور رشتے
داروں پر ترس کھا کر تقسیم وراثت کے وقت ان کی مدد کر لیا کرو۔

میرے شوہر کا تین سال پہلے انتقال ہو چکا ہے اور ان کے ورثاء میں ایک بیوہ (یعنی میں) چار بیٹے، تین بیٹیاں ہیں۔ مرحوم کے ترکے میں ایک دکان ہے اور ایک مکان جس میں ہم رہائش پذیر ہیں یہ مکان مرحوم نے اپنی زندگی ہی میں آج سے تقریباً چالیس سال قبل میرے والد سے میرے ہی نام پر خرید کر مجھے ہبہ کر دیا تھا اور اس کے کاغذات میرے نام سے میرے پاس موجود ہیں اور اس مکان پر میرا قبضہ بھی ہے۔ دکان جو کہ میرے شوہر کے نام ہے اور اب بیٹے اس میں کاروبار کرتے ہیں۔ میرے بیٹوں کا مطالبہ ہے کہ انہیں مکان اور دکان دونوں میں سے حصے دیئے جائیں۔ برائے مہربانی ہر ایک کے حصوں کے وضاحت فرمائیں، (توفیقاً، 14/1958 ایف بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

صورت مسئلہ میں برصدق بیان سائلہ چونکہ مکان ان کے شوہر نے انہیں ہبہ کر دیا تھا اور بعد ہبہ اس پر قبضہ بھی پایا گیا چونکہ ہبہ مکمل ہو گیا لہذا وہ مکان مرحوم کے ترکے میں شامل نہیں ہوگا۔ اور جب میراث تقسیم کی جائے گی تو اس ہبہ کئے ہوئے مکان کو چھوڑ کر جتنا مال وفات کے وقت ان کی ملکیت میں ہوگا، وہی تقسیم کیا جائے گا۔ اور جو ورثاء ان کی وفات کے وقت موجود ہوں گے، وہ اس کے حق دار ہیں، ہر ایک وارث کو قانون وراثت کے شرعی اصول کے مطابق اس کا حصہ دیا جائے گا۔ اور جو کچھ مرحوم اپنی زندگی میں دے چکے ہیں، اسے شمار نہیں کیا جائے گا۔ اگر سائلہ کا بیان درست ہے اور مرحوم کے شرعی ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں تو

تقسیم وراثت سے قبل جو امور ضروری ہیں (یعنی مصارف تدفین، ادائیگی قرض (اگر کوئی ہو) ایک تہائی ترکے کی حد تک نفاذ وصیت (اگر کی ہو)، ان کی تنفیذ کے بعد بقیہ ترکہ 88 حصوں میں تقسیم ہوگا۔ بیوہ کو 11 حصے، چار بیٹوں کو 56 حصے (فی کس 14 حصے) تین بیٹیوں کو 21 حصے (ہر ایک کو 7 حصے) ملیں گے۔

Inheritance

Q:156 Dear Mufti Saheb!

This is to request you to answer the following question for submission to a court outside

Pakistan:

Question: Mr S.K.S.Hassan died last year leaving behind him wife, a son and a daughter and no other legal heirs. What will be the share (in percentage) of his wife, son and daughter in his movable and immovable properties according to shariah?

K.M.Zubair, Supplements Editor, Dawn.

Ans:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

In the name of Allah, the Beneficent, the Merciful

Answer to question

If S.K.S.Hassan's legal--Islamic law (shariah)--heirs are the same as mentioned in the question, then before division of the assets it as important to meet funeral expenses, pay loan, if any, and execute will, if any, to the extent of one-third. There after the remaining assets will be shared by the heirs in the following proportion, according to shariah:

Widow.....	3/24.....	12.5 0	percent
Son.....	14/24.....	58.33	percent
Daughter	7/24.....	29.17	percent

تر کے میں سو تیلی اولاد کا حصہ نہیں

سوال: 157

میرے والد صاحب نے میری والدہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی، میری سو تیلی والدہ کے پہلے شوہر سے چار بچے (دوڑ کے، دوڑ کیاں) ہیں، اور ان سب کی شادیاں ہم نے کیں سو تیلی والدہ کا انتقال 1982ء میں ہوا، میری والدہ سے پانچ بیٹے، اور چار بیٹیاں ہیں۔ میرے والد کا انتقال 1992ء میں ہو

۱، والد کے انتقال کے بعد کیا ان چاروں کا میرے والد صاحب کے ترکے میں کوئی حصہ ہے یا نہیں؟، (معراج الدین، 68/10 لیاقت آباد کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئلہ میں برصدق بیان سائل بمنفذ مقدمہ علی الارث مرحومین کا ترکہ ان کی اولاد کے درمیان اصول وراثت کے قوانین کے تحت تقسیم ہوگا، کل ترکہ 14، حصوں میں منقسم ہوگا۔ ”للمذکر مثل حظ الانثیین“ (ایک لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11) کے تحت پانچ بیٹوں کو دس حصے (فی کس دو حصے) چار بیٹیوں کو چار حصے (فی بیٹی ایک حصہ) ملیں گے۔ دوسری والدہ کی جو اولاد ان کے پہلے شوہر سے ہے اسے آپ کے والد کے ترکے میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔

پنشن ترکے میں شامل نہیں

سوال: 158

ایک شخص نے کل وراثت میں ایک مکمل مکان جس کی بالائی منزل پر دو کمرے ایک کچن اور غسل خانہ بھی تعمیر ہے، اس کے علاوہ ایک ماہانہ آمدنی کی پنشن چھوڑی ہے، وارثوں میں ایک بیٹا اور سات بیٹیاں ہیں۔ مرحوم کی وصیت میں تحریر ہے کہ اوپر کی منزل جسے بیٹے نے مکمل طور پر اپنے خرچ پر تعمیر کروایا ہے، اسی وصیت میں بڑی بیٹی جس کی شادی نہیں ہوئی ہے اس کو مکان کا آدھا حصہ دینے کی وصیت کی ہے ایک اور تحریر جو صرف بیٹے کو دی اور بیٹا اسکے اصل ہونے کا حلف اٹھا رہا ہے اسکے مطابق اوپر کی منزل کی قیمت بیٹے کو ملنی چاہئے اور نیچے کی منزل کی آدھی قیمت اس طرح تقسیم کی جائے کہ دو حصے بیٹے کو اور ایک حصہ ہر بیٹی کو دیا جائے، ماسوائے اس بیٹی کے جس کو نیچے

کی منزل کا آدھا حصہ دیا جا رہا ہے اسکے علاوہ باپ کی جو ماہانہ پنشن آتی ہے وہ بڑی بیٹی پہلے ہی اکیلے وصول کرتی ہے اور کوئی حصہ کسی بھائی یا بہن کو نہیں دیتی مکان کی قیمت اس وقت ایک کروڑ روپے ہے۔ جس وقت تحریر لکھی گئی مکان کی قیمت پندرہ لاکھ روپے تھی جس کی تقسیم مرحوم نے اس طرح کی کہ بیٹے کو اوپر کی منزل کے دو لاکھ ملنے چاہئیں ایک لاکھ ٹیکس، بل وغیرہ کی قیمت میں رکھے جائیں ۶ لاکھ روپے بڑی بیٹی کو دیئے جائیں باقی ۶ لاکھ روپے کے آٹھ حصے کئے جائیں دو حصے بیٹے کو یعنی ڈیڑھ لاکھ روپے اور ایک ایک حصہ چھ بیٹیوں کو یعنی ۵۷ ہزار روپے ہر بیٹی کو دیا جائے۔ اب مکان کی قیمت ایک کروڑ روپے ہے بہنوں کا اصرار ہے کہ بیٹے کو اس قیمت کی تبدیلی کے حساب سے اوپر کی منزل کے پیسے نہ دیئے جائیں، مگر بڑی بیٹی کو موجودہ قیمت کے حساب سے مکان کا آدھا حصہ ضرور دیا جائے۔ براہ کرم کتاب و سنت کی روشنی میں وراثت کی تقسیم واضح فرمائیے، (سید حسن مدیم، 1E/10/10 ناظم آباد کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارف تکفین و تدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک بمعفیہ وصیت اگر متوفی نے کسی صدقہ جاریہ یا غیر وارث کیلئے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 9 حصوں میں منقسم ہوگا۔ ”للذکر مثل حظ الانثیین“ (ایک لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11) کے تحت ایک بیٹے کو دو حصے اور سات بیٹیوں کو سات حصے (فی بیٹی ایک حصہ) ملیں گے، جیسا کہ مرحوم کے تحریر کردہ وصیت نامہ

مہ اور سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم نے وصیت نامہ میں اپنے ورثاء کو اپنی جائیداد کے مختلف حصوں میں نامزد (Nominate) کیا ہے، محض نامزد کرنے سے وہ اس کے مالک نہیں بن جاتے اور ورثاء کے حق میں وہ وصیت معتبر نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”سمعت أبا أمامة سمعت رسول الله ﷺ يقول: إن الله قد أعطى كل ذي حق حقه فلا وصية لوارث“

ترجمہ: ”ابو امامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے: بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے، (سنن ابی داؤد جلد 3 رقم الحدیث 2862 مطبوعہ، مؤسسة الريان، بیروت)۔“

پنشن حکومت کی طرف سے تبرع ہے، یہ ترکہ نہیں ہے، لہذا حکومت اپنے قواعد و ضوابط اور قانون کے مطابق ورثاء میں سے جسے چاہے دے سکتی ہے۔ بیٹے کا مکان کی بالائی منزل پر جو خرچ ہوا ہے۔ وہ اس کا حق ہے۔ اگر والد نے دو لاکھ روپے اس کیلئے طے کر دیئے تھے تو وہ ان کا حق دار ہے باقی ترکہ سب ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوگا، جس کی تفصیل اوپر درج کر دی ہے، البتہ تمام ورثاء باہمی رضامندی سے اپنے والد کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے غیر شادی شدہ بہن کو تقسیم وراثت سے قبل مجموعی ترکے سے کچھ رقم نکال کر دینا چاہیں، تو اب وہ ایسا کر سکتے ہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مرحوم کے بہن بھائی محروم رہیں گے

سوال: 159

میرے ایک دوست نوید جنہیں 22 جنوری 2006ء کو شہید کر دیا

گیا، میں نے ان سے ایک لاکھ روپیہ بطور قرضہ لیا تھا منافع ہوا تو چند ماہ انہیں منافع سے حصہ بھی دیا مگر بعدہ منافع کا سلسلہ بند کر دیا، میرے دوست نوید نے مجھ سے رقم کی واپسی کا تقاضہ کیا تھا اور یہ کہ مجھے اپنی رہائش کے لئے فلیٹ خریدنا ہے رقم تیار رکھنا میں نے کسی وقت بھی وہ رقم تم سے واپس لینی ہے، وہ مع اپنی بیوی اور ایک ڈیڑھ سالہ بیٹی کے کرایہ کے فلیٹ میں رہائش پذیر تھے اسکے علاوہ ان کے ہمراہ اور کوئی نہ رہتا تھا، خیر اب وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں فلیٹ بھی نہ خرید سکے اور نہ ہی میں ایک لاکھ کی رقم واپس کر سکا۔ میں ایک لاکھ کی رقم واپس کرنے کو تیار ہوں طریقہ کار کیا ہونا چاہئے، مرحوم کے ورثاء میں بیوہ، ایک بیٹی، ایک بیٹا (جو مرحوم کی شہادت کے تین ماہ بعد پیدا ہوا) مرحوم کی والدہ، 5 بھائی اور 5 بہنیں ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مرحوم کے سر مجھ سے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ میں نے نوید مرحوم کو ایک لاکھ روپے بطور قرضہ دیئے تھے کہ اپنی سہولت کے مطابق جب چاہو واپس کر دینا انہوں نے مجھے اس قرضے کا ثبوت بھی دکھایا بینک سے ایک لاکھ روپے کا چیک نوید کے نام پر تھا بیوہ بھی اس قرضہ کی تائید کر رہی ہے۔ اس صورت میں مجھے کیا کرنا ہو گا یا سب سے افضل طریقہ میرے لئے کیا ہو گا؟ یہ بھی واضح رہے کہ بیوہ کی عدت پوری ہو چکی ہے اور بیوہ نے اپنے والدین کے گھر ہی عدت کے ایام پورے کئے اب مستقلاً وہیں رہ رہی ہیں، (محمد رحمت، دستگیر کراچی)۔

جواب :

صورتِ مسئلہ مذکورہ میں مذکورہ قرض کی ایک لاکھ رقم مرحوم کے مجموعی تر کے میں شامل کی جائے گی، امور، متقدمہ علی الارث (مصارف تکفین و تدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی تر کے کی حد تک بمعینہ وصیت اگر متوفی نے کی ہو)

شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد ترکے کے تہائی حصہ سے مرحوم کا قرض ادا کیا جائے گا اور اگر اس کے بعد بھی قرض باقی رہے تو دیگر ورثاء بطور فضل و احسان رضا مندی سے اگر اپنے حصوں سے دست بردار ہوں تو ان کے حصوں سے ادا کیا جائے گا، ترکہ کی تقسیم درج ذیل طریقے پر ہوگی۔

ادائیگی قرض کے بعد کل ترکے کے 24 حصے ہوں گے، مرحوم کی والدہ کو 6 حصے، بیوہ کو 3 حصے، ایک بیٹے کو 10 حصے اور بیٹی کو 5 حصے ملیں گے، مرحوم کے بہن بھائی محروم رہیں گے، واللہ اعلم بالصواب۔

نفاذ اسلام

WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿حلال و حرام، مجائز و ناجائز﴾

قتلِ خطا

سوال: 160

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ماں حالتِ خواب میں اپنے شیر خوار بچے کے اوپر آجائے جس کے دم گھٹنے سے بچہ مر جائے کیا ماں پر دیت و کفارہ ہے کیا یہ قتلِ قائم مقام خطا ہے۔ نیز یہ قتلِ قائم مقام خطا ہے تو کیا یہ نوعِ صرف احناف کے مذہب میں ہے یا جمہور کا مسلک ہے اور اس کے دلائل قرآن وحدیث یا اجماع و قیاس سے کیا ہے؟، (ماجد خان، ضلع راولا کوٹ تحصیل عباس پور)۔

جواب :

آپ نے استفتاء میں جو صورت بیان کی ہے، احناف کے نزدیک یہ ”قتلِ قائم مقام خطا“ کی صورت بنتی ہے اور جمہور کے نزدیک یہ قتلِ خطا ہے، لیکن اس پر جو حکم مرتب ہوتا ہے، وہ ایک ہی ہے۔ ڈاکٹر وہبہ الزحلی لکھتے ہیں: القتل المخطيء كما عرفنا: هو أن لا يقصد به الضرب ولا القتل، مثل لو سقط شخص على غيره فقتله، أو رمى صيدا فاصاب انسانا، فهو نوع واحد عند الجمهور ونوعان عند الحنفية؛ لأنهم يعتبرون حالة سقوط النائم على غيره، مما جرى مجرى الخطأ۔

ترجمہ: ”قتلِ خطا جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ ہے کہ نہ تو کسی شخص کو مارنے پٹنے (Beating) کا ارادہ کیا جائے اور نہ جان سے مار ڈالنے کا، اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص (غیر ارادی طور پر) دوسرے شخص پر گر پڑا اور اس طرح اس کی جان لے لی،

یا ایک شکار کونٹا نہ بنا کر تیر چلایا (یا کولی چلائی) اور وہ (اچانک) کسی انسان کو جا لگا (اور اس طرح اس کی جان چلی گئی) تو یہ جمہور فقہاء کے نزدیک ایک ہی قسم ہے، اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک قتلِ خطا کی دو قسمیں ہیں: (ایک خطاء فی القصد اور دوسری خطاء فی الفعل) کیونکہ وہ اسے اس صورت پر قیاس کرتے ہیں، جیسے ایک سویا ہوا شخص نیند کی حالت میں دوسرے شخص پر گر جاتا ہے (اور اس طرح اس کی موت واقع ہو جاتی ہے) یہ قائم مقام خطا کی قسم سے ہے، (الفقہ الاسلامی وادلتہ جلد: 6، ص: 328، مطبوعہ: دار الفکر، دمشق)۔“

علامہ سرحسی حنفی لکھتے ہیں: ”علامہ ابو بکر رازی کی تعریف کے مطابق قتل قائم مقام خطا یہ ہے کہ مثلاً نیند میں کوئی شخص کسی پر گر پڑے اور اس کو قتل کر دے یہ عہد ہے نہ خطا کیونکہ سونے والے شخص کا قصد (ارادہ) متصور نہیں ہے، لیکن اس کا کروٹ بدل کر کسی شخص پر گرنا اس شخص کی ہلاکت کا موجب ہے، اس کے عصبات پر دیت اور کفارہ واجب ہوگا، اور اگر وہ مقتول کا وارث تھا تو اس کی وراثت سے بھی محروم ہوگا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس نے کوئی کوتاہی کی ہو یا وہ نیند میں نہ ہو اور اس نے جلد میراث حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا ہو، (المبسوط، جلد: 26، ص: 68، مطبوعہ: دار المعرفۃ، بیروت، بحوالہ شرح صحیح مسلم علامہ غلام رسول سعیدی، ج: 4، ص: 676 فرید بک اسٹال، لاہور)۔“

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: واما ما جرى محجری الخطا فهو مثل النائم ينقلب على رجل فيقتله فليس هذا بعمد ولا خطا كذا في الكافي۔ و كمن سقط من سطح على انسان فقتله أو سقط من يد لبنه أو خشبة وأصاب انساناً وقتلته أو كان على دابة فوطئت دابته انساناً هكذا في المحيط۔ و حكمه

حكم الخطأ من سقوط القصاص ووجوب الدية والكفارة وحرمان الميراث كذافي الجوهرة النيرة۔

ترجمہ: ”اور قتل قائم مقام خطا“ مثال اس کی یہ ہے کہ کسی سونے والے شخص پر کوئی شخص گرا، جس سے وہ (سونے والا شخص) ہلاک ہو گیا پس نہ یہ قتل عمد ہے اور نہ ہی قتل خطا، ”کافی“ میں بھی اسی طرح ہے۔ اسی طرح چھت سے کوئی شخص کسی انسان پر گرا اور اس طرح اسے ہلاک کر دیا، یا ایک انسان کے ہاتھ سے اینٹ یا لکڑی گر گئی، اور وہ دوسرے شخص پر آگئی اور اس کی ہلاکت واقع ہو گئی، یا وہ سواری پر تھا اور اس کے جانور نے کسی شخص کو روند ڈالا، ”محیط“ میں بھی اسی طرح سے ہے۔ اور اس کا حکم بھی قتل خطا کے حکم کی طرح ہے، کہ قصاص ساقط ہو جائے گا اور دیت اور کفارہ واجب ہوگا، اور قاتل مقتول کی میراث سے محروم ہوگا، ”جوهرة النيرة“ میں اسی طرح مذکور ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص: 3 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔

مفتی وقار الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی سوال ہوا تو آپ نے جواب میں لکھا: قتل کی اقسام میں سے یہ قسم ”قائم مقام خطا“ ہے اس کی مثال یہ ہے کہ سونے ہوئے شخص پر کوئی گرے اور وہ سونے والا مر جائے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ قاتل پر کفارہ واجب ہوتا ہے اور قاتل کے عصبہ (ورثاء) پر دیت اور قاتل میراث سے بھی محروم ہوتا ہے۔ قتل کا گناہ نہیں ہوتا ہے۔ لہذا صورت مسئلہ میں ماں کو کفارہ دینا ہوگا اور وہ یہی ہے کہ دو مہینے کے لگانا روزے رکھے، (وقار الفتاویٰ، جلد سوم، ص: 338، مطبوعہ بزم وقار الدین، کراچی)۔

قتل خطا میں قاتل پر کفارہ واجب ہوتا ہے اور قاتل کے عصبہ (ورثاء) پر دیت لازم ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا آَلََا خَطَاً ج وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِّنْهُ وَ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا ط

ترجمہ: ”اور کسی مؤمن کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے مؤمن کو قتل کرے سوائے اس کے کہ (اس سے) خطاء (یہ فعل سرزد ہو جائے)، (تو اس کا کفارہ) ایک مؤمن غلام کا آزاد کرنا ہے، (اور مزید یہ کہ) اس کے وارثوں کو دیت ادا کرنی ہے، سوائے اس کے کہ وہ معاف کر دیں، (النساء: 92)۔“

آیت کے اختتام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامَ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللَّهِ۔

ترجمہ: ”یعنی جو شخص (بطور کفارہ آزاد کرنے کے لئے غلام) نہ پائے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے قبولیت تو بہ کے لئے دو ماہ کے لگاتار روزے رکھے۔“

قتلِ شبہِ عمد

سوال: 161

مسکلی محمد فاروق نے کسی بات پر تنازع کرتے ہوئے غصہ میں آکر حاکم ولد محمد یوسف (مرحوم) کو ڈنڈے مار کر قتل کر دیا، اس کے بعد یہ مقدمہ عدالت میں پہنچا لیکن اس دوران قاتل اور مقتول کے ورثاء میں صلح ہو گئی اور مقتول کے ورثاء نے قاتل کو خون معاف کر دیا۔ اب سوال یہ ہے کہ مقتول کا خون معاف کرنے کا کس وارث کو حق حاصل ہے۔

یاد رہے کہ مقتول غیر شادی شدہ تھا اور مقتول کا والد پہلے ہی انتقال کر چکا ہے اس وقت صرف مقتول کی ماں اور پانچ بھائی ہیں جو موجود ہیں کیا قاتل کو مقتول کی ماں خون معاف کر سکتی ہے یا نہیں؟۔ برائے مہربانی تفصیل سے اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں،

(جھاڑو، ولد یوسف خان کوٹھ گڈاب ٹاؤن، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئلہ میں مذکورہ سوال میں جو صورتِ قتل کی بیان کی گئی ہے اسے قتلِ شبہِ عمد کہا جاتا ہے۔
شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں:

واما شبه العمد فهو ما تعمدت ضربه بالعصا او السوط او الحجر او اليد۔
ترجمہ: ”شبہِ عمد وہ قتل ہے جس میں لاٹھی، کوڑے، پتھر یا ہاتھ سے ضرب لگانے کا قصد کیا جائے، (المبسوط جلد: 26 ص: 60 مطبوعہ دارالمعرفة بیروت)۔“
قتلِ شبہِ عمد میں قاتل گناہ گار ہوگا اور اس پر کفارہ واجب ہے ایک غلام آزاد کرے یا دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے اور اس کے بعد عاقلہ (عصبات) پر دیت مغلظہ یعنی سواونٹ واجب ہے جس کو وہ تین سال میں ادا کریں گے۔ عاقلہ عصبات کو کہتے ہیں یعنی باپ کی طرف سے رشتہ دار جو قاتل کی جانب سے مقتول کی دیت ادا کرتے ہیں۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وشبه العمد أن يتعمد الضرب بحاليس بسلاح ولا ماجرى مجرى السلاح عند أبي حنيفة رحمه الله تعالى وقال أبو يوسف ومحمد رحمهما الله تعالى إذا ضربه بحجر عظيم أو خشبة عظيمة فهو عمد وشبه العمد أن يتعمد ضربه بما لا يقتل به غالباً والصحيح قول أبي حنيفة رحمه الله تعالى كذا في المصنوعات ✽ وموجبه على القولين الاثم والكفارة وكفارته تحرير رقبة مؤمنة فان لم يجد فصيام شهرين متتابعين ودية مغلظة على

العاقلة كذا في الكافي۔

ترجمہ: ”اور امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک شبہ عہد یہ ہے کہ ایسی چیز سے مارنے کا قصد کرے جو اسلحہ (برائے قتل) نہ ہو اور نہ ہی اسلحہ کے قائم مقام ہو، اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ جب وہ کسی بڑے پتھر کے ساتھ یا کسی بڑی لکڑی کے ساتھ مارے تو وہ بھی قتل عہد ہے اور ان کے نزدیک شبہ عہد یہ ہے کہ وہ کسی ایسی چیز سے مارنے کا قصد کرے جس سے عام طور پر قتل نہ کیا جاتا ہو، اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول ہی صحیح ہے، جیسا کہ مضمرات میں ہے۔ اور دونوں اقوال کے مطابق ”قتل شبہ عہد“ کے مرتکب پر گناہ اور کفارہ لازم آتا ہے اور اس قتل شبہ عہد کا کفارہ ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہے پس اگر وہ نہ پائے تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا ہوں گے اور قاتل کے عصبات پر دیت مغلظہ (سواونٹ) واجب ہے، کافی میں اسی طرح سے ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد: 6 ص: 23 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔“

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

عفو الولی عن القاتل افضل من الصلح، والصلح افضل من القصاص و کذا عفو المجروح۔ لا تصح توبة القاتل حتی یسلم نفسه للقرود۔

ترجمہ: ”ولی مقتول کا قاتل کو معاف کر دینا صلح سے افضل ہے، صلح قصاص سے افضل ہے اور اسی طرح مجروح کا معاف کر دینا افضل ہے اور قاتل کی توبہ (عند اللہ) تب صحیح ہوگی جب وہ خود کو (ورثاء کے پاس) قصاص کے لئے پیش کرے، (ورنہ عند اللہ توبہ معتبر نہیں ہے)۔“

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قوله (عفو الولی عن القاتل افضل) ویبر القاتل فی الدنيا عن الدية و القود

لانهمما حق الوارث - بیری - قوله: (لا تصح توبة القاتل حتى يسلم نفسه
 للمقود) أى لا تكفيه التوبة وحدها - قال فى "تبیین المحارم واعلم ان توبة
 القاتل لا تكون بالاستغفار والندامة فقط بل يتوقف على ارضاء اولياء
 المقتول فان كان القتل عمدا لا بد أن يمكنهم من القصاص منه فان شاء
 قتلوه وان شاء عفوا عنه محانا فان عفوا عنه كفته التوبة - اه ملخصا -

ترجمہ: "(ولی کا قاتل کو معاف کر دینا افضل ہے) اور قاتل دنیا میں دیت اور قصاص
 سے بری ہو جائے گا کیونکہ یہ دونوں (دیت اور قصاص) وارث کا حق ہے، علامہ
 علاؤ الدین ہسکفی کا یہ قول کہ: (قاتل کی تو بہ اس وقت تک درست نہیں جب تک کہ وہ
 خود کو قصاص کے لئے پیش نہ کرے) یعنی صرف اس کا تو بہ کر لینا کافی نہیں ہے
 - "تبیین المحارم" میں فرمایا: جاننا چاہئے کہ قاتل کی تو بہ فقط اس کی عداوت اور طلب
 مغفرت سے (مکمل) نہیں ہوگی، بلکہ یہ مقتول کے ورثاء کی رضامندی پر موقوف رہے
 گی، پس اگر اس نے قتل عمد کیا ہو تو (قبولیت تو بہ کے لئے) ضروری ہے کہ اس مقتول
 کے ورثاء کو اپنے اوپر قصاص کی قدرت دے کہ اگر چاہیں تو اسے (قصاص میں) قتل
 کر دیں اور اگر وہ چاہیں تو اسے معاف کر دیں، پس اگر وہ اس کو معاف کر دیں تو
 اس کے لئے تو بہ کافی ہے، (رد المحتار علی الدر المختار جلد: 10 ص: 151 مطبوعہ
 دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔"

ولایت کے چار اسباب ہیں:

قربت، ملک، ولا، امامت - قربت کی وجہ سے ولایت عصبہ بنفسہ کے لئے ہے یعنی
 وہ مرد جس کو اس سے قربت کسی عورت کی وساطت سے نہ ہو یا وارث کے ذوی
 الفروض کے بعد جو ترکہ بچے، وہ سب لے لے، اور اگر ذوی الفروض نہ ہوں تو سارا

مال یہی لے لے، ایسی قرابت والا ولی ہے، یہاں بھی وہی ترتیب ملحوظ ہے جو وراثت میں معتبر ہے یعنی سب سے مقدم بیٹا، پھر پوتا، پھر پر پوتا اگر کوئی پشت کا فاصلہ ہو یہ نہ ہوں تو پھر باپ، دادا وغیرہم اگر چہ کئی پشت اوپر کا ہو، پھر حقیقی بھائی۔

شرعاً قاتل کو معاف کرنے کا حق اولیاءِ مقتول کا ہے اور صورتِ مسئلہ میں یہ حق اس کے بھائیوں کو حاصل ہے، یہ ”قتلِ شبہ عمدہ“ کا کیس ہے، اور ورثاء کی جانب سے معافی کے باوجود اس (قاتل) پر دو ماہ کے روزوں کا کفارہ ہے، اور معاف کرنے کے بعد قاتل سے دنیا میں مطالبہ نہیں ہو سکتا نہ قصاص لیا جاسکتا ہے اور نہ ہی دیہت لی جاسکتی ہے، لیکن مواخذہ اخروی سے بری نہیں ہو سکتا کیونکہ قتل نا حق میں تین حق اس کے ساتھ متعلق ہیں ایک حق اللہ، دوسرا حق مقتول، تیسرا حق ولی، ولی مقتول کو اپنا حق معاف کرنے کا اختیار تھا سو اس سے نے معاف کر دیا مگر حق اللہ اور حق مقتول بدستور باقی ہیں، ولی کے معاف کرنے سے وہ معاف نہیں ہوئے۔

غیر مسلم کا چیف جسٹس یا قائم مقام بننا

سوال: 162

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک اسلامی حکومت میں کسی غیر مسلم (ہندو) کو چیف جسٹس (قاضی القضاة) مقرر کرنا جائز ہے؟، (محمد شمیم خان فیڈرل بی ایریا، شوکت صدیقی، منور احمد نعیمی، بلیر کالونی، کراچی)۔

جواب:

اس مسئلے کی دو جہتیں ہیں، ایک خالص دستوری اور قانونی اور دوسری خالص اسلامی جہاں تک مملکتِ اسلامیہ پاکستان کے دستور کا تعلق ہے، تو اسکی رو سے نظام مملکت میں صرف دو مناصب کے لئے مسلمان ہونا شرط ہے، ایک صدر کا منصب اور

دوسرا وزیر اعظم کا عہدہ ، کیونکہ ان دونوں عہدوں کے حلف نامے میں ، جو دستور پاکستان کے شیڈول میں دیا گیا ہے ، مسلمان ہونا اور عقیدہ ختم نبوت کا اقرار شامل ہے ۔ ان کے علاوہ کسی اور عہدے کے لئے (خواہ ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کے جج ہوں یا چیف جسٹس ہوں ، مسلح افواج کے سربراہان ہوں یا کورنر ، وزراء اعلیٰ اور وفاقی و صوبائی وزراء ہوں) مسلمان ہونا شرط نہیں ہے ، لہذا دستور پاکستان کی رو سے کسی غیر مسلم کے چیف جسٹس آف پاکستان یا اس کا قائم مقام بننے کی گنجائش ہے ، ماضی میں بھی جسٹس اے آر کارنیلیس ، جو مذہباً عیسائی تھے ، چیف جسٹس آف پاکستان رہ چکے ہیں ۔ اگرچہ ہماری رائے میں یہ دستور کی روح کے منافی ہے ، کیونکہ دستور پاکستان کی رو سے کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بن سکتا اور کسی بھی قانون کو اس حوالے سے پاکستان کی سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جاسکتا ہے کہ یہ قرآن و سنت کے خلاف ہے اور اس کے بارے میں سپریم کورٹ آف پاکستان کی تعبیر و تشریح حتمی اور قطعی متصور ہوگی ، اب جج یا چیف جسٹس خود غیر مسلم ہے اور از روئے عقیدہ اس کا قرآن و سنت کی حقانیت پر یقین ہی نہیں ہے (کیونکہ اگر قرآن و سنت کی حقانیت پر اس کا یقین ہوتا تو اسلام قبول کر لیتا) ، لہذا صرف اتنا کہنا کافی نہیں ہے کہ اسے قرآن و سنت سے آگاہی ہے ۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ۝ ترجمہ: ”اور اللہ کافروں کے لئے مسلمانوں کے خلاف (غلبہ کی) ہرگز ہرگز کوئی سبیل نہیں بنائے گا، (النساء: 141)۔“

اس آیت سے فقہاء احناف نے جو مسائل اخذ کئے ہیں ان میں دو اہم باتیں یہ ہیں کہ:

(1) کافر کو مسلمان کا قاضی (جج) بنانا جائز نہیں ہے ۔ (2) کافر کو مسلمان کے لشکر کا

امیر (سپہ سالار یا چیف آف اسٹاف یا کمانڈر انچیف) بنانا جائز نہیں ہے، شیخ احمد
معروف تولا جیون علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: جعلہ ذا عسکر و خدمتہ و رئیساً لہ غیر
جائز۔

ترجمہ: ”کافر کو مسلمان کے لشکر کا امیر (سپہ سالار یا چیف آف اسٹاف یا کمانڈر انچیف
(بنانا جائز نہیں ہے، (التفسیرات احمدیہ ص: 322, 223 مکتبہ حقانیہ، پشاور)۔“
ملک العلماء علامہ علاء الدین ابی بکر بن مسعود کا سنی حنفی لکھتے ہیں: واما بیان من
یصلح للقضاء فنقول الصلاحية لها شرائط - منها: العقل - ومنها: البلوغ
- ومنها: الاسلام - ومنها: الحرية - ومنها: البصر - ومنها: النطق - ومنها:
السلامة عن حد القذف لما قلنا في الشهادة۔

ترجمہ: ”ان شرائط کے بیان کے بارے میں جو اہلیت قضاء کے لئے ضروری ہیں،
حسب ذیل ہیں: (1) عقل، (2) بلوغ، (3) اسلام، (4) حریت (آزاد
ہونا)، (5) بصر (بینا ہونا)، (6) نطق، یعنی کویائی و گفتار کی صلاحیت رکھنا ہو، (7) اس
شخص پر حد قذف نہ لگی ہو، (بدائع الصنائع جلد: 7، ص: 3، مرکز اہلسنت برکات رضا
، کجرات، ہند)۔“

علامہ علاء الدین حنفی لکھتے ہیں: ان الکافر یحوز تقلیدہ القضاء لیحکم بین
أهل النعمة ذكره الزيلعي في التحكيم الخ
ترجمہ: ”(حاکم اسلام) اگر کسی غیر مسلم کو غیر مسلموں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کیلئے
قاضی (جج) مقرر کرے، تو جائز ہے، اسے ”زیلعی“ نے باب تحکیم میں ذکر کیا ہے،
(مگر مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کرنے کا اُسے اختیار نہیں)، اس کی شرح میں ابن
عابدین شامی لکھتے ہیں: (لیحکم بین أهل النعمة) أي حال كفره، والا فقد

علمت أن الكافر يصح توليته مطلقاً لكن لا يحكم الا اذا أسلم۔

ترجمہ: ”تا کہ (غیر مسلم قاضی) غیر مسلموں کے مقدمات کا فیصلہ کرے (یعنی جب تک وہ حالت کفر میں ہے، مگر یہ معلوم ہے کہ (دیگر امور میں) کافر کو حق ولایت مطلقاً حاصل ہے، لیکن جب تک وہ اسلام نہ لائے اسے منصب قضا تفویض نہیں ہوگا، مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں، ----- پھر آگے“

مطلب فی حکم القاضی الدرزی والنصرانی ”کے تحت بیان کرتے ہیں :

تنبيه :ظهر من كلامهم حكم القاضی المنسوب في بلاد الدروز في القطر الشامي ، ويكون درزياً ويكون نصرانياً فكل منهما لا يصح حكمه على المسلمين ، فان الدرزي لا ملة له كالمنافق والزنديق وان سمي نفسه مسلماً ----- والظاهر أنه يصح حكم الدرزي على النصراني وبالعكس ۔

ترجمہ: ”ان کے کلام سے ظاہر ہے کہ شام کے خطے میں دُرزی اور نصرانی (کو اگر) قاضی (مقرر کر دیا گیا ہو) تو ان کا مسلمانوں کے امور میں فیصلہ کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ دُرزی کا تو کوئی دین ہی نہیں ہوتا، جیسے منافق اور زندق، اگرچہ وہ اپنے آپ کو (بظاہر) مسلمان کہے (اور آگے چل کر لکھا)، ظاہر یہ ہے کہ غیر مسلم کا ایک دوسرے کے لیے جج بنایا جانا درست ہے، (رد المحتار علی الدر المختار ج: 8، ص: 24 دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

علامہ امجد علی اعظمی سے سوال ہوا کہ: مسائل شرعیہ عبادات میں غیر مسلم کے فیصلہ کی طرف رجوع کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے باوجودیکہ امیر شریعت موجود ہیں؟ جواب میں انہوں نے لکھا کہ: ”کفار کے پاس فیصلہ لے جانا ممنوع ہے، اللہ عزوجل فرماتا ہے

السم تر الى الذين يزعمون انهم آمنوا بما انزل اليك وما انزل من قبلك
 يريدون ان يتحاجوا الى الطاغوت وقد امروا ان يكفروا به ويريد
 الشيطان ان يضلهم ضلالاً بعيداً، ترجمہ: ”کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو
 دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ اس (کتاب) پر ایمان لائے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی
 گئی ہے اور ان (کتابوں) پر (ایمان لائے ہیں) جو آپ سے پہلے نازل کی گئی ہیں
 اور چاہتے ہیں کہ اپنے مقدمے طاعت کے پاس لے جائیں، حالانکہ انہیں حکم یہ دیا
 گیا تھا کہ وہ طاعت کا انکار کریں اور شیطان یہ چاہتا ہے کہ انہیں گمراہ کر کے بہت دور کی
 گمراہی میں ڈال دے، (النساء: 60)، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ امجدیہ، جلد سوم،
 ص: 246، مکتبہ رضویہ آرام باغ، کراچی)۔“

محفل میلاد کے بارے میں یہ کہنا کہ اس میں حضور ﷺ تشریف لائے ہوئے
 ہیں اور اس میں وحدۃ لا شریک بھی شریک ہوتا ہے۔“

سوال: 163

بارہ ربیع الاول کو جشن عید میلاد النبی ﷺ کے موقع پر ایک مقرر نے
 آقا ﷺ کی شان بیان کرتے ہوئے کہا ”آج کی اس محفل، اس جشن اور اس بزم
 کے جان محفل ذات مصطفیٰ ﷺ ہیں اور شرکاء محفل میں خود خداوند کریم بھی شریک
 ہے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو محفل بھی آقا ﷺ کے نام پر کی جائے آقا ﷺ اس میں
 شریک ہوتے ہیں اور جس محفل میں خدا کا حبیب ﷺ بھی خود شریک ہو اس میں وحدہ
 لا شریک بھی شریک ہوتا ہے۔“

اس پر ایک علامہ صاحب نے تنقید کرتے ہوئے کہا کہ خدا کی ذات شریک ہونے سے
 پاک ہے۔ لہذا یہ کفریہ کلمات ہیں۔ مقرر کو بتائب ہونا چاہئے۔ براہ کرم اس مسئلہ پر

قرآن وحدیث اور اقوال صحابہ وائمہ کی روشنی میں اپنے فتویٰ سے نوازیں، (ڈاکٹر محمد حامد رضا، ایم ڈی، رضامیڈ یسن کمپنی مین بازار چشتیاں)۔

سوال: 164

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مقرر نے اپنی تقریر کے دوران یہ جملہ کہا ”شرکاء محفل میں خود خداوند کریم بھی شریک ہے“۔ مقرر نے شریک ہونے کی تفصیل بیان نہیں کی۔ کہ اللہ تعالیٰ کس طرح شریک ہے۔ آپ سے دریافت کرنا ہے کہ:

(1) کیا اس جملہ پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے یا نہیں؟۔ (2) کیا ایسے جملوں کو عوام الناس میں استعمال کرنا چاہئے؟۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں، (میاں طاہر حسین، چشتیاں شریف)۔

جواب:

نوٹ: اس موضوع پر ہمارے پاس چشتیاں، پنجاب سے دو الگ الگ استفسارات آئے، ہم نے دونوں درج کردیے ہیں۔ ایک مفتی ڈاکٹر محمد حامد رضا نے تین مفتیانِ کرام (مفتی عبدالقیوم خان، جامعہ منہاج القرآن، لاہور، مفتی محمد تنویر القادری، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور اور ڈاکٹر مفتی غلام سرور قادری، جامعہ رضویہ، لاہور) کے جوابات بھی منسلک فرمائے ہیں۔ ان مفتیانِ کرام نے اس عبارت کی تاویل تو جیہہ کر کے جواز کا قول کیا ہے۔ اس مسئلے میں ہمارا موقف درج ذیل ہے:

قرآن وحدیث میں ایسے مقامات موجود ہیں جہاں اللہ جل شانہ اور مخلوق کے لئے ایک ہی صیغے کا اطلاق کیا گیا ہے، جیسے: (۱) اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلٰی النَّبِیِّ الْبَرِّ (ب) فَاذْكُرُوْنِیْ اَذْ كُنْتُمْ (القرآن) (ج) اِنَّا جٰلِیْسُ عَبْدِیْ جِبْنَ

يَذْكُرُنِي وَآتَانِي إِذَا دَعَانِي (الحديث) (د) آتَا عِنْدَ ظَنِّي عَبْدِي بِى
 آتَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِي، فَإِنْ ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي، وَمَنْ آتَانِي
 يَمْشِي آتِيَهُ هَرُورَةً، وَغَيْرَهَا مِنَ الْآيَاتِ الْكَرِيمَةِ وَالْأَحَادِيثِ
 الْمُبَارَكَةِ۔ میری عاجزانہ رائے میں ان اطلاقات کو انہی مقامات تک محدود رکھنا
 چاہئے، جیسے: فَتَمَّ وَجْهَ اللَّهِ، يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ، يَذَّالِلُ اللَّهُ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ
 وَغَيْرَهَا مِنَ الْآيَاتِ الْكَرِيمَةِ، ان مواقع پر یہ کہا جائے کہ ان سے جو بھی اللہ تعالیٰ کی
 مراد ہے یا جو معنی اس کی ذات کے شایان شان ہے۔ ہمارے لئے یہ بھی مناسب نہیں
 ہے کہ اس پر مزید قیاسات کریں کہ ید اللہ، وجہ اللہ ہو سکتا ہے تو ”قدم اللہ“ اور ”رأس
 اللہ“ کیوں نہیں ہو سکتا۔ ان اطلاقات کو ان کے محل تک محدود رکھا جائے۔ بلکہ ترجمہ
 کرتے وقت لکھ دیا جائے کہ اس کا حقیقی مفہوم جو اللہ کی مراد ہے، اس پر ہمارا ایمان
 ہے اور اس کی تعین کے ہم شرعاً مکلف نہیں ہیں، اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ ترجمہ کے موقع
 پر یہ لکھ دیا جائے: ”جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے“۔ حقیقی مفہوم کی تعین کے اعتبار
 سے ایسی احادیث و آیات کو متشابہات میں سے سمجھنا چاہئے اور اس کے درپے نہیں
 ہونا چاہئے۔ آج کل اکثر مقررین اور نعت خواں حضرات بڑی جرأت کے ساتھ یہ بھی
 کہہ دیتے ہیں کہ: ”اس محفل میں حضور تشریف لائے ہوئے ہیں“، ہمارا ایمان و عقیدہ
 ہے کہ رسول اللہ ﷺ مبارک محافل میلاد میں ازراہ لطف و کرم جب اور جہاں چاہیں
 تشریف لاسکتے ہیں اور ”شائم امدادیہ“ میں مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی یہ درج کیا
 ہے، لیکن تعین کے ساتھ یہ کہنا کہ: ”ہماری اس محفل میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے
 ہوئے ہیں“، اگر غوث الاعظم محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ یا مسلمہ طور پر
 بلند مرتبہ اولیاء کاملین یہ دعویٰ فرمائیں تو بجا ہے اور بارگاہ الوہیت جل و علا اور بارگاہ

رسالت میں تقرب کی وجہ سے انہیں یہ مرتبہ و مقام حاصل ہے کہ وہ یقین کے ساتھ حضور انور ﷺ کی تشریف آوری کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، ہر ایرے غیرے کو اتنا بڑا دعویٰ کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ایسا دعویٰ یا تو غیب دانی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے، اور بالذات علم غیب اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے یا جن مقرب و محبوب بندوں کو اپنے کرم سے وہ مطلع فرما دے یا وہ اپنے لئے عام لوگوں کی قوت مشاہدہ اور صاحب بصیرت و بصارت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، یہ بہت بڑی خود ستائی ہے جو اس کے لئے جائز نہیں ہے، اگر قرآن وحدیث میں ایسے کلمات (مثلاً لفظ صلوٰۃ) آئے ہیں، جن کا اطلاق اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ اور مومنین پر بیک وقت کیا گیا ہے، تب بھی ان کے معانی کا تعین ہر ایک کے اعتبار سے الگ ہوگا، اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے وہی معنی مراد ہوگا جو اس کی شان کے لائق ہے اور اشتراک لفظی کے باوجود اشتراک معنی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

آیت درود پر کلام کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

اس آیت میں اللہ اور فرشتوں کو ایک فعل میں شریک کیا ہے اور فرمایا ہے: اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود پڑھتے ہیں، اس آیت پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے غیر کو ایک فعل میں شریک کرنے سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے، حدیث میں ہے: حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے کہا جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پالی اور جس نے ان کی نافرمانی کی وہ گمراہ ہو گیا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم برے خطیب ہو یوں کہو جس نے اللہ کی نافرمانی کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کی، وہ گمراہ ہو گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عام لوگوں کے لئے یہ جائز نہیں ہے

کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کا ذکر ایک ضمیر میں جمع کریں، کیونکہ اس سے سننے والوں کو یہ وہم ہوگا کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کو برابر سمجھتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کا ذکر الگ الگ صیغوں میں کیا جائے، البتہ اللہ تعالیٰ کسی حکم یا کسی قاعدے کا پابند نہیں ہے، وہ ایک صیغہ اور ایک ضمیر میں اللہ اور اس کے غیر کا ذکر کرے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، ایک صیغہ میں دونوں کا ذکر کرنے کی مثال یہ آیت ہے اس میں فرمایا ہے: **إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ: اللہ اور اس کے فرشتے درود پڑھتے ہیں**، اور ایک ضمیر میں دونوں کے ذکر کے مراد لینے کی مثال یہ آیت ہے **وَمَا نَقْمُوا** **إِلَّا أَنْ اغْنَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ**۔ ترجمہ: ”اور ان (منافقین کو) صرف یہ ناکوار ہوا کہ ان کو اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا، (التوبہ: 74)“ اس آیت میں ”مِنْ فَضْلِهِ“ کی ضمیر واحد اللہ اور رسول دونوں کی طرف راجع ہے، اسی طرح یہ آیت ہے **وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضَوْهُ**۔ ترجمہ: ”اللہ اور اس کا رسول اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کو راضی کیا جائے“، (التوبہ: 62)“ اس آیت میں ”يُرْضَوْهُ“ کی ضمیر واحد اللہ اور اس کے رسول دونوں کی طرف راجع ہے۔ اسی طرح نبی ﷺ بھی اس قاعدہ کے پابند نہیں ہیں اور آپ نے بھی اللہ اور اس کے رسول کو ایک ضمیر میں فرمایا ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے: حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا جس شخص میں تین خصلتیں ہوں وہ ایمان کی مٹھاس کو پالے گا، ایک یہ ہے کہ: **أَنْ يَكُونَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا**۔ ترجمہ: ”اللہ اور اس کا رسول اس کو ان کے ماسوا زیادہ محبوب ہو، (صحیح البخاری: رقم الحدیث: 16)“۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ادب اور اس کی تعظیم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر دونوں کا ایک ضمیر میں ذکر کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ

اور اس کے رسول ﷺ اس قاعدہ کے پابند نہیں ہیں اور وہ ایک صیغہ یا ایک ضمیر میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے غیر کو بھی جمع کر دیتے ہیں، کیونکہ جب دوسرے لوگ ایک صیغہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کا ذکر کریں گے، تو ان کے متعلق یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کو ہم مرتبہ اور مساوی سمجھتے ہیں، اس لئے دونوں کا ایک صیغہ یا ایک ضمیر میں ذکر کر رہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جاسکتا، اس لئے اگر وہ ایک صیغہ یا ایک ضمیر میں دونوں کا ذکر کریں، تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، (تبیان القرآن، جلد: 9، ص: 532، 533)۔ ”محفل میلاد النبی ﷺ کے حوالے سے ہمارے خطباء کرام فرط محبت، جوش عقیدت اور عوام سے داد و تحسین پانے کے شوق میں بعض کلمات ارشاد فرما دیتے ہیں۔ جیسے سوال میں مذکور ہیں کہ: ”اس میں وحدہ“ لاشریک بھی شریک ہوتا ہے“، اگرچہ شرعاً اس کی تاویل و توجیہ کی گنجائش ہے، جیسا کہ منسلک فتاویٰ میں مفتیان کرام نے فرمائی ہے، لیکن میری مؤذبانہ اور عاجزانہ رائے ہے کہ اس طرح کے انداز بیان سے اجتناب اولیٰ ہے، اللہ تعالیٰ کی اُحدیّت اور تَنَزُّیہ کا جتنا پاس رکھا جاسکے، اتنا ہی افضل و اولیٰ ہے۔ خاص طور پر آجکل بڑے خطباء کرام کی تقاریر کے کیسٹ عام ہو جاتے ہیں اور پھر علم سے عاری لوگ بھی ان کو اپنی مجالس میں دہراتے رہتے ہیں۔ تاویلات و توجیہات کی تو ہر جگہ گنجائش رہتی ہے، مثلاً

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَسُحْنُ اقْرَبَ الْيَه مِنْ حَبْلِ الْوَرِيد۔ ترجمہ: ”ہم اس کی (بندے کی) شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں، (سورۃ ق: 16)“ اور وَهوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ۔ ترجمہ: ”تم جہاں کہیں بھی ہو، وہ (اللہ تعالیٰ) تمہارے ساتھ ہوتا ہے، (سورۃ الحديد: 4)“۔ اب ان آیات کی روشنی میں کوئی شخص یہ کہے کہ

میں جس مجلس میں بھی رہوں، اللہ تعالیٰ میرے ساتھ شریک ہوتا ہے، تو یہ انداز میرے نزدیک بارگاہ الوہیت کے شایانِ شان نہیں ہے، اگرچہ تو جیہہ و تاویل کی گنجائش موجود ہے، کیونکہ یہاں بندے اور رب کے درمیان جس معیت کا ذکر ہے اس سے معیتِ جسمانی یا معیتِ مکانی مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا علم اور قدرت ہر چیز کو محیط ہے اور اسی معنی میں معیت مراد ہے، بعض مقررین کے لئے معیتِ خاصہ مراد ہو سکتی ہے، اس سے مراد اللہ تبارک و تعالیٰ کی خصوصی رحمتوں اور برکات کا بندے کے شامل حال رہنا ہے۔ باقی جن علامہ صاحب نے کہا ہے کہ: ”یہ کفریہ کلمات ہیں، مقرر کو تو بتانا چاہئے۔“ یہ درست نہیں ہے اور بعض علماء کے نزدیک غیر کفر کو کفر قرار دینا بجائے خود مستلزم کفر ہوتا ہے۔ ہم نے اظہارِ رائے کے لئے یہ فتویٰ محترم مفتی محمد رفیق حسنی (جامعہ اسلامیہ مدرسہ العلوم، کراچی) کو پیش کیا، تو انہوں نے اپنی عبارت ذیل کے اضافے کے ساتھ اس کی تائید کی: ”حضرت مولانا مفتی غیب الرحمن صاحب کے فتوے کی تائید کرتا ہوں بلکہ میرے نزدیک صورتِ مسئلہ کی عبارتیں اور اسی قسم کے عام مقرریں اور نعت خوانوں کی عبارتیں کفر تو نہیں مگر عام مجالس میں بیان کرنا حرام ہیں بلکہ متشابہات آیات اور احادیث کا بغیر تاویل اور توضیح کے بھی عام مجالس میں بیان کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس قسم کے کلمات سے عوام کو جو پیغام پہنچتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تجسیم اور تمثیل جسمی کا ہوتا ہے چنانچہ ایسی تقریریں سننے والے میرے ایک طالب علم کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے جسم کا قائل ہو چکا ہے۔ اسی طرح شانِ رسالت بیان کرتے وقت یہ کہنا کہ ”اللہ تعالیٰ جو لا شریک ہے وہ درود میں ہمارے ساتھ شریک ہے“، سے عوام کا یہ عقیدہ بنتا ہے شاید اللہ تعالیٰ ہماری طرح ہاتھ میں تسبیح لیکر ”اللہم صل علی الخ یا الصلوٰۃ والسلام علیک

یہ رسول اللہؐ پڑھتا رہتا ہے جبکہ علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف صلاۃ کی نسبت ہو تو رحمت مراد ہوتی ہے۔ الغرض مذکورہ کلمات اگرچہ تاویل کی وجہ سے کفر نہیں ہیں مگر عوام کو پیغام پہنچانے اور ان کے عقیدوں کے فساد کے خطرے کے پیش نظر ناجائز ہیں آئندہ علماء کو یہ کلمات نہیں کہنا چاہئے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ اسی طرح محترم مفتی محمد اسماعیل نورانی (جامعہ انوار القرآن، کراچی) نے یہ تائیدی کلمات لکھے: ”قبلہ مفتی غیب الرحمن صاحب مدظلہ نے جو جواب تحریر فرمایا ہے اور اس پر مفتی رفیق الحسنی دام ظلہ نے جو اضافہ فرمایا ہے وہ بالکل برحق ہے۔ فی زمانہ مقررین اور واعظین کے مذکورہ جملوں کی سخت حوصلہ شکنی اور تردید کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جس طرح نعت خوانی کی فیلڈ میں جاہل اور چمکیلے نعت خوانوں نے نظریاتی طور پر اہل سنت کو نقصان پہنچایا ہے اسی طرح غالی قسم کے واعظین اور مقررین نے بھی اپنی بے بنیاد نکتہ آفرینیوں سے شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اللہ عزوجل ہدایت خیر عطا فرمائے۔“

خاتون مبلغہ کا غیر شرعی طرز عمل

سوال : 165

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھنے والی ایک مقرر خاتون (جو تنظیم المدارس سے ملحق فوقانی درجے کے ایک ادارے کی مہتمم ہیں) نے اپنی تقاریر پر مشتمل کیسٹز کی سرعام فروخت شروع کر رکھی ہے جن میں ترنم کے ساتھ نعتیہ اشعار بھی پڑھے گئے ہیں موصوفہ سے جب دریافت کیا گیا کہ کچھ عرصہ پہلے تو آپ اپنے اجتماع کے آس پاس بھی کسی مرد کی موجودگی پسند نہیں کرتی تھیں کہ انکے کانوں تک آواز نہ چلی جائے، اور اب آپ اپنی کیسٹیں ہر جگہ پہنچانے کے لئے کوشاں و مشتاق ہیں، تو ان کا جواب یہ تھا کہ یہ دور

حاضر کی اہم ضرورت ہے میں فرحت ہاشمی (الھدی سینٹر، اسلام آباد) کی کیسٹز کے توڑ کے لئے ایسا کر رہی ہوں۔

ہم یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا یہ عمل قانونِ شرع میں کس نظر سے دیکھا جائے گا؟ کیا فرحت ہاشمی کی باتوں کا جواب دینے کے لئے اہل سنت میں ”مرد علماء“ نا کافی تھے۔ برائے مہربانی پہلی فرصت میں اس پر مدلل فتویٰ تحریر فرما کر ارسال فرمائیں، کیونکہ اس سے مختلف مدارس سے تعلق رکھنے والی طالبات، معلمات و منظمات دینی انتشار کا شکار ہیں۔ بعض خوش الحان خواتین اپنی قراءت نعت و تقاریر پر مشتمل کیسٹز منظرِ عام پر لانے کے لئے تیار ہو رہی ہیں، یا درہے کہ مذکورہ خاتون تقاریر کے حوالے سے خواتین میں خاصی مقبول ہیں، اگر اس بات کا فوری نوٹس نہ لیا گیا، تو عنقریب مرد علماء کے خطابات سننے والے منفقو دہو جائیں گے۔ اور ہر جگہ اہل سنت کی خواتین کی کیسٹیں بھتی سنائی دیں گی، (سحر سیفی، جامعہ سیفیہ خراسانیہ لبنات الاسلام، مدینہ کالونی بھٹہ روڈ بڑیلہ شریف، کجرات)۔

جواب :

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: **إِنْ أَتَقِيتُمْ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ**

الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا

ترجمہ: ”اگر اللہ سے ڈرتی ہو (اور یقیناً ڈرتی ہو) تو (پس) پردہ مردوں سے بھروسہ (بات کرنے میں) (ایسا) نرم لہجہ اختیار نہ کرنا کہ جس کے دل میں (شہوانیت کا) روگ ہے وہ (اپنی خواہش نفس کی تکمیل کا) طمع کرنے لگے اور دستور کے مطابق (اچھی) بات کرنا، (القرآن، سورۃ الاحزاب: 32)۔“

عن یسحی بن سعید، عن عمرة عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: لو ادرك

رسول اللہ ﷺ ما أحدث النساء لمنعهن، كما منعت نساء بنی اسرائیل۔
قلت لعمرة: أو منعن؟ قالت: نعم۔

ترجمہ: ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ، فرماتی ہیں: اگر رسول اللہ ﷺ عورتوں کو اس حال پر پاتے، جو آپ کے بعد ہوا، تو آپ ان کو مسجد آنے سے منع فرما دیتے، جیسے کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کر دیا گیا تھا، یہی کہتے ہیں کہ میں نے عمرہ سے پوچھا! کیا بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کیا گیا تھا؟، انہوں نے کہا: ہاں!، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 869، سنن ابی دواؤ، رقم الحدیث: 570)۔“

عن عبد اللہ، عن النبی ﷺ قال: ”صلاة المرأة في بيتها افضل من صلاتها في حجرتها، و صلاتها في مخدعها افضل من صلاتها في بيتها“۔

ترجمہ: ”حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت کا دالان میں نماز پڑھنا، صحن میں پڑھنے سے بہتر ہے اور کوٹھری میں دالان سے بہتر ہے، (سنن ابی دواؤ، رقم الحدیث: 571)۔“

عن ابی موسیٰ، عن النبی ﷺ قال: ”كل عین زانیة، والمرأة اذا استعطرت فمرت بالمجلس فهي كذا و كذا۔ یعنی زانیة“۔

ترجمہ: ”حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہر آنکھ زنا کرنے والی ہے (یعنی جو اجنبی کی طرف شہوت بھری نظر سے دیکھے) اور بے شک عورت عطر لگا کر کھلی مجلس میں جائے تو ایسی اور ایسی ہے یعنی زانیہ ہے، یعنی وہ محرکات و اسباب زنا اختیار کر رہی ہے، جس کے باعث گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 2786)۔“

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن۔

ترجمہ: اور عورتیں اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اس زیہنت کا لوگوں کو علم ہو جائے جو انہوں نے چھپا رکھی ہے، (القرآن، سورۃ النور: 31)۔“

علامہ ابو بکر حصص حنفی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ عورت کو اتنی بلند آواز کے ساتھ کلام کرنے سے منع کیا گیا ہے جس کو اجنبی مرد سن لیں، کیونکہ پازیب کی آواز سے اس کی اپنی آواز زیادہ فتنہ انگیز ہے، اسی وجہ سے ہمارے فقہاء نے عورت کی اذان کو مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ اس میں آواز بلند کرنی پڑتی ہے اور عورت کو آواز بلند کرنے سے منع کیا گیا ہے، (احکام القرآن جلد 3 ص: 319 مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور)۔“

علامہ شہاب الدین خفاجی حنفی لکھتے ہیں:

”علامہ ابن ہمام حنفی نے کہا ہے کہ نوازل میں تصریح ہے کہ عورت کی آواز عورت (واجب الستر) ہے اور اس پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عورت کا عورت سے قرآن مجید پڑھنا مستحب ہے کیونکہ عورت کی آواز عورت ہے، (فتح القدیر جلد 6 ص: 374 مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ، سکھر)۔“

علامہ ابو عبد اللہ خطاب مالکی لکھتے ہیں:

”عورتوں کا آواز بلند کرنا مکروہ ہے، عورتوں کا اذان دینا، بلند آواز سے نماز پڑھنا اور بلند آواز سے حج میں تلبیہ (اللہم لبیک) کہنا سب مکروہ ہے، علامہ لائحی نے کہا ہے کہ عورتوں کی اذان ممنوع ہے کیونکہ عورت کی آواز عورت ہے، علامہ خطاب مالکی کہتے ہیں کہ علامہ ابن یونس اور علامہ ابن ماجہ وغیرہ نے بھی یہی کہا ہے کہ عورت کی آواز عورت ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ عورت کا آواز بلند کرنا عورت ہے، کیونکہ صحابہ کرام اہل بیت المؤمنین اور دیگر صحابیات سے احادیث روایت کرتے تھے، (مواہب الجلیل

جلد 1 ص: 435 مطبوعہ دار الفکر بیروت)۔“

امام رازی شافعی لکھتے ہیں:

أن المرأة منهيّة عن رفع صوتها بالكلام بحيث يسمع ذلك الأجنب إذا كان صوتها أقرب إلى الفتنة من صوت خلخالها، ولذلك كرهوا أذان النساء لأنه يحتاج فيه إلى رفع الصوت والمرأة منهيّة عن ذلك۔

ترجمہ: ”عورت کو اتنی بلند آواز کے ساتھ کلام کرنے سے منع کیا گیا ہے جس کو اجنبی مرد سن لیں، کیونکہ عورت کی اپنی آواز پازیب کی آواز سے زیادہ فتنہ انگیز ہے اسی وجہ سے عورت کو اذان دینے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اذان میں آواز بلند کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور عورت کو آواز بلند کرنے سے منع کیا گیا ہے، (تفسیر کبیر جلد 8 ص: 367 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

علامہ بیضاوی شافعی لکھتے ہیں:

”پازیب کی آواز سنانے سے منع کرنا عورت کے آواز بلند کرنے کی ممانعت پر زیادہ دلالت کرتا ہے، انوار التنزیل علی ہامش عنایۃ القاضی جلد 6 ص: 374 مطبوعہ دار صادر، بیروت)۔“

جس طرح قرآن مجید میں عورت کے آواز بلند کرنے کی ممانعت بطور کنایہ اور مبالغہ ہے، سو اسی طرح حدیث میں بھی عورت کے آواز بلند کرنے کو کنایہ اور مبالغہ سے منع کیا ہے، امام بخاری روایت کرتے ہیں:

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ، عن النبی ﷺ قال: ”التسبیح للرجال، والتصفيق للنساء۔“

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا: (امام کو سہو پر مطلع کرنے لئے) مردوں کے لئے تسبیح (سبحان اللہ کہنا) اور عورتوں کے لئے تصفیق (یعنی دہنے ہاتھ کی انگلیاں بائیں ہاتھ کی پشت پر مارنا) ہے، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 1303)۔“

اسی کی مثل حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے (صحیح بخاری رقم الحدیث 1304 روایت ہے، اس حدیث کو امام مسلم اور امام ابو داؤد نے بھی روایت کیا ہے۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام متوفی 681 ہجری لکھتے ہیں:

(ويكره الجمع بينهما) أى بين الإشارة والتسبيح (لأن بأحدهما كفاية) وهذا فى حق الرجال، أما النساء فيصفقن يضررن بظهور أصابع اليد اليمنى على صفحة الكف اليسرى لما مر أن لهن التصفيق لأن فى صوتهن فتنة فلا يستحب لهن التسبيح۔

ترجمہ: ”(اور تسبیح و تصفیق کا جمع کرنا مکروہ ہے) اور تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنا مردوں کا حق ہے، رہا عورتوں کا معاملہ پس وہ تصفیق کریں دہنے ہاتھ کی انگلیاں بائیں ہاتھ کی پشت پر ماریں، جیسا کہ گزرا کہ ان کے لئے تصفیق ہے اس لئے کہ ان کی آواز ”فتنہ“ ہے پس ان کے لئے تسبیح (یعنی سبحان اللہ کہنا) مستحب نہیں ہے، (فتح القدیر جلد 1 ص: 419 مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، کجرات ہند)۔“

نماز میں امام کو متنبہ کرنے کے لئے بلند آواز سے سبحان اللہ کہا جاتا ہے اور چونکہ عورت کا نماز میں آواز بلند کرنا شرعاً ممنوع اور مذموم ہے اس لئے نبی ﷺ نے عورت کو سبحان اللہ کہنے کے بجائے ہاتھ کی پشت پر ہاتھ مارنے کا حکم دیا ہے، علامہ بدر الدین عینی حنفی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

شارع علیہ السلام نے عورت کے سبحان اللہ کہنے کو اس لئے مکروہ قرار دیا ہے کہ اس کی

آواز فتنہ ہے اس لئے اس کو اذان، امامت، اور نماز میں بلند آواز کے ساتھ قرآن مجید پڑھنے سے منع کیا جاتا ہے، (عمدة القاری جلد 7 ص: 279 مطبوعہ ادارة الطباعة المنیر یہ مصر)۔

علامہ علی قاری حنفی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:
عورت کو تصفیق (ہاتھ کی پشت پر ہاتھ مارنے) کا حکم اس لئے دیا کہ اس کی آواز عورت ہے، (مرقات جلد 3 ص: 10 مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان)۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ قرآن مجید میں عورت کو زمین پر پیر مارنے سے منع کیا ہے تاکہ اس کی پازیب کی آواز سن کر اجنبی مرد اس کی طرف متوجہ نہ ہوں اور حدیث میں عورت کو نماز میں سبحان اللہ کہنے کے بجائے ہاتھ کی پشت پر ہاتھ مارنے کا حکم دیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عورت کا آواز کو بلند کرنا بھی ممنوع ہے، فقہاء احناف کے نزدیک عورت کی آواز عورت ہے، اور جس طرح ما سوائے ضرورت کے وہ اجنبیوں پر چہرہ ظاہر نہیں کر سکتی، اسی طرح وہ بغیر ضرورت کے اجنبی مردوں پر اپنی آواز بھی ظاہر نہیں کر سکتی۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ ”عورتوں کا بیان میلاد شریف آنحضرت ﷺ ”زنانی محفل میں باواز بلند نثر و نظم پڑھنا اور نظم خوش آوازی و لحن کے ساتھ پڑھنا اور مکان کے باہر سے ہمسایہ کے مردوں اور نامحرموں کا سننا تو ایسا پڑھنا جائز ہے یا ناجائز ہے؟ آپ نے جواب میں لکھا:

عورت کا خوش الحانی سے باوازا ایسا پڑھنا کہ نامحرموں کو اس کے نغمہ کی آواز جائے حرام ہے۔ نوازل للامام فقیہ ابواللیث میں ہے:

نغمۃ المرأة عورة۔ ترجمہ: ”عورت کا اونچی آواز سے شعر پڑھنا ”عورت“ یعنی محل

ستر ہے۔“

کافی امام ابوالبرکات نسفی میں ہے: لا تلبی جہر الان صوتہا عورۃ۔
ترجمہ: عورت بلند آواز سے (جج کی) تلبیہ نہ پڑھے اس لئے کہ اس کی آواز قابل
ستر ہے۔

امام ابوالعباس قرطبی کی کتاب السماع پھر بحوالہ علامہ علی مقدسی امداد الفتاح علامہ
شرملائی پھر رد المحتار علامہ شامی میں ہے:

لا نجیزلہن رفع اصواتہن ولا تسمطیظہا ولا تلینہا وتقطیعہا لما فی ذلک
من استمالة الرجال الیہن وتحريك الشهوات منہم ومن هذا لم یجوز ان
توذن المرأة۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

عورتوں کو اپنی آوازیں بلند کرنا، انہیں لمبا اور دراز کرنا، (لہجے کو) نرم (اور
پرکشش) بنانا اور ان میں تقطیع کرنا (یعنی ایک ایک لفظ جدا کر کے تحلیل عروض کے
مطابق پڑھنا)، ہم عورتوں کو ان باتوں کی اجازت نہیں دیتے، کیوں کہ ان کے سبب
مردوں کا ان کی طرف میلان ہوتا ہے اور ان کے جنسی جذبات برا بیچھتے ہوتے ہیں
، اسی وجہ سے عورت کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اذان دے، واللہ تعالیٰ اعلم۔
(ت) (فتاویٰ رضویہ ج 22، ص: 43-242 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

مصنف بہار شریعت علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ ”غنیۃ“ کے حوالے سے لکھتے ہیں :

”عورت کو عورت سے قرآن مجید پڑھنا غیر محرم نا پینا سے پڑھنے سے بہتر ہے کہ
اگرچہ وہ اسے دیکھتا نہیں مگر آواز تو سنتا ہے اور ”عورت کی آواز بھی عورت ہے“، یعنی
غیر محرم کو بلا ضرورت سنانے کی اجازت نہیں (بہار شریعت جلد 1 ص: 207 مکتبہ

رضویہ آرام باغ روڈ کراچی)۔“

سوال میں جس خاتون مبلغہ کا تذکرہ ہے، آپ کے بقول شروع میں ان کا رویہ درست تھا، مگر پھر شاید نمود و نمائش کی خواہش غالب آگئی، اور فرحت ہاشمی صاحبہ کے غیر شرعی طرز عمل کو اپنے لئے جواز کی دلیل بنایا۔ یہ کہاں کا اصول ہے کہ برائی کا مقابلہ کرنے کے لئے خود برائی کا ارتکاب کیا جائے؟۔ دین کا مبلغ ہونے کے ناطے احکام شرع و دین کی پاسداری کرنا اولین فریضہ ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اتَّامِرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنَسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ط أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔
ترجمہ: ”کیا لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو؟ اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تم نہیں سمجھتے؟، (القرآن، سورۃ البقرۃ: 44)۔“

موصوفہ کو چاہئے کہ احکام شرع کی پابندی کریں اور سستی و دنیاوی شہرت کے حصول اور خود نمائی کے لئے احکام شرع کی پامالی سے اجتناب کریں اور دین کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے بجائے خود کو دین میں ڈھالنے کی عادت بنائیں اور دین میں فتنے برپا نہ کریں۔

فرحت ہاشمی کی باتوں کا جواب دینے کے لئے علماء موجود ہیں اور الحمد للہ ہم نے ”عصمتِ آدم علیہ السلام“ سے متعلق فرحت ہاشمی کے گستاخانہ طرز عمل پر اس کا رد کیا ہے فتویٰ کی نقل آپ کو ارسال کی جا رہی ہے۔

(نوٹ: عصمتِ آدم علیہ السلام سے متعلق فتویٰ ”تفہیم المسائل جلد سوم“ میں شامل کیا جا چکا ہے۔

مرد پر ریشم کا لباس حرام ہے

سوال : 166

کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ہذا میں کہ مرد کو ریشم کا لباس حرام ہے، لیکن ایسا کپڑا جس میں تھوڑی بہت ملاوٹ ہو ریشم کی جیسا کہ چائنا کا بوکی کپڑا۔ سوال یہ ہے کہ کتنی مقدار میں ریشم مکس ہو تو حرام ہے؟، (عبدالقیوم، نورانی مسجد، جہانگیر روڈ، کراچی)۔

جواب :

احادیث مبارکہ میں ریشم پہننے پر سخت وعید فرمائی ہے، حدیث پاک میں ہے: عن ثابت قال: سمعت ابن الزبیر یخطب یقول: قال محمد ﷺ: "من لبس الحریر فی الدنیا لن یرسہ فی الآخرة۔

ترجمہ: "حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ابن زبیر کو فرماتے ہوئے سنا: محمد ﷺ نے فرمایا: کہ جو دنیا میں ریشم پہنے آخرت میں وہ ہرگز ریشم نہیں پہنے گا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5833)۔"

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز اس مسئلے پر احادیث نقل فرماتے ہیں:
رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

لا تلبسوا الحریر فانه من لبسه فی الدنیا لم یرسہ فی الآخرة۔ رواہ الشیخان عن امیر المؤمنین عمر و النسائی و ابن حبان و الحاکم و صححہ عن ابی سعید الخدری و الحاکم عن ابی ہریرۃ و ابن حبان عن عقبۃ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

ترجمہ: ریشم نہ پہنو جو اسے دنیا میں پہنے گا آخرت میں نہ پہنے گا (اس کو بخاری و مسلم

نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ نسائی، ابن حبان اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ سے اور ابن حبان نے حضرت عامر بن عقبہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی، (صحیح بخاری باب لبس الحریر)۔

نسائی کی ایک روایت میں ہے فرماتے ہیں صلی اللہ علیہ وسلم: من لبسه فی الدنيا لم یدخل الجنة، رواہ عن امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ، ترجمہ: جو دنیا میں ریشم پہنے گا جنت میں نہ جائے گا، امام نسائی نے اس کو امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، (فتاویٰ رضویہ جلد 22 ص: 156 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔

فتاویٰ عالمگیری میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: یجب ان یعلم ان لبس الحریر وہو ما کانت لحمتہ حریرا و سداہ حریرا حرام علی الرجال فی جمیع الاحوال عند ابی حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

ترجمہ: ”امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک تمام حالتوں میں، اگر کپڑے کاٹنا اور بانا ریشم کا ہو، تو وہ امام اعظم ابو حنیفہ (رضی اللہ عنہ) کے نزدیک تمام صورتوں میں مرد پر حرام ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 5 ص: 330 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔“

صاحب بہار شریعت علامہ امجد علی رحمۃ اللہ علیہ عالمگیری کے حوالے سے لکھتے ہیں: ٹانا ریشم ہو اور بانا سوت مگر کپڑا اس طرح بنایا گیا ہے کہ ریشم ہی ریشم دکھائی دیتا ہے تو اس کا پہننا مکروہ ہے، (بہار شریعت جلد دوم ص: 620 مکتبہ رضویہ آرام باغ کراچی)۔

مالک کو بتائے بغیر بھی حقوق ادا کرنے سے انسان بری الذمہ ہو جاتا ہے

سوال: 167

ایک شخص نے کسی ادارے میں کام کیا، وہاں سے کچھ مال چھاپا اور اسی

ادارے میں نوکری کے دوران بھی پورا وقت نہیں دے پایا۔ مالک کو وقت نہ دینے کے بارے میں معلوم تھا، مگر وہ تنخواہ دے دیا کرتا تھا۔ اب وہ شخص اس ادارے کو ایک ایسی چیز دے رہا ہے، جس سے اس ادارے کو بھرپور فائدہ پہنچے گا، مثال کے طور پر اس شخص نے اس ادارے سے = 200000 روپے کا مال غائب کیا اور وہ بہت توبہ بھی کرتا ہے اور اس ادارے کے سامنے اپنے اس گناہ کا اظہار کرے گا تو بہت رسوائی کا سامنا ہوگا۔ اب جب کہ وہ شخص اس ادارے کو اگر وہ جو چیز دینا چاہتا ہے، اس کے بدلے کوئی ایسے الفاظ کے ساتھ حیلہ شرعی کر لے کہ اس کا یہ معاملہ عزت کے ساتھ حل ہو جائے۔

برائے مہربانی جتنا ممکن ہو آسان رہنمائی فرمائیں۔

سوال: 168

گناہ کے سبب جن لوگوں کی رقم کھالی یا چہ الی اب ان لوگوں سے معافی مانگنا چاہتا ہے، برائے مہربانی ان سے کس طرح معاف کروایا جائے یا معافی مانگی جائے کہ عزت بھی بنی رہے اور کام بھی ہو جائے اور وہ لوگ معاف بھی کر سکتے ہیں، برائے مہربانی کچھ ایسے الفاظ کا شرعی حیلہ بتائیں کہ اس سے کہا جائے اور وہ معاف کر دیں، (محمد مدیم قادری، بلاک 6 لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشة فی الذین امنوا لہم عذاب الیم فی الدنیا والآخرۃ ج

ترجمہ: ”بے شک جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی کی بات پھیلے، ان کیلئے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے، (النور: 19)۔“

اگرچہ قرآن مجید میں ”فاحشہ“ اور ”فحشاء“ کا لفظ بطور استعارہ کے بالعموم زنا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، لیکن اس سے عام بے حیائی اور برائی اور اخلاق ذمیرہ بھی مراد ہیں، لہذا اس آیت کی رو سے گناہ، برائی، اور بدی کی اشاعت اور اظہار گناہ از روئے قرآن معیوب اور ناپسندیدہ فعل ہے، یہی وجہ ہے کہ قوم لوط کے جرم کی فحش و شاعت کو عیاں کرنے کیلئے قرآن نے فرمایا کہ:

وَلَوْ طَا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اء نٰكُم لَمٰتٰوْن الْفٰحِشَةُ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اٰحَدٍ مِّنَ الْمٰسِيْن، اء نٰكُم لَمٰتٰوْن الرِّجَال وَتَقَطَعُوْنَ السَّبِيْل وَتٰتٰوْنَ فِىْ نٰدِيْكُمْ الْمُنٰكِرٰط

ترجمہ: ”اور ہم نے لوط کو بھیجا، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا، بے شک تم بے حیائی کا کام کرتے ہو، جو تم سے پہلے جہان والوں میں سے کسی نے نہیں کیا، کیا تم (قانون فطرت کے خلاف) مردوں سے شہوت پوری کرتے ہو اور راہزنی کرتے ہو اور تم اپنی مجلسوں میں اعلانیہ برے کام کرتے ہو، (العنکبوت: 28, 29)۔“

ان آیات میں قوم لوط کے اعمال بد کا یہ رخ اجاگر کیا کہ وہ منکر، بے حیائی اور بدی کو چھپا کر کرنے کے بجائے، اس کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے اور اس کو ذریعہ تفاخر سمجھتے تھے، اور یہ کیفیت تب پیدا ہوتی ہے، جب کسی معاشرے میں اجتماعی ضمیر مرجاتا ہے، بدی کی قوتیں غالب آجاتی ہیں اور خیر کی قوتیں مغلوب ہو جاتی ہیں، یعنی بدی کا اعلان و اظہار اس کی شاعت و قباحت میں اضافے کا باعث ہے، شریعت کی اصل روح یہ ہے کہ ”بدی“ کو حتی الامکان مستور رکھا جائے، حدیث پاک میں ہے:

(1) عَنْ يَزِيدَ بْنِ نَعِيمٍ عَنْ اَبِيهِ اَنْ مَاعِزاً اَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَاقْرَعَهُ اَرْبَعَ مَرٰتٍ فَمَارَ بِرَجْمِهِ وَقَالَ لِهٰذَا لَوْ سَتَرْتَهُ بِثَوْبِكَ كَانَ خَيْرَ لَّكَ قَالَ ابْنُ الْمُنَكَّرِ اِنْ

هَذَا امْرُؤٌ مَاعِزٌ اِنْ يَأْتِي النَّبِيَّ ﷺ فَيُخْبِرُهُ۔

(ترجمہ): یزید بن نعیم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ماعز نے نبی ﷺ کے پاس حاضر ہو کر اپنے جرم (زنا) کا چار بار اعتراف کیا، تو آپ نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا، اور آپ ﷺ نے ہزال سے فرمایا: کاش کہ تم نے اس کے جرم کی پردہ پوشی کی ہوتی یہ تمہارے لئے بہتر ہوتا، ابن منکدر کہتے ہیں کہ ہزال نے ماعز کو کہا تھا کہ حضور ﷺ کے پاس حاضر ہو کر انہیں اپنے گناہ کے بارے میں بتائے، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: 43784377، مطبوعہ مؤسسة الریان، بیروت)۔“

(2) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ صَفْوَانَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ نَامَ فِي الْمَسْجِدِ وَتَوَسَّلَ رَدَاءَهُ فَاخْتَذَ مِنْ تَحْتِ رَأْسِهِ فَجَاءَ بِسَارِقَةٍ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ۔ فَأَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَقْطَعَ۔ فَقَالَ صَفْوَانُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! لَمْ أَرِدْ هَذَا، رَدَائِي عَلَيْهِ صَدَقَةٌ، فَقَالَ رَسُولُ ﷺ ”فَهَلَا قَبِلَ أَنْ تَأْتِيَنِي بِهِ“۔

ترجمہ: ”عبداللہ بن صفوان نے اپنے والد (صفوان) سے روایت کیا کہ وہ مسجد میں اپنی چادر کا تکیہ بنا کر سوئے ہوئے تھے کہ (کسی شخص نے) ان کے سر کے نیچے سے (چادر چھالی)، تو وہ اپنے چور کو پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے، حضور نے (اعتراف جرم کے بعد) اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمایا، تو (اس موقع پر) صفوان نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میرا ارادہ یہ نہیں تھا (کہ اس کا ہاتھ کاٹا جائے)، میری یہ چادر اس پر صدقہ ہے (یعنی اسے معاف کر دیجئے)، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تو تم نے مقدمہ میرے پاس لانے سے پہلے ایسا کیوں نہ کر دیا“، (سنن ابن ماجہ: 2595)۔“

چونکہ ”حد شرعی“ کا مقدمہ جب قاضی کے سامنے پیش ہو جائے تو پھر اعتراف جرم یا

کو اہوں کے ذریعے جرم ثابت ہونے کے بعد مقدمہ واپس نہیں لیا جاسکتا، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے حد نافذ فرمادی، لیکن آپ نے اس بات کو پسند فرمایا کہ مدعی، قاضی کی عدالت میں مرافعہ سے پہلے اپنے قصور و اوار اور ملزم کو معاف کر دے اور اس کی ستر پوشی کرے۔ بلکہ اسلام نے مسلمان کی ستر پوشی کو بہت بڑی نیکی قرار دیا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(1) من ستر مسلماً ستره الله يوم القيامة۔

ترجمہ: ”جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیوب کو (اپنی عفو و مغفرت اور رحمت میں) مستور فرمائے گا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 2442)۔“

(2) من رأى عورة اخيه فسترها كمن احيا مودة۔

ترجمہ: ”جس شخص نے اپنے (کسی دینی بھائی) کے عیب کو دیکھا اور اس کی پردہ پوشی کی، تو وہ (اللہ تعالیٰ کے ہاں) اس شخص کی مانند اجر پائے گا، جس نے کسی زندہ درگور بچی کو (نکال کر) اسے (نئی) زندگی عطا کر دی ہو، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث 4855)۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین و شریعت کی اصل روح یہ ہے کہ خطا کار کی پردہ پوشی کی جائے، الا یہ کہ کسی خاص صورت حال میں شریعت کا تقاضا اس کے برعکس ہو۔ اب صورت مسئلہ میں چونکہ آپ پر اللہ کا کرم ہوا اور آپ نے ماضی کی معصیت کی زندگی کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور حقوق العباد کی جو حق تلفی آپ سے ہوئی ہے، آپ اس کی تلافی کرنا چاہتے ہیں، تو یہ بڑی سعادت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ”ستار العیوب“ ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ صدق دل سے اللہ تعالیٰ سے توبہ کریں اور جتنا مال

آپ نے ادارے یا افراد کا ناحق لیا ہے، اتنی مالیت آپ ان کو لوٹا دیں، اس طرح کہ وہ اس پر مالکانہ تصرف کر سکیں، خواہ آپ اسے عطیہ کا نام دیں، ہبہ کا نام دیں یا اعانت کہیں، جو بھی حالات کے تحت مناسب ہو، ان کو یہ بتانا ضروری نہیں ہے کہ آپ نے ان کا اتنا مال ناجائز طریقے سے لیا تھا۔ اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتے رہیں کہ وہ دنیا و آخرت دونوں میں اپنے ظلم رحمت اور اپنے حبیب کریم ﷺ کے دامن رحمت میں پناہ عطا فرمائے اور دنیا و حشر میں رسوائی سے محفوظ فرمائے۔ اور ان افراد سے یہ کہیں کہ مجھے احساس ہے کہ دانستہ یا نادانستہ مجھ سے آپ کی حق تلفی ضرور ہوئی ہوگی، خواہ آپ کو یا نہ ہو یا نہ ہو، میری ان سب تقصیرات کو معاف فرما دیں تاکہ میں اپنے ضمیر کو مطمئن کر کے اور احساس گناہ کے بوجھ سے ہلکا ہو کر سفر حج پر روانہ ہو سکوں اور اللہ تعالیٰ کے اس اجر و ثواب کا یقینی امیدوار بن سکوں، جو رسول اللہ ﷺ نے حج مبرور کیلئے بیان فرمایا ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں: (ویرا بردھا ولو بغیر علم المالك) فی

”البرازية“ غصب دراهم انسان من کیسه ثم ردھا فیہ بلا علمہ بری۔ ترجمہ: ”اور (جس نے کسی کی کوئی چیز غصب کر لی ہو یا باطل طریقے سے لے لی ہو تو) اسے مالک کے علم میں لائے بغیر اسے لوٹا دینے سے وہ غاصب بری الذمہ ہو جائے گا، اور ”برازیہ“ میں ہے کہ ایک شخص نے کسی دوسرے شخص کی کچھ رقم، اس کے پرس سے نکال لی اور پھر اسے بتائے بغیر واپس رکھ دیا (یا اسے لوٹا دیا) تو وہ بری الذمہ ہو جائے گا، (رد المحتار علی الدر المختار: جلد: 9، ص: 220، 219، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

علامہ شامی لکھتے ہیں: ولو سألہ سلطان عن فاحشة وقعت منه سرا کرنا

او شرب فله ان يقول ما فعلته لان اظهارها فاحشة اخري۔

ترجمہ: ”اگر حاکم کسی شخص سے اس کے جرم کے متعلق پوچھے، جو اس نے چھپا کر کیا ہے، جیسے شراب پینا یا زنا کرنا، تو اس کیلئے جائز ہے کہ وہ یہ کہے کہ یہ کام میں نے نہیں کیا، چونکہ بے حیائی کا اظہار بھی بے حیائی ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار: جلد: 9، ص: 525، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

شرعاً قسم منعقد نہیں ہوئی

سوال: 169

والدہ کے انتقال کے بعد میرے چھوٹے بھائی طارق نے مجھ پر غلط قسم کے الزامات لگائے اور میرے بچوں سے تمام بات کی، مجھے بعد میں معلوم ہوا تو میں نے اس سے پوچھا اس بات پر میرے ساتھ مار پیٹ کی جھگڑا بڑھ گیا اس کی بیوی نے بھی میرے ساتھ تشدد کیا۔ جب میرے بیٹے عرفان کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھوا کر مجھ سے کہا کہ تم حلفیہ قسم کھاؤ کہ اب اپنے بھائیوں اور بہنوں سے واسطہ نہ رکھو گی، اگر رکھو گی تو میرے مرے کا منہ دیکھو گی۔ اب آپ شرع، حدیث کی روشنی میں بتائیں کہ یہ قسم کیسے توڑی جائے گی؟، (جہاں آراء، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

آپ نے اپنے سوال میں لکھا ہے: ”جب میرے بیٹے عرفان کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھوا کر مجھ سے کہا کہ تم حلفیہ قسم کھاؤ کہ اب اپنے بھائیوں اور بہنوں سے واسطہ نہ رکھو گی، اگر رکھو گی تو میرے مرے کا منہ دیکھو گی“، اس میں آپ کے قسم کھانے کا کہیں ذکر نہیں ہے، اور ”اگر رکھو گی تو میرے مرے کا منہ دیکھو گی“ یہ شرعی قسم کے کلمات نہیں ہیں، لغوی کلمات ہیں، اگرچہ بندہ مومن کو اس طرح کے کلمات ادا

نہیں کرنے چاہئیں لہذا اگر آپ کا سوال درست ہے، حقیقت واقعہ کے مطابق ہے تو اس سے شرعاً قسم منعقد نہیں ہوئی، آپ اپنے بھائیوں سے مل سکتی ہیں، اس میں کوئی کفا رہ عائد نہیں ہوتا، اور آپ کے بیٹے کو بھی اپنے ماموں سے ملنا چاہئے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ”لا یحل لرجل أن یمھر أخاه فوق ثلاث لیالٍ“۔

ترجمہ: ”مؤمن کیلئے یہ جائز نہیں کہ اپنے (دینی) بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ قطع تعلق (Boycot) کرے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 6077)۔“

نیز آپ کے بھائی نے اگر غلط الزامات لگائے ہیں تو انہیں بھی آپ سے اور اللہ سے معافی مانگنی چاہئے۔

پرائز بانڈ ز اور شیئرز کا شرعی حکم

سوال: 170

کیا Shares اور Prize Bond کا رکھنا جائز ہے؟،
(کامران، کراچی)۔

جواب:

جن اداروں / کمپنیوں کے کاروبار میں سودی لین دین شامل ہے یا کسی حرام چیز کا کاروبار ہے، تو اس کے شراکتی حصص (Shares) رکھنا یا اس کا شراکت دار بننا جائز نہیں ہے، اور جن اداروں / کمپنیوں کے کاروبار میں سودی لین دین شامل نہیں ہے یا وہ شرعی طور کسی ممنوع و حرام چیز کا کاروبار نہیں ہے، تو اس کا شراکت دار (Share Holder) بننا جائز ہے۔ انعامی بانڈز (Prize Bond) کی خرید و فروخت اور ان پر ملنے والا انعام جائز ہے، بانڈ پر درج قیمت (Face value) پر خرید و فروخت میں تو کسی کا اختلاف نہیں ہے، البتہ اس کی انعامی رقم کے جواز پر علماء کا

اختلاف ہے، ہمارے علماء اہلسنت وجماعت کے نزدیک یہ انعامی رقم لینا جائز ہے، اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے، میں ماضی میں ایکپریس کے صفحات پر اس موضوع پر قدر تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں، یہ اختلاف فقہی دلائل کی بنیاد پر ہے، یہ مسلکی نوعیت کا، اصولی یا اعتقادی اختلاف نہیں ہے۔ دور حاضر کے ایسے مسائل جو ”مجتہد قیہ“ ہیں، یعنی جن پر اس عہد کے اہل فتویٰ اور اہل علم نے دلائل شرعیہ کی روشنی میں جواز یا عدم جواز کا حکم لگانا ہوتا ہے، اور علماء کی فقہی آراء ان بارے میں مختلف ہوتی ہیں، تو ایسی صورت میں علامۃ المسلمین کو میرا مشورہ یہ ہوتا ہے کہ جن علماء کی فتاہت اور اجتہادی اہلیت پر انہیں زیادہ اعتماد ہو، ان کی رائے پر عمل کر لیا کریں، لیکن یہ ترجیح دیانت کی بنیاد پر ہو محض اتباع نفس میں نہ ہو۔

ٹریفک سنگٹل توڑنے کا شرعی حکم

سوال: 171

ٹریفک سنگٹل جو کہ عوام کی بھلائی کے لئے بنایا گیا ایک قانون ہے اور عمومی طور پر اس کی پاسداری عوام میں نظر نہیں آرہی ہے ہوال یہ ہے کہ کیا سنگٹل کا توڑنا گناہ کبیرہ میں شمار ہوتا ہے؟، (کامران، کراچی)۔

جواب:

اسلام نے حلال و حرام کی حدود مقرر کر دی ہیں، جن امور کی حرمت قرآن و سنت میں منصوص ہے، وہ قطعی ہیں ان کی حرمت پر اجماع ہو چکا ہے، ان کے بارے میں مزید بحث کی ضرورت نہیں ہے باقی ایسے تمام امور جو اپنی اصل کے اعتبار سے تشریعی نہیں ہیں، ان کے بارے میں ہمارا مسلمہ فقہی اصول ہے کہ: ”اشیاء میں اصل اباحت ہے“ تاوقتیکہ کسی دلیل شرعی سے اس کی حرمت ثابت نہ ہو جائے۔ ان مباح

امور کا دائرہ کافی وسیع ہے، ان کے بارے میں حاکم وقت (اس کی حیثیت حاکمہ حالات و زمانہ کے اعتبار سے جو بھی ہو)، متقنہ (Legislature) یا پارلیمنٹ کو اجتماعی مفاد میں قانون سازی کا حق حاصل ہے، 'Traffic Signal' یا یکطرفہ ٹریفک، دائیں یا بائیں مڑنے کی ممانعت یا پارکنگ کی ممانعت سب قوانین اسی کے ذیل میں آتے ہیں، حکومت عوامی مفاد اور انسانی زندگی کو نقصان یا ہلاکت سے بچانے کے لئے تعزیر بھی مقرر کر سکتی ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: لان طاعة الامام في ماله ليس بمعصية واجبة۔
 ”یعنی ایسے امور میں حاکم وقت کی اطاعت، جن میں از روئے شریعت معصیت لازم نہ آتی ہو، واجب ہے، اور ترک واجب گناہ صغیرہ ہوتا ہے، مومن کو ویسے بھی عزت نفس کا پاس رکھنا چاہئے۔“

کامرس یا اکاؤنٹنگ کی تعلیم میں سودی اندراج

سوال: 172

کالجوں میں عام طور پر حساب و کتاب کے حوالے سے سود کا درج کرنا اور اس کو وصول کرنا وغیرہ وغیرہ سکھایا جاتا ہے، کیا اس کی لکھت پڑت جائز ہے حالانکہ یہ عمل صرف سکھانے کی حد تک ہوتا ہے؟ اور یہ بھی بتائیں کہ کیا اس کا سکھانا گناہ کے کس درجے میں ہوگا (کبیرہ / صغیرہ)؟، (کامران، کراچی)۔

جواب:

حصول علم کی حد تک یہ جائز ہے، کیونکہ کامرس، اکاؤنٹنگ اور آڈٹنگ کے نصابی و تربیتی کورسز کا یہ لازمی حصہ ہوتے ہیں، سودی کاروباری ادارے میں ملازمت جائز نہیں ہے۔

بجلی کی چوری

سوال: 173

آپ جانتے ہوں گے کہ عموماً حکومت کے محکموں کی نااہلی کی وجہ سے جیسا کہ بجلی کے بل جو کہ صارف کو بھیجے جاتے ہیں ان میں بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ بل بنا کر بھیج دیا جاتا ہے، جبکہ اس پر اتنا بل لازم نہیں ہوتا وہ صارف اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے بجلی کے میٹر میں کچھ کمی بیشی کرواتا ہے اگرچہ قانوناً یہ جرم ہے لیکن مجبوری میں ایسا کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟، ناجائز ہونے کی صورت میں صارف اس رقم کی ادائیگی کس طرح کرے جو کہ چوری کی تھی اور اس چوری کے دوران جتنی عبادات کی تھیں کیا وہ سب ثواب سے محروم ہو گئیں؟ یا ان کا لوٹنا واجب ہے؟، (کامران، کراچی)۔

جواب :

بجلی کے میٹر میں رد و بدل کرنا خیانت کے زمرے میں آتا ہے اور یہ شرعاً جائز نہیں ہے، اسی طرح بجلی کے محکمے کا میٹروں کو تیز کر کے صارفین سے زائد بل لینا، یہ بھی خیانت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی صریح خلاف ورزی ہے کہ: وَلَا تَاْكُلُوا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ ترجمہ: ”آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ (النساء: 29)۔“ لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ کسی کا ظلم ہمارے لئے ظلم کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتا، یہ شیطان کے بہکاوے اور تزویرات ہیں، جو انسان کے نفس کو گناہ پر آمادہ کرنے کے لئے ہوتے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖٓ بُصِيْرَةٌ ۝ وَلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِرَهٗ۔ ترجمہ: ”بلکہ انسان اپنے نفس (کے حسن و قبح اور خیر و شر) پر خوب آگاہ ہے، خواہ وہ (فریبِ نفس کے لئے

(کتنے ہی عذر تراشتا رہے، (سورة القيامة: 15-14)“، اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ان كل نفس لهما عليها حافظ ترجمہ: ”ہر نفس اپنے اوپر نگہبان ہے، (الطارق: 4)“۔ حدیث پاک میں ہے: عن النّوّاس بن سمعان أنّ رجلاً سأل رسول اللہ ﷺ عن البر والاثم فقال النّبی ﷺ: ”البرُّ حسن الخلق، والاثم ما حاك في نفسك وكرهت أن يطلع عليه الناس“۔

ترجمہ: ”نوّاس بن سمعان بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ (کی پہچان) کی بابت دریافت کیا، تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے، اور برائی وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے (یعنی جس پر تمہارے دل میں چیخیں اور کسک محسوس ہو) اور تجھے یہ بات ناگوار ہو کہ لوگوں کو اس کا پتہ چل جائے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 2389)“۔

حضرت وابدہ رضی اللہ عنہ نیکی اور گناہ کے بارے میں دریافت کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو قبل اس کے کہ وہ اپنے دل کی بات کہتے، رسول اللہ ﷺ نے اس کے دل کا حال بیان کرتے ہوئے خود ہی فرمایا: کہ تم نیکی اور گناہ کی بابت پوچھنے آئے ہو؟، انہوں نے عرض کیا: جی ہاں، پھر آپ نے فرمایا: اے وابدہ! اپنے دل سے پوچھو، نیکی وہ ہے، جس پر تمہارے دل کو اطمینان و قرار نصیب ہو جائے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تمہیں دل میں تڑپ ہو (کہ کروں یا نہ کروں)، اگرچہ لوگ تمہیں (اپنے من پسند) فتوے دیتے رہیں، (مسند احمد، جلد 4، ص: 228)“۔

عبادات اور دعاؤں کی قبولیت پر محرمات کا اثر پڑتا ہے اور اس سلسلے میں احادیث موجود ہیں: عن ابن عمر، عن النّبی ﷺ قال: ”لا تقبل صلاة بغير طهور،

ولا صدقة من غلول“۔ ترجمہ: ”حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) طہارت کے بغیر نماز مقبول نہیں اور خیانت کے مال سے صدقہ قبول نہیں، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1)۔“

عن ابی ہریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: ”ایہا الناس! ان اللہ طیب لا یقبل الا طیباً۔ وان اللہ امر بالمعروف منین بما امر بہ المرسلین۔ فقال: ﴿یا ایہا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحاً انی بما تعملون علیم﴾ وقال: ﴿یا ایہا الذین امنوا کملوا من طیبات ما رزقناکم﴾ ثم ذکر الرجل یطیل السفر اشعث اغبر۔ یمسک یدیه الی السماء۔ یارب! یارب! ومطعمہ حرام، ومشربہ حرام، وملبسہ حرام وغذی بالحرام،۔ فانی يستجاب لذلك؟۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! بے شک اللہ صرف پاک (صدقات کو) مقبول فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو بھی اسی بات کا حکم دیا ہے، جس کا حکم رسولوں کو دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے رسولو! پاکیزہ رزق میں سے کھاؤ اور نیک کام کرو بیشک تم جو بھی عمل کرتے ہو، مجھے اس کا بخوبی علم ہے، (المؤمنون: 51)۔“ پھر آپ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ وہ غبار آلود ہے، بال پر اگندہ ہیں، طویل سفر کر کے آیا ہے، اور اپنے ہاتھ دعا کے لئے آسمان کی طرف پھیلا کر پکارتا ہے: اے میرے پروردگار، اے میرے پروردگار! اور اس کا کھانا حرام کا ہے، پینا حرام سے ہے اور لباس حرام کا ہے اور اسے حرام ذرائع سے غذا دی جاتی ہے، تو کیسے اس کی دعا قبول ہوگی، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2308)۔“

انجکشن کے ذریعے جانوروں کی افزائش نسل کا جواز

سوال : 174

جانوروں کی نسل بڑھانے کے لئے انجکشن لگانے والا طریقہ جائز ہے یا نہیں؟، (اسد رؤف بلوچ، کراچی)۔

جواب :

جانوروں کی افزائش نسل (Breeding) کے لئے نر جانور (Male Animal) کے مادہ منویہ (Semen) کے تولیدی جراثیم (Sperm) کو انجکشن کے ذریعے مادہ جانور (Female Animal) کی بچہ دانی (Uterus) میں پہنچانا جائز ہے، اس کے نتیجے میں حلال جانوروں (بھینس، بکری، گائے، بھینس، اونٹنی وغیرہ) کے جو بچے پیدا ہوتے ہیں، وہ بھی حلال ہوتے ہیں، ان کی قربانی بھی ہر قسم کی کراہت سے پاک ہے اور جائز ہے۔ احکام شرعیہ اور رشتہ ازدواج اور عقد نکاح کی حلت (Permission) اور حرمت (Prohibition) کے احکام کا تعلق انسانوں سے ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نعمت عقل عطا کر کے خیر و شر اور حلال و حرام میں تمیز کا ملکہ اور فطری استعداد اور جبلت بھی عطا فرمائی ہے اور انبیاء کرام و رسل عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور کتب سماوی کے ذریعے خارجی ہدایت کا بھی اہتمام فرمایا ہے، جانور احکام کے مکلف نہیں ہیں۔

روحانی علاج کی شرعی حیثیت

سوال : 175

روحانی علاج کا حکم قرآن پاک سے ثابت ہے۔ تو قرآن پاک اور حدیث کی روشنی میں اور مستند کتابوں کے حوالوں سے روحانی علاج کا شرعی حکم کیا ہے؟۔

روحانی علاج جو کہ کلام الہی سے کرتے ہیں اور اس کا ہدیہ مبارک لیتے ہیں یہ جائز ہے؟ تو قرآن پاک اور حدیثوں کے حوالوں سے اوستند کتابوں کے حوالے سے فتویٰ عنایت فرمائیں، تاکہ ہماری دینی اصلاح ہو جائے، (صوفی محمد اقبال قادری چشتی ناصری جلالی، مکان 135/10 سیکٹر 11/D نیو کراچی)۔

جواب :

کسی کے لئے دعائے خیر، آیات الہی یا کلمات مقدسہ پڑھ کر دم کرنا یا اسمائے مبارکہ اور آیات لکھ کر تعویذ کی صورت میں باندھنا یا لٹکانا شرعاً جائز ہے۔ امراض جس طرح جسمانی و طبعی ہوتے ہیں، اسی طرح روحانی، اخلاقی اور اعتقادی بھی ہوتے ہیں، اس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے ”شافی الامراض بالذات“ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس کی مشیت کے بغیر شفاء کا ملنا ناممکن ہے، لیکن یہ عالم اسباب ہے اور ہم شرعاً اسباب کو اختیار کرنے کے مکلف ہیں یا یہ کہ اسباب کا اختیار کرنا جائز ہے۔ جیسے بیماری کی صورت میں ہم ڈاکٹر سے رجوع کرتے ہیں اور دواؤں کا استعمال کرتے ہیں، لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ طبیب کی تشخیص اور دوا کی تاثیر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔ اسی طرح دعا، دم اور تعویذ وغیرہ ازالہ مرض و شر کے روحانی اسباب ہیں جیسے دوا مادی سبب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَنُزِّلَ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۚ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ ۖ

خسار ۱۰

ترجمہ: ”اور ہم قرآن میں ایسی چیز نازل فرماتے ہیں جو اہل ایمان کے لئے

(وسیلہ) شفا و رحمت ہے اور ظالموں کے لئے تو صرف نقصان ہی میں اضافہ کر رہا ہے، (بنی اسرائیل: 80)۔“

اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ قرآن اخلاقی اور اعتقادی امراض کے لئے شفا ہے، تاہم جمہور مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ آیات قرآنی پڑھ کر دم کرنے یا آیات واسمائے الہی کا تعویذ باندھنے سے اللہ تعالیٰ جسمانی امراض سے بھی شفا عطا فرماتا ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد اور مسند احمد میں یہ حدیث ہے کہ حضرت ابوسعید خدری نے سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کیا اور ایک شخص جو بچھو کے کاٹنے سے تڑپ رہا تھا اسے شفاء مل گئی، انہوں نے اس پر بکریوں کا ریوڑ معاوضہ بھی لیا۔ لیکن صحابہ کا آپس میں اختلاف ہو گیا کہ آیا یہ اجرت، جسے آج کل کی اصطلاح میں نذرانہ کہتے ہیں، جائز ہے یا نہیں؟ لہذا انہوں نے توقف کیا اور مدینہ طیبہ پہنچ کر حضور ﷺ سے اس کا شرعی حکم دریافت کیا تو آپ نے نہ صرف اسے جائز قرار دیا بلکہ فرمایا کہ اس میں سے مجھے بھی دو۔ یہ بعض مواقع پر حضور ﷺ اس لئے کرتے تھے تا کہ صحابہ کرام کو اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہ رہے۔ آیات قرآنی اور کلمات مقدسہ پڑھ کر دم کرنے (نظر بد یا موذی جانوروں کے ایذا یا جنات وغیرہ کے اثر یا مرگی کے دورے سے تحفظ کے) کا ثبوت و جواز متعدد احادیث مبارکہ اور رسول اللہ ﷺ کے اپنے عمل مبارک سے بھی ثابت ہے۔ لیکن یہ قرآن مجید کی ضمنی اور اضافی برکات ہیں۔ بنیادی طور پر قرآن مجید کتاب ہدایت اور ضابطہ عمل ہے جس پر ایمان بھی ضروری ہے اور اس کے احکام پر عمل بھی اور قرآن پاک کی اسی جہت کو غالب حیثیت حاصل ہے۔ جن احادیث مبارکہ میں تعویذ یا دم کی ممانعت آئی ہے وہ اس پر محمول ہے کہ (1) وہ دم یا منتر کلمات شرک و کفر یا کلمات ضلالت پر مشتمل ہو اور (2) یا یہ کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ذات کو فراموش کر کے محض اسباب کو مو

کثر بالذات مانے۔ بلاشبہ موثر بالذات صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اسباب میں تاثیر اسی نے پیدا فرمائیں اور وہ جب چاہے اسے سلب فرما سکتا ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ حوالہ جات بالا سے روحانی علاج اور اس پر ہدیہ و نذرانہ کا جواز ثابت ہوتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

مفت محمد اسحاق

WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿متفرق﴾

والدین کی خدمت کے وسیلے سے دعا کرنے پر اجرِ آخرت باطل نہیں ہوتا

سوال: 177

کسی نے بتایا تھا کہ والدین کی خدمت کا بہت اجر ہے۔ سوال یہ ہے کہ ”اگر ہم اس خدمت کے واسطے سے دعا کریں، تو اس کا اجر کم تو نہیں ہوگا، کہ یہاں مل جائے تو آخرت میں اللہ کہے کہ اجر تو دنیا میں ہی لے لیا ہے، اب میرے پاس کیا لینے آئے ہو“۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں، (حماد خان، بذریعہ ای میل معرفت روزنامہ ایکسپریس)۔

جواب :

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ تَرْجَمُهٗ: ”اے ایمان والو! صبر و نماز (کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ کی) مدد طلب کرو، (البقرة: 153)“۔ اس ارشاد باری تعالیٰ سے معلوم ہوا کہ اعمالِ خیر کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے استعانت کا وسیلہ بنایا جاسکتا ہے، آیت میں صبر اور نماز کا ذکر ہے اور بعض مفسرین کرام نے صبر سے روزہ مراد لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہی عمل خیر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول و مآجور ہے جو دنیوی صلہ و ستائش کی تمنا کئے بغیر محض اجرِ آخرت اور رضاءِ الہی کے لئے کیا جائے اور حدیث مبارک ”اَتْمَمَ الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ“ یعنی اعمال (پر جو جزا مرتب ہوتی ہے اس کا) مدار (اس کی) نیت اور ارادے پر ہوتا ہے (جو اس عمل کا محرک بنتی ہے)، سے بھی یہی مراد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے:

وَمَا أَمُرُوا إِلَّا لِیُعْبَدُوا اللّٰهُ مَخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ۔ ترجمہ: ”اور انہیں فقط اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس حال میں کریں کہ اطاعت خالص اسی کی ذات کے لئے ہو، (البینۃ: 5)۔“

حدیث پاک میں ہے: امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی اپنی سند کے ساتھ عبد اللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جسے اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کے کسی بندے سے کوئی حاجت درپیش ہو تو اسے چاہئے کہ وضو کرے اور نہایت اچھے طریقے سے وضو کرے، پھر دو رکعت نماز نفل (صلوۃ الحاجت) پڑھے، پھر اللہ تعالیٰ کی شاپرہے، پھر نبی ﷺ پر درود پڑھے اور پھر یہ دعا پڑھے: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْحَمْدُ لِلَّهِ الْكَرِيمِ، سُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، أَسْأَلُكَ مُوجِبَاتِ رَحْمَتِكَ، وَغَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ، وَالْغَنِيمَةَ مِنْ كُلِّ بَرٍّ، وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ إِثْمٍ، لَا تَدْعُ إِلَيَّ ذَنْبًا إِلَّا غَفَرْتَهُ، وَلَا هَمًّا إِلَّا فَرَجْتَهُ، وَلَا حَاجَةً إِلَيَّ لَكَ رِضًا إِلَّا قَضَيْتَهَا يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ۔

ترجمہ: ”اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں، بہت بُر دبا رہنا بیت کرم فرمانے والا ہے، اللہ (ہر عیب اور نقص سے) پاک ہے، عرش عظیم کا مالک ہے، تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، اے اللہ! میں تجھ سے (ان اعمالِ خیر کی توفیق چاہتا ہوں) جو تیری رحمت کا باعث ہوں، اور ایسے نیک پختہ ارادوں کا طلب گار ہوں جو تیری مغفرت کا سبب بنیں، اور تجھ سے تمام نیکیوں کی توفیق کا سوال کرتا ہوں اور ہر گناہ سے حفاظت کا طلب گار ہوں، (میرے) ہر گناہ کو بخش دے، ہر غم (اور رنج و الم) میں کشادگی عطا فرما، اے سب سے بڑے رحم فرمانے والے! میری ہر اس حاجت کو پورا فرما جو تیری رضا کا باعث ہے، (سنن ترمذی، رقم

الحديث: (479) "، اس حدیث کو امام ترمذی نے ضعیف قرار دیا ہے، لیکن فضائل اعمال میں ضعیف حدیثیں بھی معتبر ہوتی ہیں۔ اسی طرح صحیح بخاری رقم الحديث: 2215 میں تین آدمیوں کے غار میں پھنس جانے کا ذکر ہے اور پھر وہ باہمی مشورے سے باری باری اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے ان نیک اعمال کا ذکر کرتے ہیں، جو انہوں نے خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کئے تھے، ان میں سے ایک شخص نے ماں باپ کی اس خدمت کا وسیلہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا، جو اس نے رضاء الہی کے لئے کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کے اعمال خیر کے وسیلے کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرمایا اور وہ چٹان جس نے ان کی غار کا دہانہ بند کر دیا تھا اور وہ اس میں پھنس کر رہ گئے تھے، آہستہ آہستہ سرکتی گئی اور آخر کار غار کا دہانہ کھل گیا اور وہ صحیح سلامت باہر نکل آئے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جو عمل خیر انجام دیا جائے، اس کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے استعانت (مدد مانگنے) کا خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حکم فرمایا ہے، یہ صیغہ امر کے ساتھ ہے جو کم درجے میں استحباب کے معنی میں ضرور ہے۔ اسی طرح قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کی ترغیب دی گئی ہے، کوئی بھی نیک عمل جو رضاء الہی کے لئے کیا گیا ہو، اس کے وسیلے سے دعا مانگنا، خواہ عذابِ آخرت سے نجات کی دعا ہو، یا کسی دنیوی مصیبت سے نجات کی، اس سے اس عمل خیر کا اجر آخرت ضائع نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے اس کی امید قائم رکھنی چاہئے، اسی طرح آپ نے سوال میں جو والدین کی خدمت کی بابت دریافت کیا ہے، اگر اس کے وسیلے سے کسی دنیوی مصیبت کوٹالنے کی دعا کی جائے، تو اس سے اس کا اجر باطل نہیں ہوتا بلکہ قائم رہتا ہے، بشرطیکہ والدین کی یہ خدمت کسی دنیوی طمع و غرض سے نہ کی ہو بلکہ صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لئے کی ہو۔

پرائیویٹ اسکولوں / کالجوں میں ایام تعطیلات کی فیس کا شرعی حکم
قوم کا اصل مسئلہ طبقاتی نظامِ تعلیم ہے

سوال: 178

کچھ عرصہ قبل نیو کراچی میں ایک مفتی صاحب حلال و حرام کے موضوع پر
تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کے دوران انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اسکولوں میں چونکہ ماہ
جون اور جولائی میں تدریس نہیں ہوتی لہذا ان مہینوں کی فیس لینا اسکول والوں کے
لئے جائز نہیں۔ مفتی صاحب کی تقریر نے اس علاقہ میں اسکول مالکان کے لئے مسئلہ
کھڑا کر دیا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ قانون کے مطابق اسکولوں کے لئے ضروری
ہے کہ وہ اسٹاف کو جون اور جولائی کی تنخواہیں پوری پوری ادا کریں، مزید یہ کہ جو
اسکول کرائے کی عمارتوں میں قائم ہیں انہیں ان مہینوں کا کرایہ بھی دینا پڑتا ہے
۔ سوال یہ ہے کہ اگر جون، جولائی کی فیسیں وصول نہیں کی جائیں تو اسٹاف کی تنخواہ اور
دیگر اخراجات کیسے پورے ہوں گے؟ جناب سے التماس ہے کہ اس مسئلے پر روشنی
ڈالیں اپنی قیمتی رائے کا اظہار فرمائیں، (انتظامیہ نالج انگلش اسکول، 25/12 سیکٹر
E-5 نیو کراچی)

جواب:

معاهدات و عقود بعض شروط ہوتے ہیں اور یہ زیادہ بہتر ہے، کیونکہ اس سے
بعد میں کوئی تنازع پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا اسکول کی انتظامیہ کو چاہئے کہ داخلہ فارم کی
شرائط میں واضح طور پر لکھ دے کہ طالب علم کو بارہ ماہ کی فیسیں پوری ادا کرنی
ہوگی۔ سالانہ تعطیلات اس لئے نہیں ہوتیں کہ اسکول کی انتظامیہ یا اساتذہ پڑھانا نہیں
چاہتے، بلکہ ان تعطیلات کا نظام حکومت کی طرف سے جبری ہوتا ہے اور یہ ایک عالمی

روشن ہے۔ اگر داخلہ فارم کے معاہدے میں لکھا نہ بھی ہو تب بھی یہ معہود (Under stood) ہوتا ہے اور فقہی قاعدہ ہے کہ ”المعہود کالمشروط“ یعنی یہ ایک ایسی شرط ہے جو فریقین کے ذہن میں بھی تقریباً طے شدہ ہے اور خارج میں بھی تعامل عام (General practice) اسی پر ہے۔ لہذا اسکولوں کے لئے ایام تعطیلات کی فیس لینا جائز ہے اور اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس تنازع کے حل کے لئے فریقین یہ بھی کر سکتے ہیں کہ سالانہ بارہ ماہ کی فیسوں کی جو مجموعی رقم بنتی ہے، اسے دس ماہانہ قسطوں میں تقسیم کر دیں اور اس طرح تعطیلات کے مہینوں کے بارے میں یہ نزاع پیدا ہی نہیں ہوگا۔ اور یہ بات بھی درست ہے کہ اسکول کی انتظامیہ کو اپنے عملے کو بارہ ماہ کی تنخواہ دینی ہوتی ہے، اور اسی طرح بلڈنگ کا کرایہ اور دیگر واجبات بھی ادا کرنے ہوتے ہیں، لہذا مفتی صاحب کا حقائق کو معلوم کئے بغیر اس پر حرمت کا فتویٰ لگانا درست نہیں ہے، البتہ ان اعلیٰ کیٹگری کے تعلیمی اداروں کے خلاف آواز اٹھانا درست ہے، جو غیر معمولی فیسیں اور مختلف عنوانات کے تحت دیگر رقوم بھی بٹرتے ہیں، جس کی وجہ سے تعلیم صنعت بن چکی ہے، بلکہ یہ سب سے کامیاب اور منافع بخش صنعت ہے، اور یہی سبب ہے کہ اعلیٰ معیار کے تعلیمی ادارے صرف اُمراء، صنعت کاروں، اعلیٰ مراتب کے بیوروکریٹ اور اہل ثروت کے بچوں کے لئے مختص ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور اس طرح تمول و غربت پر مبنی یہ ایک طبقاتی نظام بن چکا ہے، جس میں دولت سے محروم طبقات استحقاق، اہلیت، محنت اور قابلیت کے باوجود وافر دولت نہ ہونے کے سبب مواقع سے محروم رہ جاتے ہیں، اولین مرحلے ہی میں حاکم و محکوم کی منزلیں جدا ہو جاتی ہیں۔

استخارہ کا مفہوم، شرعی حیثیت اور استخارہ کے نام پر ماضی کے احوال بتانا

سوال: 179

استخارہ کا معنی و مفہوم کیا ہے اور حدیث کی روشنی میں اس کا صحیح طریقہ کیا ہے، کیا ہر معاملے میں استخارہ کرنا ضروری ہے، کسی کام سے پہلے استخارہ نہ کرنے والا یا استخارہ کرنے کے بعد اگر کوئی شخص کسی وجہ سے اس پر عمل نہ کر سکے، تو گنہگار تو نہیں ہوگا؟، (منور احمد نعیمی، بلیر کالونی، کراچی)۔

جواب:

استخارہ کے لفظی معنی ہیں: خیر طلب کرنا اور اس کے جامع معنی ہیں: وہ معاملہ جس کے نفع بخش یا نقصان دہ ہونے کا انسان اپنی عقل کی روشنی میں فیصلہ نہ کر سکے اور تردد میں مبتلا ہو جائے کہ اسے کروں یا نہ کروں، تو اللہ تعالیٰ سے رہنمائی طلب کرے، اس کا تعلق ماضی کے معاملات سے نہیں ہے، مستقبل میں درپیش ایسے معاملات سے ہے، جن کو کرنا ہے۔ ایسے تمام معاملات جن کا خیر ہونا، شریعت میں ثابت ہے، ان کے لئے استخارہ نہیں کیا جائے گا، جیسے نماز، روزہ، حج اور جہاد وغیرہ، فارسی کا مقولہ ہے ع درکار خیر حلیت استخارہ نیست۔ ہاں البتہ کسی کار خیر کے لئے شریعت میں وقت مقرر نہیں ہے بلکہ توسع ہے، تو تعمین وقت کے لئے استخارہ کر سکتے ہیں۔ بنیادی طور پر استخارہ مباح امور میں ہوتا ہے، جیسے نکاح اپنی اصل کے اعتبار سے مشروع ہے اور سنت ہے اور بعض اشخاص کے لئے ان کے بشری احوال کے مطابق واجب کے درجے میں ہے، لیکن نکاح کے لئے کس کا انتخاب کیا جائے، اس کے لئے اگر کوئی پیغام یا پیشکش آئے، تو اس کے لئے استخارہ کیا جاسکتا ہے، حدیث پاک میں ہے:

عن جابر رضي الله عنه قال كان النبي ﷺ يعلمنا الاستخارة في الأمور كلها كالسورة من القرآن إذا هم أحدكم بالأمر فليركع ركعتين من غير الفريضة ثم يقول اللهم اني استخيرك بعلمك وأستقدرك بقدرتك وأستئلك من فضلك العظيم فانك تقدر ولا أقدر، وتعلم ولا أعلم، وانت علام الغيوب، اللهم ان كنت تعلم ان هذا الأمر خير لي في ديني ومعاشي وعاقبة أمري - او قال في عاجل أمري واجله - فاقدره لي وان كنت تعلم ان هذا الأمر شر لي في ديني ومعاشي وعاقبة أمري او قال في عاجل أمري واجله فاصرفه عني واصرفني عنه واقدر لي الخير حيث كان ثم ارضني به ويسمي حاجته۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ ہمیں تمام امور میں ”استخارہ“ کی تعلیم فرماتے تھے، اس اہتمام کے ساتھ، جیسے قرآن کی کسی سورت کی تعلیم فرمایا کرتے تھے، (تو استخارہ یہ ہے کہ) جب تم میں سے کوئی کسی کام کا ارادہ کرے، تو اسے چاہئے کہ دو رکعت نفل پڑھے، پھر کہے: اے اللہ! میں تیرے علم کی روشنی میں خیر کی طرف رہنمائی چاہتا ہوں، اور تیری قدرت سے (حصولِ خیر کے لئے) قدرت کا طلبگار ہوں اور میں تیرے فضلِ عظیم سے سوال کرتا ہوں، کیونکہ تو قدرت والا اور میں عاجز و بے بس ہوں، اور تو (ہر معاملے کے انجام کو) جانتا ہے، اور میں کچھ بھی نہیں جانتا اور تو تمام غیبی امور کا بہت زیادہ جاننے والا ہے، اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ معاملہ (جو مجھے درپیش ہے)، میرے دین، میرے معاش اور انجامِ کار کے اعتبار سے، اور فوری اور دیرپا فائدے کے اعتبار سے میرے لئے بہتر ہے، تو تو اسے میرے لئے مقدر فرما۔ اور (اے اللہ!) اگر تو جانتا ہے کہ یہ معاملہ

(جو مجھے درپیش ہے)، میرے دین، میرے معاش اور انجامِ کار کے اعتبار سے، فوری اور دیر پا فائدے کے اعتبار سے میرے لئے برا ہے تو اسے مجھ سے دور کر دے اور مجھے اس سے دور کر دے، اور (اس کے بدلے میں) خیر جہاں بھی ہے، وہ میرے لئے مقدر فرما، پھر اس پر میری طبیعت کو راضی کر دے (یعنی مجھے اس کے بارے میں قلبی اطمینان اور قرار و سکون نصیب ہو جائے کہ بس یہی میرے لئے خیر ہے)، اور ”ہذا الامر“ (یعنی یہ معاملہ) کے بجائے (چاہے تو) اپنی حاجت کا نام لے کر دعا کرے (جیسے شادی، کاروبار، کسی کے ساتھ شراکت وغیرہ، الغرض جو بھی مسئلہ درپیش ہو، اس کا نام لے)، (صحیح البخاری، جلد 4 ص: 2004، رقم الحدیث: 6382 مطبوعہ المکتبۃ العصریہ، بیروت)۔ اس حدیث کو امام مسلم کے سوا محدثین کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے، مثلاً امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی اور امام بیہقی وغیرہم۔

”علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: ومنہا رکعت الاستحارة۔

اور ان مستحب نمازوں میں دو رکعت نماز استحارہ ہے، اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وفي الحلية ويستحب افتتاح هذا الدعاء وختمه بالحمدلة والصلوة وفي الاذكار انه يقرء في الركعة الاولى الكافرون وفي الثانية الاخلاص وعن م بعض السلف انه يزيد في الاولى ”و ربك يخلق ما يشاء ويختار“ ط ما كان لهم الخيرة ط سبحن الله وتعالى عما يشركون 0 وربك يعلم ما تكن صدورهم وما يعلنون“ وفي الثانية وما كان لمؤمن ولا مؤمنة الا بهـ وينبغي ان يكررها سبعاً كما روى ابن السنن يانس اذا همت بأمر فاستخر ربك فيه

سبع مرات ثم انظر الى الذي سبق الى قلبك فان الخير فيه ولو تعذرت عليه الصلوة استخارة بالدعاء اه ملخصا وفي شرح الشريعة المسموع من المشائخ انه ينبغي ان ينام على طهارة مستقبل القبلة بعد قراءة الدعاء الحمد كور فان رأى في منامه بياضا او خضرة فذلك الامر خير وان رأى فيه سوادا او حمرة فهو شر ينبغي ان يحتنب اه۔

اور ”حلیہ“ میں ہے اور اس دعاء استخارہ کی ابتدا اور آخر میں حمد و صلوٰۃ پڑھنا مستحب ہے، اور ”الاذکار“ میں ہے: پہلی رکعت میں سورہ ”الکافرون“ پڑھے اور دوسری میں سورہ ”اخلاص“ اور بعض بزرگوں سے روایت ہے کہ پہلی رکعت میں ”و ربك يخلق ما يشاء ويختار“ ط ما كان لهم الخيرة ط سبحن الله وتعالى عما يشركون 0 و ربك يعلم ما تكن صدورهم وما يعلنون 0 (القصص: 68-69) تک ان کلمات کا اضافہ کرے اور دوسری رکعت میں سورہ احزاب، آیت: 36 کا اضافہ کرے۔ (اور اگر درپیش مسئلہ کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں قلبی اطمینان حاصل نہ ہو تو) سات دن تک مسلسل یہ نماز پڑھے، جیسا کہ ابن السنی نے روایت کیا ہے: (ترجمہ:) ”اے انس! جب تو کسی کام کا ارادہ کرے، تو اپنے رب سے اس میں سات بار رہنمائی کی دعا کرتا رہے، پھر غور و فکر کر کہ تیرے دل میں جو بات قرار پائی ہے (یعنی اس کام کا کرنا یا نہ کرنا)، بس خیر اسی میں ہے“، اور اگر اس کے لئے نماز پڑھنا دشوار ہو تو صرف دعا کر کے استخارہ کر لے، (یہ ”اذکار“ کی عبارت کا) خلاصہ ہے، اور ”شرح الشرحہ“ میں ہے کہ (ہم نے اپنے) مشائخ سے سنا ہے کہ مذکورہ دعا پڑھنے کے بعد با وضو ہو کر قبلہ رو سو جائے، اگر اپنی خواب میں سفید یا ہر رنگ دیکھے تو سمجھ لے کہ اس میں خیر ہے، (اور اس کام کو کر لے) اور اگر کالا یا سرخ رنگ دیکھے

تو سمجھ لے کہ اس میں شر ہے، پھر اس کام سے اجتناب کرے، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد نمبر 2 صفحات 410 - 409 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حدیث پاک میں خواب میں کسی چیز کے نظر آنے یا نہ آنے کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی خواب کا آنا ضروری ہے، یہ بزرگوں اور اہل خیر کے اپنے اپنے تجربات ہیں، لیکن اگر خواب نظر آجائے تو اس سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ مگر اصل چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرنے کے بعد جب دل کو کسی ایک جانب سکون و قرار نصیب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھرپور اعتماد کرتے ہوئے اس کام کو کر لے، اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے گا۔ اور اگر خدا نخواستہ اس پر عمل کرنے کے نتیجے میں کسی ناکامی کا سامان ہو تو یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ کی منشا کو سمجھنے میں مجھ سے خطا ہوگئی ہے، اور یا یہ سمجھے کہ اگر اس کے برعکس کیا ہوتا تو ممکن ہے کہ (خدا نخواستہ) اس سے بڑی ناکامی یا نقصان کا سامنا کرنا پڑتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَسَىٰ اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ اَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ۔

ترجمہ: ”ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو تم اپنے حق میں ناپسندیدہ سمجھو، (مگر) وہ (درحقیقت) تمہارے حق میں بہتر ہو اور (یہ بھی) ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو تم اپنے لئے پسندیدہ سمجھو (مگر درحقیقت) وہ تمہارے لئے بری ہو، (البقرہ: 216)۔“

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک دعا کسی نازل شدہ مصیبت کے لئے بھی مفید ہے (کہا اگر وہ صبر و تحمل کا پیکر بن کر اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ اس مشکل سے اسے نجات دے دے گا یا صبر و تحمل پر اسے اجر عظیم سے نوازے گا)، اور ان مصیبتوں کے لئے بھی

دعا مفید ہے، جو ابھی نازل نہیں ہوئی ہیں (یہ دعا ان کے لئے رُک بلا کا سبب بن جائے گی)، سوائے اللہ کے بندو! دعا کو اپنا لازمی شعار بناؤ (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی، ص: 195)۔ صرف نبی کا خواب یا الہام، ”مُجْتَبِیٰ قَطْعِیَّہ“ ہوتا ہے۔ اور غیر نبی کا خواب یا الہام ایک ظنی امر ہے لہذا اگر کسی نے کسی مسئلے میں استخارہ کر لیا اور کسی وجہ سے اس پر عمل نہ کیا، تو اس سے گنہگار نہیں ہوگا، نہ ہی اس پر کوئی وبال آئے گا۔

”استخارہ“ کی روح یہ ہے کہ جس بندے کو کوئی مسئلہ درپیش ہے، وہ خود استخارہ کرے، کیونکہ جتنا درد، شکستگی، دل، حضوری قلب، تھریع و عاجزی کسی شخص کو اپنے معاملے میں ہو سکتی ہے، دوسرے شخص کو نہیں ہو سکتی۔ حدیث میں ہے: رب ذو الجلال فرماتا ہے: ترجمہ: میں ان کے پاس ہوتا ہوں، جو میری (خشیت و محبت اور انکسار کی) وجہ سے شکستہ دل رہتے ہیں، (الاسرار الرُفُوع، رقم الحدیث: 249، کشف الخفاء ج 1 ص: 232، الشفاء قاضی عیاض مالکی ج 1 ص: 78)۔“

جو شخص اپنے درپیش مسئلے میں پانچ سات بار عاجزی سے اپنے رب کے حضور التجا اور طلبِ خیر و دعا کے لئے ذہنی، فکری اور عملی طور پر آمادہ نہ ہو، وہ استخارے کی روح اور حقیقت کو سمجھا ہی نہیں۔ باقی وہ لوگ جو استخارے کے نام پر ماضی کے احوال بتاتے ہیں کہ کسی پر کالا جادو ہو گیا ہے، سفلی عمل کر دیا گیا ہے، چند سیکنڈ میں یہ تمام غیبی امور ان پر منکشف ہو جاتے ہیں اور ایک ہی لمحے میں ان کا حل بھی نکل آتا ہے، اس کا مجھے علم نہیں ہے، اس سے لوگ تو ہم پرستی اور تشکیک میں مبتلا ہوتے ہیں، تقدیر الہی پر رضا جو مومن کا شعار ہونا چاہئے، اُس میں کمزوری واقع ہوتی ہے۔ پھر لوگ کسی مشکل صورتِ حال میں، جب انہیں کوئی فیصلہ کن راہ

بجھائی نہ دے، اللہ تعالیٰ کی ذات سے براہِ راست رجوع کرنے اور اس کے حبیب

کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تو سئل کے بجائے، اس روش کو ترک کر کے، اس طرح کے عاملوں سے رجوع کرتے ہیں۔ استخارہ تو مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی طلب کرنے کا نام ہے۔

حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ درپیش معاملات اور مباح امور میں سے کسی ایک کے انتخاب کے لئے یا کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں استخارہ کرنا افضل اور مستحب ہے، لیکن یہ واجب نہیں ہے کہ نہ کرنے پر گنہگار ہوگا۔ اور ویسے کسی مسئلے کے بارے میں دستیاب معلومات اور قرائن و شواہد کی روشنی میں یا اہل فن و اہل نظر اور اہل اللہ سے مشورہ کرنے کے بعد ذہن میں یہ امر واضح ہو جائے کہ یہ کام کر لینا چاہئے تو اللہ پر توکل کر کے کر لے، اور اللہ تعالیٰ سے اس میں کامیابی اور سرخ رو ہونے کی دعا کرتا رہے۔

قیام تعظیمی کا شرعی حکم

سوال: 180

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کسی محفل میں اگر کوئی بڑی عمر کا فرد یا بزرگ آجائے تو اپنی جگہ سے تعظیم کے طور پر اٹھنا نہیں چاہئے، کیا یہ ٹھیک ہے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ نبی کریم ﷺ جب اپنی مجلس میں تشریف لاتے تھے اور محفل میں موجود لوگ (صحابہ) تعظیم اٹھتے تھے تو نبی پاک ﷺ انہیں منع فرماتے تھے؟، (سید عابد علی، انچارج ڈی پی ڈی پارٹمنٹ، روزنامہ ایکسپریس کراچی)

جواب:

اس موضوع پر گفتگو سے پہلے چند احادیث ملاحظہ فرمائیں:

عن سعد قال: سمعت أبا امامة قال: سمعت أبا سعيد الخدري رضي الله

عنه يقول: نزل أهل قريظة على حكم سعد بن معاذ، فأرسل النبي ﷺ إلى سعد فأتى على حمار، فلما دنا من المسجد قال للانصار: "قوموا إلى سيدكم - أو خيركم - فقال: "هؤلاء نزلوا على حكمك" - فقال: تقتل مقاتلتهم، وتسبى ذراريهم، قال: "قضيت بحكم الله - وربما قال: بحكم المليك" -

ترجمہ: ”حضرت سعد فرماتے ہیں کہ میں نے ابو امامہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ: حضرت سعد بن معاذ کے حکم پر بنی قریظہ قلعہ سے نیچے اتر آئے تھے، پس نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد کو بلوایا، وہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہونے کے لئے دراز کوش (گدھے) پر سوار ہو کر آئے، پس جب وہ مسجد کے قریب پہنچے تو آپ نے انصار سے فرمایا: اپنے سردار یا اپنے بہترین فرد کے لئے (احتراماً) کھڑے ہو جاؤ۔ پھر آپ نے فرمایا: یہ لوگ تمہارے فیصلے پر قلعہ سے اتر آئے ہیں (اب ان کا فیصلہ کر دو)، انہوں نے کہا: ان کے جو افرادڑنے کے قابل ہیں، وہ قتل کر دیئے جائیں اور ان کے اہل و عیال کو قیدی بنالیا جائے۔ آپ نے فرمایا: تم نے حکم الہی کے مطابق فیصلہ کیا ہے اور کبھی آپ یہ فرماتے کہ یہ ایک بادشاہ (یا سردار) کے فیصلے کے مطابق ہے، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 4122، صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4515)۔“

امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ ایک طویل حدیث بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

عن عائشة أم المؤمنين قالت: ما رأيت أحدا أشبه سمعاً ودلاً وهدى برسول الله في قيامها وقعودها من فاطمة بنت رسول الله ﷺ - قالت و كانت إذا دخلت على النبي ﷺ قام إليها فقبلها وأجلسها في مجلسه، وكان النبي

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلَ عَلَيْهَا قَامَتِ مِنْ مَجْلِسِهَا فَتَقْبِلُهُ وَأَجْلِسْتَهُ فِي مَجْلِسِهَا (الحديث)۔

ترجمہ: ”ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ سے زیادہ کسی کو رسول اللہ ﷺ کی عاداتِ مبارکہ کے مشابہ نہیں دیکھا۔ جب حضرت فاطمہ نبی ﷺ کے پاس جاتیں، تو آپ ان کے لئے (ازراہِ شفقت) کھڑے ہو جاتے، پھر ان کو بوسہ دیتے اور انہیں اپنی جگہ بٹھاتے، اور جب نبی ﷺ حضرت فاطمہ کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ (احتراماً) اپنی نشست سے کھڑی ہو جاتیں، پھر آپ کو بوسہ دیتیں اور آپ کو اپنی جگہ بٹھاتیں، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 3872، سنن ابو

داؤد، رقم الحدیث: 5175)“، اس حدیث کو امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے (الادب المفرد، ص: 204)۔

امام بخاری نے ”قیام الرجل لاجیہ“ کا باب قائم کیا ہے اور اس کے تحت حضرت سعد والی حدیث کے علاوہ مندرجہ ذیل حدیث بیان کی ہے:

امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ عبد اللہ بن کعب کی روایت سے غزوہ تبوک میں کعب بن مالک کی توبہ کی قبولیت کی تفصیلی حدیث بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں: وَاذْنِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ بِتُوبَةِ الْعَلَةِ عَلَيْنَا حِينَ صَلَّى صَلَاةَ الْفَجْرِ فَتَلَقَانِي النَّاسُ فَوْجاً فَوْجاً يَهْنُونِي بِالتُّوبَةِ يَقُولُونَ لَتَهْنِكَ تُوبَةُ اللَّهِ عَلَيْكَ حَتَّى دَخَلْتَ الْمَسْجِدَ فَإِذَا بِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ حَوْلَهُ النَّاسُ فَقَامَ إِلَيَّ طَلْحَةُ بْنُ عُبَيْدٍ اللَّهُ يَهْرُولُ حَتَّى صَافَحَنِي وَهَنَانِي ۔

ترجمہ: ”اور جب رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز پڑھائی تو ہماری توبہ کی قبولیت کا

اعلان کیا، تو پھر صحابہ مجھے (قبولیت) تو بہ پر فوج در فوج مبارک باد دینے لگے، وہ کہتے تھے اللہ کی بارگاہ میں تمہیں تو بہ کی قبولیت مبارک ہو، یہاں تک کہ میں مسجد میں داخل ہوا، تو (منظر کچھ یوں تھا کہ) رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اور آپ کے گرد صحابہ کرام موجود تھے، اس موقع پر طلحہ بن عبید اللہ کھڑے ہوئے، دوڑ کر آئے، مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے مبارک باد دی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 4418، الادب المفرد، ص: 243)۔

امام بیہقی لکھتے ہیں:

عن ابی ہریرۃ قال: کان رسول اللہ ﷺ فی المسجد یحدثنا فاذا قام قمنا قیاماً حتی نراہ وقد دخل بعض بیوت ازواجہ۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں ہم سے گفتگو فرما رہے تھے، پھر جب آپ کھڑے ہوئے تو ہم بھی (احتراماً) کھڑے ہو گئے، یہاں تک کہ ہم نے دیکھا کہ آپ اپنی ایک زوجہ مطہرہ کے گھر میں داخل ہو گئے، (المدخل الی السنن الکبریٰ للبیہقی، رقم الحدیث: 717، مکتبہ دارالافتاء، کویت)۔“

قیام تعظیسی کے بارے میں اور بھی روایات ہیں، ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تعظیماً و احتراماً بزرگوں اور بڑوں کے لئے کھڑا ہونا جائز ہے اور اس میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہے۔ اور صحابہ کرام سے خود ذات رسالت مآب ﷺ کے لئے قیام تعظیسی ثابت ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا بلکہ خود حضرت سعد کے لئے احتراماً صحابہ کرام کو کھڑے ہونے کا حکم فرمایا۔ ہمارے ہاں قومی ترانے کے موقع پر سب کھڑے ہو جاتے ہیں، یہ بھی احترام کی ایک صورت ہے اور مسلمہ بین الاقوامی اقدار میں سے ہے اور کسی مکتبہ فکر کے کسی عالم نے اسے شرک و بدعت قرار

نہیں دیا قومی سیرت کانفرنس کے موقع پر جب صدر مملکت یا وزیراعظم تشریف لاتے ہیں تو ہال میں موجود تمام مکاتب فکر کے جید علماء احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں اور کوئی اس پر اعتراض نہیں کرتا۔ حال ہی میں سعودی عرب کے نائب وزیر مذہبی امور کراچی کے ایک مقامی ہوٹل میں ایک دعوت میں تشریف لائے تو دیوبندی و اہلحدیث مکاتب فکر کے تمام علماء نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور مصافحہ و معانقہ کیا۔

بعض روایات میں قیام تعظیسی سے منع فرمایا گیا ہے، لیکن یہ ممانعت علی الاطلاق نہیں ہے، ان کا محمل اور مصداق جدا ہے۔ ذیل میں ہم ان احادیث کو ذکر کر کے ان کے محامل بیان کریں گے۔

امام ابو داؤد روایت کرتے ہیں: عن ابی امامة قال: خرج علينا رسول الله ﷺ متوكئاً على عصي، فقمنا اليه فقال: لا تقوموا كما تقوم الاعاجم بعضهم بعضاً۔

ترجمہ: ابو امامہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عصا پر ٹیک لگائے ہوئے ہمارے پاس تشریف لائے، ہم آپ کے لئے کھڑے ہو گئے، تو آپ نے فرمایا: عجمیوں کی طرح مت کھڑے ہو، جیسے وہ ایک دوسرے کے لئے تعظیماً کھڑے ہوتے ہیں، (سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: 5187)۔

یہ حدیث اس درجے کی نہیں ہے، جو ہم نے قیام تعظیسی کے جائز و مستحب ہونے کے بارے میں ذکر کی ہیں، جن میں رسول اللہ ﷺ سے قیام کا حکم ثابت ہے، خود آپ کا بھی قیام فرمانا ثابت ہے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور دیگر صحابہ کرام کا آپ کے لئے قیام ثابت ہے، جس میں آپ نے اس قیام تعظیسی پر کوئی نکیر نہیں فرمائی، نہ کسی ناکواری کا اظہار فرمایا۔ قیام تعظیسی کی ممانعت کی یہ حدیث ضعیف ہے، اس کی سند

میں اضطراب ہے، اس کے راوی مجہول ہیں اور اس میں اس قیام کی ممانعت ہے جو عجمیوں کی طرح ہو، جس میں ایک شخص بادشاہ بن کر بیٹھا رہتا ہے اور باقی ہاتھ باندھے تعظیماً کھڑے رہتے ہیں۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں: عن جابر قال: اشتكى النبي ﷺ فصلىنا وراءه وهو قاعداً و ابو بكر يسمع الناس تكبيره ، فالتفت علينا فرانا قياماً فاشار الينا فصلىنا بصلاته قعوداً فلما سلم قال ان كدتم لتفعلوا فعل فارس والروم يقومون على ملوكهم وهو قعودهم فلا تفعلوا۔

ترجمہ: ”حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ: نبی ﷺ بیمار ہو گئے، آپ نے بیٹھ کر ہمیں نماز پڑھائی، حضرت ابو بکر آپ کے مکبر کے فرائض انجام دے رہے تھے (دورانِ نماز) آپ ہماری جانب متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ ہم سب (آپ کی اقتدا میں) کھڑے ہو کر پڑھ رہے ہیں، آپ نے ہمیں (بیٹھنے کا) اشارہ فرمایا، پھر ہم بیٹھ گئے، پھر ہم نے بیٹھ کر آپ کی اقتدا میں نماز ادا کی، پھر جب آپ نے سلام پھیرا تو فرمایا: مجھے خدشہ ہے کہ تم اہل روم اور فارس کی طرح کام کرنے لگو گے کہ ان کے بادشاہ بیٹھے رہتے ہیں اور وہ ان کے سامنے کھڑے رہتے ہیں، پس تم ایسا نہ کرو، (الادب المفرد، ص: 144)۔“

ابتدا میں فرض نماز بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت تھی، یہ حدیث اسی سے متعلق ہے، بعد میں بلا عذر فرض نماز بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت منسوخ ہو گئی۔

قرآن و سنت سے کسی حکم کے اثبات کا عادلانہ طریقہ یہ ہے کہ اس حکم سے متعلق تمام آیات و احادیث کو پیش نظر رکھ کر نتیجہ اخذ کیا جائے، ایک ہی مسئلے کے بارے میں ثبوت و ممانعت کے احکام میں اگر ممکن ہے تو تطبیق کی جائے، مواضع ثبوت کو الگ

واضح کیا جائے اور مواضع منع کو الگ واضح کیا جائے، دونوں کی توجیہ اور محمل بیان کیا جائے یا اگر ایک منسوخ ہے اور دوسرا نسخ تو دلائل سے واضح کیا جائے۔

ہماری رائے میں قیامِ تعظیہ کے جواز و استحباب اور ممانعت کی حدیثوں کو ہم یکجا کر کے دیکھتے ہیں تو مندرجہ ذیل قیامِ تعظیہ کی صورتیں جائز ہیں:

(1) مشائخ، اساتذہ، علمائے دین، والدین اور محسن و مربی کی تعظیم کے لئے قیام کرنا مستحب ہے۔

(2) کوئی شخص فی نفسہ تو قیامِ تعظیہ کے لائق نہیں ہے، لیکن کسی دینی مصلحت کے تحت بطور مدارات اس کے لئے قیام کرنا جائز ہے۔

(3) محض دنیوی مفاد کی خاطر بطور مداحمت و خوشامد کسی شخص کے لئے قیامِ تعظیہ مکروہ تحریمی ہے۔

(4) جو شخص سفر سے واپس آئے، اس کے استقبال کے لئے قیام کرنا مستحب ہے۔

(5) کسی شخص کو کوئی نعمت ملی ہو اس کو مبارک باد دینے کے لئے قیام کرنا مستحب ہے۔

(6) کسی شخص کو کوئی مصیبت پہنچی ہو تو اس کی تعزیت کے لئے قیام کرنا بھی مستحب ہے۔

(7) عہد رسالت کے عجمیوں کے طریق پر قیام کہ ایک شخص بادشاہ بن کر بیٹھا ہو اور دوسرے مستقل ہاتھ باندھے کھڑے ہوں، ایسا قیام مکروہ تحریمی ہے، کیونکہ یہ اکرامِ انسانیہ کے منافی ہے۔

(8) جو شخص بطور تکبر اپنے لئے قیام کرائے یا اس کے تکبر میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسے شخص کے لئے قیام کرنا مکروہ ہے۔

(9) اگر کوئی مجلس ذکر یا درس و تدریس جاری ہو تو کسی آنے والے بزرگ کے لئے

اسے معطل نہیں کرنا چاہئے اور ایسے موقع پر قیام فی نفسہ اپنے جواز کے باوجود مناسب نہیں ہے۔

ان میں سے بعض اقسام کو حافظ ابن حجر عسقلانی نے قاضی ابوالولید ابن الرشید مالکی کے حوالے سے بیان کیا ہے اور بعض اقسام کو علامہ بدرالدین عینی حنفی نے بیان کیا ہے اور ان تمام صورتوں کو علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم جلد: خامس میں یکجا کیا ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

نیاز کا مفہوم اور جواز

سوال: 181

نیاز کا مطلب اور مفہوم سمجھائیں اور کیا نیاز کا کرنا جائز ہے؟، (کامران، کراچی)۔

جواب:

سب سے پہلے معروف اردو لغات کے حوالے سے لفظ نیاز کے معنی ملاحظہ کیجئے:

نیاز: تبرک، تحفہ درویشاں، نذر بھیٹ چڑھاوا، منت، التجا (فیروز اللغات) آرزو، غنا، میل، خواہش، اظہار محبت، عاجزی، مسکینی، انکسار، تحفہ درویش، تبرک، درود فاتحہ، بھیٹ چڑھاوا، منت، التجا (فرہنگ آصفیہ جلد 4)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ لغت میں نیاز کے متعدد معانی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ: ”بھیٹ چڑھاوا“ (یعنی وہ عمل جو اللہ تعالیٰ کے تقرب، رضا اور بندگی کے علاوہ کسی اور کے تقرب کے لئے کیا جائے، خواہ مالی صدقہ ہو یا قربانی) اس معنی میں اس کا استعمال غیر اللہ کے لئے جائز نہیں ہے، ہمارے ہاں عرف میں ”نیاز“ جن معانی میں استعمال ہوتا ہے، وہ یہ ہیں: تبرک، درود فاتحہ وغیرہ مثلاً کہا جاتا ہے کہ: ”یہ گیارہویں شریف کی نیاز ہے“، یعنی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے لئے

ایصالِ ثواب اور فاتحہ کا کھانا ہے، اسے بزرگانِ دین کی نسبت سے تبرک بھی کہہ دیتے ہیں، اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، علمِ معانی کا مُسلمہ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی ”ذو معنی“ کلمہ ہے، تو اس کے معنی کا تعین قائل کے اعتبار سے ہوتا ہے، مثلاً کافر کہے کہ: ”انبت الربیع البقل“ موسم بہار نے سبزہ اگایا، یہ کلمہ اگر کافر کہے تو کلمہ کفریہ ہوگا، اور اگر یہی کلمہ مومن کہے تو کلمہ تو حید ہوگا، کیونکہ مومن کا ایمان اس امر کی دلیل ہے کہ وہ حقیقت میں اگانے والا اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کو مانتا ہے،

بارش اور بہار کو سبب مانتا ہے، اس کو اسنادِ مجازی کہتے ہیں، جو روزمرہ گفتگو میں ہم استعمال کرتے رہتے ہیں، مثلاً کوئی شخص کہتا ہے کہ مجھے فلاں دوا سے شفا ملی، حالانکہ اس کا ایمان ہے کہ دوا وسیلہ شفا ہے، اصل شفا دینے والا اللہ ہے۔

رجب کے کوٹے اور ”تبارک“ کی روٹیاں

سوال: 182

(1) ہمارے ہاں بعض لوگ رجب کی بائیس تاریخ کو ”کوٹے“ (جو ایک خاص قسم کی سوچی، میدے اور دودھ کی میٹھی ٹکیہ ہوتی ہے) پکاتے ہیں، یہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے نام پر نیاز ہوتی ہے، ہندوستان میں یہ رواج تھا کہ رات کو پکائے جاتے تھے اور ایک خاص جگہ بٹھا کر کھلائے جاتے تھے، انہیں باہر نہیں نکالا جاتا تھا، بعض جگہ اس موقع پر ”عجیب داستان“ کے نام سے ایک کتابچہ بھی پڑھا جاتا تھا، جس میں لکڑہارے کی منظوم داستان ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟۔ بعض لوگ اسے ناجائز اور حرام کہتے ہیں۔

(2) رجب ہی کے مہینے میں بعض لوگ میٹھی روٹیاں پکا کر بانٹتے ہیں، انہیں ”تبارک“ کی روٹیاں کہا جاتا ہے، غالباً ان پر سورۃ ”تبارک الذی“ (سورۃ الملک) پڑھ کر

ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟، (محمد شمیم خاں، عزیز آباد، کراچی)۔

جواب:

22 رجب نہ امام جعفر صادق کی تاریخ پیدائش ہے اور نہ تاریخ وصال، ان کی ولادت کے بارے میں دو اقوال ہیں: (1) مشہور قول یہ ہے کہ آپ کی تاریخ ولادت 17 ربیع الاول 80ھ (2) ماہ رجب، لیکن تاریخ مذکور نہیں ہے۔ اسی طرح وصال کے بارے میں بھی دو قول ہیں: زیادہ معروف ماہ شوال 148ھ ہے اور ایک قول رجب کا بھی ہے، (جلاء العیون، ملا باقر مجلسی، ج: 2، ص: 693)۔ لہذا 22 رجب کو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے کوئی خاص نسبت نہیں ہے، البتہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی تاریخ وصال 22 رجب 60ھ ہے۔ جہاں تک ایصالِ ثواب کا تعلق ہے، یہ فی نفسہ مشروع ہے، مستحسن امر ہے، قرآن وحدیث سے ثابت ہے اور ایصالِ ثواب کے لئے خاص قسم کی ٹکلیاں یا روٹیاں پکانا لازمی نہیں ہے، میٹھی ٹکلیاں یا روٹیاں بھی ایصالِ ثواب کی نیت سے بانٹی جاسکتی ہیں یا فقراء کو کھلائی جاسکتی ہیں اور کوئی دوسری صورت بھی اختیار کی جاسکتی ہے، البتہ یہ شرط، کہ خاص جگہ پر ہی بٹھا کر کھلایا جائے، فاسد ہے۔ ”عجیب داستان“ کے نام سے جو کتاب پڑھی جاتی ہے، اس کی بھی کوئی اصل نہیں ہے، ہاں، اگر کوئی چیز اپنی اصل کے اعتبار سے خلافِ شرع ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے اسے ختم کر دیا، حدیث پاک میں ہے: عن انس قدم النبی ﷺ المداینة ولهم یومان یلعبون فیہما، فقال ماہذا ن الیومان؟، قالوا کنا نلعب فیہما فی الجاہلیۃ، فقال رسول اللہ ﷺ: قد ابدلکم اللہ بہما خیرا منہما یوم الاضحی و یوم الفطر۔

ترجمہ: ”حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ: جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو (آپ نے دیکھا کہ) اہل مدینہ سال میں دو دن کھیل تماشے کیا کرتے تھے، آپ نے ان سے پوچھا: یہ کیسے دو دن ہیں؟، انہوں نے جواباً عرض کیا: ہم زمانہ جاہلیت میں ان دنوں میں کھیل کود کیا کرتے تھے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان دو دنوں کے بدلے میں تمہیں دو بہتر دن عطا فرمائے ہیں، اور وہ ہیں، عید الاضحیٰ اور عید الفطر کے دن، (مشکوٰۃ بحوالہ: سنن ابی داؤد)۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے سالانہ میلے ٹھیلے کے دو دنوں کو منع فر دیا اور فرمایا کہ ان کے عوض اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عیدین کے مبارک دن عطا فرمائے ہیں۔

اس کے برعکس ایک حدیث مبارک میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما أنَّ رسول اللہ قَیَمَ المَدِیْنَةَ، فوجد اليهود صیاماً یومَ عاشوراء فقال لهم رسول اللہ ﷺ: ما هذا یوم الذی تصومونہ؟، فقالوا: هذا یومٌ عظیمٌ اتَّخِذَ اللہُ موسیٰ وقومہ وغرق فرعون وقومہ، فصامہ موسیٰ شکراً، فنحن نَصُومُ فقال رسول اللہ ﷺ: فنحن اَحَقُّ وَاَوْلٰی بموسٰی منکم، فصامہ رسول اللہ ﷺ وَاَمَرَ بِصِیَامِہ۔

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے، تو آپ نے دیکھا کہ مدینہ کے یہود یوم عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں، آپ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ تم اس دن کا روزہ کیوں رکھتے ہو؟، تو انہوں نے جواب دیا: یہ وہ عظیم دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم (بنی اسرائیل) کو (فرعونوں سے) نجات دی، اور فرعون اور اس کی قوم کو (سمندر میں) غرق کر دیا، تو انہوں نے (اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کے) شکر کے

طور پر عاشورہ کا روزہ رکھا، تو (ان کی اتباع میں) ہم بھی (اس دن کا) روزہ رکھتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہم تمہارے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام (کی سنت کی اتباع) کے زیادہ حق دار ہیں اور ہم تمہاری بہ نسبت ان سے زیادہ قربت رکھتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے خود بھی یوم عاشورہ کا روزہ رکھا اور صحابہ کرام کو بھی اس کا حکم فرمایا، (صحیحین بحوالہ: مشکوٰۃ)۔ ایک اور حدیث مبارک ہے:

عن ابن عباس قال جئنا صام رسول الله ﷺ عاشوراء وأمر بصيامه قالوا يا رسول الله: إنه يومٌ يُعْظَمُ اليهود والنصارى فقال رسول الله ﷺ لئن بقيتُ إلى قابلٍ لأصومنَّ التاسعَ۔

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عباس ہی سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے عاشورہ کا روزہ رکھا اور اسے رکھنے کا حکم دیا تو (صحابہ کرام نے) عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم: یہ ایک ایسا دن ہے جس کی یہود و نصاریٰ تعظیم کرتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر میں آئندہ سال حیات رہا تو ضرور (یوم عاشورہ کے ساتھ) 9 محرم کو بھی روزہ رکھوں گا، (صحیح مسلم)۔ اس کی رو سے علماء فرماتے ہیں کہ دو دن کا نفلی روزہ رکھنا افضل ہے یعنی 9، 10 محرم الحرام یا 10، 11 محرم الحرام۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ فی نفسہ شرعاً یوم عاشورہ کی تقدیس ثابت ہے اور نفلی روزہ بھی اپنی اصل کے اعتبار سے مستحسن ہے، اس لئے آپ نے اسے برقرار رکھا اور محض یہود و نصاریٰ سے مشابہت کی بنا پر اصلاً مشروع امر کو منع نہیں فرمایا، بلکہ ان کی مشابہت سے بچنے کے لئے عاشورہ کے ساتھ ساتھ 9 محرم کے روزے کو بھی شامل فرمالیا۔

علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ”رجب میں حضرت امام جعفر صادق کو

ایصالِ ثواب کے لئے پوریوں کے کوئٹے بھرے جاتے ہیں، یہ جائز ہیں، اس میں جگہ کی پابندی اور نیاز کو تقسیم نہ کرنے کی پابندی بے جا ہے۔ اس موقع پر ایک کتاب ”عجیب داستان“ کے نام سے پڑھی جاتی ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں اور یہ نہ پڑھی جائے، فاتحہ دلا کر ایصالِ ثواب کرنا جائز ہے، (بہارِ شریعت، حصہ شانزدهم، ص: 230، مطبوعہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز، کراچی)۔

مولانا مفتی محمد خلیل خان برکاتی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

”ماہِ رجب میں امام جعفر صادق کو ایصالِ ثواب کے لئے کھیر پوری پکا کر کوئٹے بھرے جاتے ہیں اور فاتحہ دلا کر لوگوں کو کھلاتے ہیں، یہ جائز ہے۔ اس میں ایک بات بڑی غلطِ رواج پاگئی ہے کہ جہاں کوئٹے بھرے جاتے ہیں، وہیں کھائے جاتے ہیں، یہ ایک غلط حرکت ہے اور یہ غیر شرعی اور جاہلانہ رسم ہے۔ اور یہ ایک کتاب ”عجیب داستان“ پڑھی جاتی ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں یہ نہ پڑھی اور نہ ہی سنی جائے، فاتحہ دلا کر ایصالِ ثواب کریں۔ اللہ کے نیک بندوں کی کرامات برحق ہیں، (سنی بہشتی زیور، حصہ سوم، ص: 318)۔“

مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے کوئٹوں کی شرعی حیثیت کے حوالے سے سوال ہوا، آپ نے جواب میں لکھا: ”اہلسنت کے نزدیک جیسے ہر فاتحہ جائز ہے، اسی طرح کوئٹوں کی فاتحہ بھی جائز ہے، لکڑہارے کی کہانی من گھڑت ہے۔ کھانے کی ہر چیز کے متعلق ادب سکھایا گیا ہے۔ حدیث میں فرمایا: ”دستر خوان پر جو گر جائے اسے اٹھا کر کھا لو“۔ فاتحہ کے کھانے پر قرآن پڑھا جاتا ہے، اس لئے مسلمان اس کا زیادہ ادب کرتے ہیں، اسی وجہ سے لوگوں نے یہ شرط لگالی کہ وہیں بیٹھ کر کھالیں، باہر نہ لے جائیں اس شرط کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں، وہاں بھی کھا سکتے ہیں اور باہر بھی

لے جاسکتے ہیں، (وقار الفتاویٰ، جلد: اول، ص: 202، بزم وقار الدین، کراچی)۔
 جیسا کہ شروع میں ذکر ہوا، 22 رجب المرجب 60ھ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ
 کی تاریخ وفات ہے، (دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی)۔ بعض لوگ کہتے
 ہیں کہ حضرت امیر معاویہ کے معاندین اور ان سے بغض رکھنے والوں نے ان کی
 وفات پر (معاذ اللہ) خوشی منانے کے لئے یہ سلسلہ شروع کیا اور چونکہ وہ بنی امیہ کے
 اقتدار کا دور تھا، اس لئے اسے پوشیدہ رکھنے کے لئے گھر کے کسی خاص کوشے میں کھلایا
 جاتا تھا، لیکن ہمیں اس کا کوئی تاریخی حوالہ نہیں ملا۔ اسی طرح ”تبارک الذی“ یعنی
 سورۃ الملک میٹھی روٹیوں پر پڑھ کر ایصالِ ثواب کرنا شرعاً درست ہے، بشرطیکہ اپنی
 طرف سے کوئی خلافِ شرع امر اس میں شامل نہ کر دیا گیا ہو، کیونکہ ایصالِ ثواب فی
 نفسہ ایک مشروع اور مستحسن امر ہے، خواہ کسی خاص بزرگ کو ایصالِ ثواب کیا جائے یا
 تمام مومنین و مومنات کی ارواح کو، بہر صورت درست ہے۔

قیامت کے دن اعمال کا وزن کس طرح ہوگا

سوال: 183

قرآن مجید میں قیامت کے دن حساب و کتاب اور سوال و جواب کے موقع
 پر جزا و سزا کا فیصلہ کرنے انسان کے اعمال کے وزن کئے جانے کا ذکر ہے، سائنس
 ہمیں بتاتی ہے کہ مادہ وزن رکھتا ہے، وزن مادی اشیاء اور جسمانی اشیاء کا ہوتا ہے
 ، اعمال تو غیر مادی ہیں، اگر ان کا وزن ہونا ہے تو کس طرح ہوگا، اور اگر نہیں ہوتا تو پھر
 قرآنی آیات و احادیث کا کیا جواب اور کیا تو جیہہ ہو سکتی ہے، جو نقل و روایت کے بھی
 مطابق ہو اور عقل سلیم کے لئے بھی قابل قبول ہو، (حارث محبوب، گلگرام)۔

جواب :

یہ درست ہے کہ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ اسی بات کا ذکر ہے کہ قیامت کے دن اعمال کا وزن ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْوِزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ۔

(1) ترجمہ: ”اور آج (قیامت) کے دن (اعمال کا) وزن برحق ہے، سو جس کے (نیکیوں کا) پلڑے بھاری ہوئے تو وہی کامیاب ہوں گے اور جن کی نیکیوں کے پلڑے ہلکے ہوئے تو وہی اپنے آپ کو خسارے میں ڈالنے والے ہیں، اس سبب کہ وہ ہماری آیتوں پر ظلم کرتے تھے، (الاعراف: 8-9)۔“

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعِيَّهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا۔

(2) ترجمہ: ”(اے رسول!) کہہ دیجئے کہ کیا میں تمہیں ان لوگوں کے بارے میں بتا دوں جو اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں رہیں گے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں رائیگاں گئی، حالانکہ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کے رو برو (جوابدہی کے لئے) پیش ہونے کا انکار کیا، تو ان کے سب اعمال اکارت کئے، پس ہم قیامت کے دن ان کے لئے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے، (الکھف: 103-105)۔“

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ

حَبِطَ مَنْ خَرَدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفَى بِنَا حَاسِبِينَ۔

(3) ترجمہ: ”اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو رکھیں گے، تو کسی شخص پر ظلم مطلقاً نہیں ہوگا، اور اگر (کسی کا عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہوا تو ہم اس کو (حساب کے لئے) لے آئیں گے، اور ہم حساب کرنے کے لئے کافی ہیں، (الانبیاء: 47)۔“

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ هَاوِيَةٌ۔

(4) ترجمہ: ”تو جس کی نیکیوں کے پلڑے بھاری ہوں گے، وہ پسندیدہ زندگی میں رہیں گے اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے اس کا ٹھکانا ”ہاویہ“ ہوگا، (القارعہ: 6-9)۔“

چند احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں:

سمعت عبد اللہ بن عمرو ان العاص يقول: قال رسول الله ﷺ: ((ان الله سيخلص رجلا من امتي على رؤس الخلائق يوم القيامة فينشر عليه تسعة وتسعين سجلا كل سجل مثل مذابحر، ثم يقول: اتنكر من هذا شيئا؟ اظلمك كتبني المحافظون؟ فيقول: لا يا رب فيقول: افلك عذر؟ فيقول: لا يا رب فيقول: بلى ان لك عندنا حسنة فانه لا ظلم عليك اليوم، فتخرج بطاقة فيها اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا عبده ورسوله فيقول: احضر وزنك، فيقول: يا رب ما هذه البطاقة مع هذه السجلات؟ فقال: انك لا تظلم، قال: فتوضع السجلات في كفة والبطاقة في كفة فطاشت السجلات وثقلت البطاقة فلا يثقل مع اسم الله شيء))۔

ترجمہ: ”عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ میری امت کے ایک شخص کو قیامت کے دن برسر عام پیش فرمائے گا، اس کے (اعمال کے) 99 رجسٹر اس کے سامنے پھیلا دیئے جائیں گے، ان میں سے ہر رجسٹر حد نظر تک (پھیلا ہوا) ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم ان (اعمال) میں سے کسی بات کا انکار کرتے ہو؟، کیا اعمال لکھنے والے میرے محافظ فرشتوں نے تم پر ظلم کیا ہے؟، تو وہ عرض کرے گا، اے پروردگار! کوئی ظلم نہیں کیا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تمہارے پاس کوئی عذر ہے؟، وہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! کوئی عذر نہیں، پھر (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا: کیوں نہیں، ہمارے پاس تمہاری ایک نیکی (کی امانت) ہے، کیوں کہ تم پر آج کوئی ظلم نہیں ہوگا، پھر ایک چٹ (Slip) نکالی جائے گی، اس میں (کلمہ شہادت کے یہ الفاظ لکھے ہوں گے) (اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمد عبده ورسوله، پھر (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا: اپنے (اعمال کے) وزن کو دیکھو، وہ عرض کرے گا: اے پروردگار! کہاں اتنے (بڑے سائز کے 99) رجسٹر اور کہاں یہ ایک پرچی (Slip)، پھر (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا: تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا، (رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا: (ترازو کے) ایک پلڑے میں (وہ سب) رجسٹر رکھے جائیں گے اور ایک پلڑے میں (کلمہ شہادت کی) پرچی، (سارے کے سارے) رجسٹر ہلکے پڑ جائیں گے اور یہ ایک پرچی بھاری ثابت ہوگی، اللہ تعالیٰ کے نام سے زیادہ وزنی تو کوئی چیز نہیں ہو سکتی، (سنن الترمذی، ج: 3، رقم الحدیث: 2639)۔“

(2) ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے، تمام

آسمانوں اور زمینوں اور جو کچھ ان میں ہے، اور ان کے درمیان ہے، اور ان کے نیچے ہے، اگر تم ان کو لے کر آؤ اور اس کو میزان کے ایک پلڑے میں رکھ دو اور کلمہ شہادت کو دوسرے پلڑے میں رکھ دو، تو وہ پہلے پلڑے سے بھاری ہو گا، (المعجم الکبیر، ج: 12، ص: 254، رقم الحدیث: 13024، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔“

ان آیات و احادیث مبارکہ اور دیگر متعدد روایات و احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن بندوں کے اچھے اور برے اعمال کا وزن ہو گا، اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو گا اور بدکار بندوں کے گناہوں کا پلڑا ہلکا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد آپ کی نظر سے گزر چکا ہے کہ: آج (قیامت) کے دن (اعمال کا) وزن (کیا جانا) حق ہے، (الاعراف: 9)۔“

اب رہا یہ سوال کہ اعمال کا وزن کیسے ہو گا، وزن تو ان چیزوں کا ہوتا ہے جو مادی وجود رکھتی ہیں، جسم رکھتی ہیں، اعمال تو اعراض ہیں (عرض اسے کہتے ہیں، جس کا اپنا مستقل بالذات وجود نہ ہو، جس کا وجود کسی دوسرے کے ساتھ قائم ہو)، یہ اپنا جسمانی وجود نہیں رکھتے تو ان کا وزن کس طرح ہو گا۔

اس سوال کے جواب میں چند گزارشات پیش خدمت ہیں:

(1) جب اللہ جل شانہ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اعمال کا وزن ہو گا تو اس پر ہمارا ایمان کامل ہونا چاہئے، اس کی حقیقت ہماری سمجھ میں آجائے تو یہ ہماری فہم و دانش کی سعادت ہے اور اگر اس کی حقیقت ہماری سمجھ میں نہ آئے تو یہ ہماری عقل کی نارسائی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد حق اور سچ ہے۔

بہت سی مادی اشیاء ایسی ہیں، جن کے ماپنے کے آلات یا علم انسان کے پاس نہیں تھا

مگر سائنسی علوم کی ترقی کے ساتھ انسان ان کی پیمائش یا طاقت کا معیار و مقدار مقرر کرنے پر قادر ہو گیا اور اس نے ان کے لئے پیمائش Measurement، وزن (Weighing) یا قوت (Power)، دباؤ (pressure) یا دھکیلنے کی صلاحیت (Thrust) کا اندازہ کرنے کے لئے آلات اور پیمانے وضع کر لئے۔

مثلاً ہوا کے دباؤ (Pressure) ماپنے کے آلے کو (Barometer) کہتے ہیں، زلزلے سے زمین میں جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے، اس کے لئے ریکٹر اسکیل (Rector Scale) ایجاد ہوا، اس کی پیمائش کے آلے اور ایٹم بم کے اندر جو دھماکے کی قوت ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے (Seismo meter) ایجاد ہوا، برقی رو (Current) کی مقدار اور طاقت کا اندازہ کرنے کے لئے مخصوص اکائی (volt) اور کلو واٹ (Kilowatt) اور میگا واٹ (Megawatt) کے پیمانے ایجاد ہوئے۔ روشنی کی استعداد کا اندازہ لگانے کا آلہ Light meter یا Exposure meter، اسی طرح پانی کے دباؤ کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لئے (Telemeter)

آلات اور پیمانے ایجاد ہوئے، اسی طاقت سے ڈیموں اور آبشاروں (Water sheds) سے جو بجلی پیدا کی جاتی ہے، اسے Hydroelectric Power کہتے ہیں۔ مائع کی کثافت (Density) یا ثقل (Gravity) کا اندازہ لگانے کے لئے Hydrometre ایجاد ہوا۔ اعصاب یا پٹھوں (Muscle) کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لئے (Ergometer) ایجاد ہوا۔

الغرض بہت سے ایسی مادی اشیاء و موجودات تھیں، جن کا یا تو انسان کو علم نہیں تھا، اور اگر علم تھا تو ان کی پیمائش، مقدار، اور قوت کا اندازہ لگانے کے لئے آلات، پیمانے اور

اوزان نہیں تھے، انسان کے علم نے ترقی کی اور ان اشیاء کے قطعی تخمینے لگانے کی استعداد حاصل کر لی۔

جب انسانی دماغ اتنی ترقی کر سکتا ہے تو اس سے انسانی دماغ کے پیدا کرنے والا خالق و مالک کے علم کی لامحدودیت اور محیط کل ہونے کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں، وہ معقولات (facts Abst) یعنی محض معنوی اشیاء اور مجردات یعنی غیر مادی اشیاء (Immaterial) کو وزن کرنے یا ان کا اندازہ لگانے کے لئے معیار یا پیمانہ مقرر فرما دے۔

(2) ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ ان اعمال کو کوئی جسمانی صورت عطا فرما دے اور ان کا وزن ہو، اعمال خیر کو خوب صورت اجسام میں متشکل کر دیا جائے اور اعمال شر کو قبیح اجسام کی صورت میں متشکل فرما دے اور ان کا وزن کیا جائے۔

(3) بعض احادیث و روایات میں ہے کہ ان صحیفوں کا وزن ہوگا، جن میں اعمال لکھے ہوئے ہوں گے، یعنی تحریری ریکارڈ کا وزن ہوگا، جسے حدیث مبارک میں ”سجل“ سے تعبیر فرمایا گیا ہے، حالانکہ اس پر بھی عقلی خدشہ وارد ہو سکتا ہے کہ اگر خدا نخواستہ کسی کے گناہوں کے رجسٹر بہت زیادہ ہوں تو وہ بھاری ثابت ہو جائیں، لیکن ایسا بھی تو ممکن ہے کہ ان کا وزن ضخامت کے اعتبار سے نہ ہو بلکہ مندرجات (Written Material) کی کیفیت و ماہیت کے اعتبار سے ہو۔

ایصالِ ثواب کا کھانا اور صدقہ جاریہ

ہمیں چند سوالات مختلف موضوعات پر عبدالکریم حاجی انور سالویز لمبے، ملاوی، ساؤتھ افریقہ کی جانب سے موصول ہوئے ہم انہیں قارئین کی سہولت کی خاطر ترتیب وار بیان کرتے ہیں۔

ہمارے ٹاؤن (افریقہ، ملاوی) کے عوام سال میں دو یا تین مرتبہ نیاز کا کھانا پکاتے ہیں، اس میں بہت سارے پیسے خرچ ہوتے ہیں، اور کھانے والے لوگ تقریباً پیسے والے ہوتے ہیں، نیاز کا کھانا کھانے کے صحیح حقدار کون ہیں، ہم مالدار لوگ کھا سکتے ہیں یا نہیں؟ اور یہ پیسے مرحوم کے ثواب جاریہ کے لئے دوسرے دینی کاموں میں خرچ کرنا کیسا ہے؟ بہتر اور افضل طریقہ ارشاد فرمائیں۔

جواب:

”ایصالِ ثواب“ کے معنی، کسی شخص کا اپنے کسی عملِ خیر کا ثواب دوسرے کو پہنچانا، خواہ وہ زندہ ہو یا وفات پا چکا ہو، یہ شرعاً جائز ہے بلکہ مستحسن امر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلَاخِيْ وَأَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ۔

(1) ترجمہ: ”حضرت موسیٰ نے التجا کی: اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی ہارون کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے، (الاعراف: 151)۔“

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِإِخْوَانِيْ وَلِلْعَامِلِيْنَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ۔

(2) ترجمہ: ”(حضرت ابراہیم نے دعا کی) اے ہمارے رب! حساب (یعنی قیامت) کے دن میری، میرے والدین اور تمام اہل ایمان کی بخشش فرما، (ابراہیم: 41)۔“

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ۔

(3) ترجمہ: ”اے ہمارے رب: ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی (بھی

مغفرت) فرما، جو ہم سے پہلے وفات پا چکے، (الحشر: 10)۔“

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيْ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ۔

(4) ترجمہ: ”(حضرت نوح نے دعا کی) اے میرے رب! میری اور میرے والدین اور جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوا اور (جملہ) ایمان والے مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرما، (نوح: 28)۔“

امام بخاری روایت کرتے ہیں: ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ سعد بن عبادہ کی والدہ وفات پا گئیں اور وہ اپنی والدہ کی وفات کے وقت موجود نہیں تھے، انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! میری والدہ کا میری عدم موجودگی میں انتقال ہو گیا، (اب) اگر میں ان کی طرف سے کوئی صدقہ کروں، تو آیا انہیں فائدہ پہنچے گا؟، (رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا: ہاں، (حضرت سعد نے) عرض کیا: میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنا پھلوں والا باغ اپنی والدہ کے ایصالِ ثواب کے لئے صدقہ کر دیا، (صحیح بخاری، ج: 1، ص 186 مطبع اصح المطابع، کراچی)۔“

ایصالِ ثواب کا ذریعہ دعاءِ مغفرت بھی ہے، مالی صدقات بھی ہیں اور دیگر عبادات بھی ہیں، مثلاً حج بدل و عمرہ، تلاوت، اذکار، درود پاک وغیرہ، اسی طرح کھانے کا وہ اہتمام ہے، جس کا اعراس کے مواقع پر اہتمام کیا جاتا ہے۔

سوم، چہلم یا اعراس کے مواقع پر اجتماعی قرآن خوانی کا اہتمام ہوتا ہے، بعض مقامات پر محافل و عظ ہوتی ہیں اور کھانے کا بھی اہتمام ہوتا ہے، بہ ظاہر کھانے کا یہ اہتمام نفلی صدقہ ہے، تبرع ہے، اور نفلی صدقہ کے طور پر جو کھانا تیار کیا جائے، اس کا کھانا اصولی طور پر امراء اور فقراء سب کے لئے جائز ہے۔

بزرگانِ دین کے ایصالِ ثواب کے لئے اعراس کے مواقع پر جو کھانا تیار ہوتا

ہے، اسے ان بزرگوں کی نسبت کی وجہ سے ”مہرک“ کہا جاتا ہے، یہ بھی نفلی صدقہ ہے اور امراء اور فقراء دونوں اسے کھا سکتے ہیں۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا: ”سوم کے چنوں، بتاشوں کا لینا کیسا ہے؟“ آپ نے جواب دیا: ”اور سوم کے چنے بتاشے بغرض مہمانی نہیں منگائے جاتے بلکہ ثواب پہنچانے کے قصد سے ہوتے ہیں، یہ اس حکم میں داخل نہیں، نہ میرے اس فتوے میں ان کی نسبت کچھ ذکر ہے، یہ الگ مالک نے محتاجوں کے دینے کے لئے منگائے اور یہی اس کی نیت ہے تو غنی کو ان کا لینا بھی ناجائز، اور اگر اس نے حاضرین کے لئے منگائے تو اگر غنی بھی لے لے گا تو گنہگار نہ ہوگا، اور یہاں بحکم عرف و راج عام حکم یہی ہے کہ وہ خاص مساکین کے لئے نہیں ہوتے تو غنی کا بھی لینا ناجائز نہیں، اگرچہ احتراز زیادہ پسندیدہ ہے، اور اسی پر ہمیشہ سے اس فقیر کا عمل ہے۔“

اسی طرح ان سے پوچھا گیا: جو کھانا بہ میت خاص برائے ایصالِ ثواب خواہ بزرگانِ دین سے ہوں یا عام مسلمان، پکویا جائے تو اس کھانے کو اغنیا کھا سکتے ہیں؟۔ آپ نے جواب دیا: ”اغنیا بھی کھا سکتے ہیں، سوائے اس کھانے کے جو موت میں بھی بطور دعوت کیا جائے، وہ ممنوع و بدعت ہے۔“

اسی طرح امام احمد رضا قادری سے پوچھا گیا: جو طعام بہ میت ایصالِ ثواب بزرگانِ تقسیم کیا جاتا ہے، اس کو اغنیا بھی کھا سکتے ہیں یا نہیں؟، عام امواتِ مومنین کے لئے جو کھانا وغیرہ دیا جاتا ہے، اس میں اور اس طعام میں جو انبیاءِ عظام اور اولیاءِ کرام کی ارواح کے لئے ہدیہ کیا جاتا ہے، کچھ ذاتی فرق ہے یا نہیں؟، برکت و عدم برکت کے اعتبار سے دونوں حالتوں میں مصرف ایک

ہوگا، یعنی صرف فقراء کو دینا یا اغنیاء کے لئے بھی کھانا جائز ہوگا۔

آپ نے جواب میں لکھا: ”طعام تین قسم ہے: ایک وہ کہ وہ عوامِ ایمِ موت میں بطور دعوت کرتے ہیں، یہنا جائز و ممنوع ہے، اغنیاء کو اس کا کھانا جائز نہیں۔ دوسرے وہ طعام کہ اپنے اموات کو ایصالِ ثواب کے لئے بہ نیتِ تصدّق کیا جاتا ہے، فقراء اس کے لئے اکث (زیادہ حق دار) ہیں، اغنیاء کو نہ کھانا چاہئے۔ تیسرے وہ طعام کہ مذکور ارواحِ طیبہ حضراتِ انبیاء و اولیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کیا جاتا ہے اور فقراء و اغنیاء سب کو بطور تبرّک دیا جاتا ہے، یہ سب کو بلا تکلف روا ہے اور وہ ضرور باعثِ برکت ہے، برکت والوں کی طرف جو چیز نسبت کی

جاتی ہے، اس میں برکت آجاتی ہے، مسلمان اس کھانے کی تعظیم کرتے ہیں اور وہ اس میں مُصیب ہیں۔“

اسی طرح آپ نے سوم کے چنوں کے بارے میں فرمایا: ”یہ چنے فقراء ہی کھائیں، غنی کو نہ چاہئے، بچہ یا بڑا، غنی بچوں کو ان کے والدین منع کریں۔“

گیارہویں شریف کے بارے میں سائل کے جواب میں آپ نے لکھا:

”گیارہویں شریف اپنے مرتبہٴ فردیت میں مستحب ہے، اور مرتبہٴ اطلاق میں کہ ایصالِ ثواب ہے، سنت، اور سنت سے مراد سنتِ رسول اللہ ﷺ اور یہ سنتِ قولیہ مستحبہ ہے، (فتاویٰ رضویہ، ج: 9، صفحات: 605، 609، 610، 612، 614، 615، 672، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔“

اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ: اپنی اصل کے اعتبار سے ایصالِ ثواب کی مشروعیت قرآن و سنت سے ثابت ہے، یہ سنتِ قولیہ مستحبہ ہے، بزرگانِ دین کے اعراس کے مواقع پر قرآن خوانی، تلاوت، اذکار و درود شریف، مواعظِ حسنہ اور طعام کا انتظام، یہ

سب ایصالِ ثواب کی جائز صورتیں ہیں۔ عام مومنین و مومنات کے سوم، چہلم یا برسی کے موقع پر دیگر ایصالِ ثواب کی جائز صورتوں کے علاوہ طعام کا انتظام بھی اسی میں شامل ہے، اگر اس میں نذر، فدیہ اور کفارات مالی شامل نہ ہوں، تو یہ طعام (خواہ یہ ایصالِ ثواب بزرگانِ دین کے نام پر ہو یا عام مومنین و مومنات کے نام پر) نفلی صدقہ و خیرات ہے، جسے مالدار اور فقراء سب کے لئے کھانا جائز ہے۔ اگر نذر، فدیہ اور کفارۃ مالی کا کھانا ہو، تو یہ صرف فقراء و مساکین اور مستحقینِ زکوٰۃ کے لئے جائز ہے، مالدار لوگوں کے لئے نہیں ہے۔ بزرگانِ دین کے اعراس مبارکہ یا دیگر مواقع پر جو کھانا تیار ہوتا ہے، وہ مالدار اور فقراء سب کے لئے جائز ہے، اسے بزرگانِ دین کی نسبت سے شُرک بھی کہا جاتا ہے، یعنی اس میں نفلی ایصالِ ثواب کی نیت کے ساتھ ساتھ ان کی نسبت کی فضیلت بھی شامل ہو جاتی ہے۔

عام مومنین و مومنات کے ایصالِ ثواب کے لئے سوم کے موقع پر جو چنے تقسیم کئے جاتے ہیں، یا کھانا وغیرہ نفلی صدقہ کے طور پر تیار کیا جاتا ہے، اس کا کھانا امراء کے لئے جائز ہے، لیکن امام احمد رضا قادری نے اسے پسندیدہ امر قرار نہیں دیا، اس لئے اوپر ہم نے ان کے جو فتاویٰ نقل کئے ہیں، ان میں امراء کے لئے بعض مقامات پر جواز کا قول ہے اور بعض مقامات پر نا پسندیدگی کا، لیکن نا جائز ہونے کا قول نہیں کیا۔ لیکن ہمارے ہاں جو یہ رسم پڑ گئی ہے کہ سوم، چہلم اور برسی کے موقع پر فوت شدہ مومنین و مومنات کے ایصالِ ثواب کے لئے جو اجتماعی کھانے کا انتظام ہوتا ہے، اس میں لوگ اپنے احباب اور رشتہ داروں کو جمع کر لیتے ہیں، جو تقریباً سب کے سب غنی ہوتے ہیں اور فقراء کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے، تو اس طریقہ کار کی تو بہر صورت حوصلہ شکنی ہونی چاہئے، جب کہ ولیمہ جو کہ خالص خوشی کی تقریب ہے، اس کے بارے

میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ شر الطعام طعام الیمۃ یدعی لہا الاغنیاء و یتربک الفقراء۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ولیمہ کا بدترین کھانا وہ ہے کہ: جس میں (صرف) مالداروں کو دعوت دی جائے اور فقراء اور ناداروں کو چھوڑ دیا جائے، (بخاری، ج: 3، رقم الحدیث: 5177 المکتبۃ العصریہ، بیروت)۔“

ولیمہ کے ایسے کھانے کے بارے میں، جس میں صرف مالدار لوگ شریک ہوں اور فقراء و نادار لوگوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہو، رسول اللہ ﷺ نے وعید فرمائی اور اسے ”شر الطعام“ (بدترین کھانا) قرار دیا، تو اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایصالِ ثواب کے ایسے کھانے جن میں فقراء کو ترجیح دینی چاہئے یا صرف فقراء ہی کو کھلا دیئے جائیں تو افضل ہے، ان میں فقراء کو بالکل محروم کر دینا میرے نزدیک غیر مستحسن امر ہے اور مقاصدِ شرعیہ کے خلاف ہے۔

ایصالِ ثواب کی مندرجہ بالا صورتوں کے فی نفسہ جواز کے باوجود میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ایصالِ ثواب میں بھی ”صدقاتِ جاریہ“ کو ترجیح دی جائے، یعنی مصارف

ایصالِ ثواب کی ایسی صورتیں اختیار کی جائیں، جن کا فیضان اور اجر و ثواب تا دیر جاری و ساری رہے، اور جس کے ایصالِ ثواب کے لئے یہ برسی یا چہلم کے موقع پر یہ اہتمام کیا جا رہا ہے، اس کے خیر کے کھاتے کھلے رہیں اور اجر و ثواب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان وفات پا جاتا ہے تو اس کے اعمال خیر کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین صورتوں کے (جن کا اجر و فیضان وفات کے بعد بھی جاری رہتا ہے)، یعنی صدقہ جاریہ اور علم نافع (جس کا فیضان ان کے تلامذہ کے ذریعے بدستور جاری ہے)، اور نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرتی رہے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1376، دارالکتب العلمیہ، بیروت)۔“

”صدقات جاریہ“ کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً (ا) مسجد کی تعمیر (ب) دینی مدارس کی تعمیر (ج) علماء و حفاظ قرآن کی تعلیم و تربیت و کفالت (د) پانی کا کنواں کھود کر وقف کر دیا (ه) خیراتی ہسپتال بنانا، دعوتی و تبلیغی دینی لٹریچر وغیرہ۔ اپنے اموات کے ایصالِ ثواب کے لئے ”صدقات جاریہ“ کو ترجیح دینی چاہئے۔ اور صدقہ جاریہ کی ایک پسندیدہ صورت ضرورت مند لوگوں کے لئے پانی کا انتظام ہے، حدیث پاک میں ہے:

ترجمہ: ”حضرت سعد بن عبادہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! اُمّ سعد (یعنی میری والدہ) وفات پا گئی ہیں، تو (ان کے ایصالِ ثواب کے لئے) کنواں کھدوا کر (وقف کر دیا)، اور کہا: یہ اُمّ سعد کا کنواں ہے، (سنن ابی داؤد، ج: 1، ص: 236)۔“

حدیث پاک سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ بندے کی طرف تصدق کی نسبت ایصالِ ثواب کے لئے ہوتی ہے، نہ کہ تعجد و تہنُّب (یعنی بندگی اور قرابت) کی نیت سے، جیسے فیصل مسجد، شاہ جہاں مسجد وغیرہ، جب کوئی صدقہ بزرگانِ دین کی طرف

منسوب ہوتا ہے، تب بھی یہی مراد ہوتی ہے، جیسے گیارہویں شریف کا بکرا، یا میری قربانی، ان سب میں بندگی

اللہ تعالیٰ کی مقصود ہوتی ہے اور بندوں کی طرف نسبت کا مقصد ایصالِ ثواب ہوتا ہے۔

یوم میلاد النبی ﷺ کی صحیح تاریخ کا تعین

سوال: 185

اللہ کے آخری نبی محمد مصطفیٰ ﷺ کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟ کتب سیرت میں 12 ربیع الاول، 9 اور 8 ربیع الاول کی روایات موجود ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ جبکہ علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی ﷺ میں لکھا ہے ربیع الاول مذکور کی تاریخوں میں دو شنبہ کا دن 9 ربیع الاول کو پڑتا ہے، ان وجوہات کی بنا پر تاریخ ولادت 20 اپریل 571ء تھی، (سیرت النبی، جلد اول، ص: 173 زاہد بشیر پرنٹر، لاہور)۔ مولانا الیاس کاندھلوی لکھتے ہیں: آپ ﷺ 8 ربیع الاول کو پیدا ہوئے، (سیرت النبی، جلد 1 ص: 51)۔ قاضی سلمان منصور پوری رحمۃ اللعالمین میں لکھتے ہیں: آپ کی ولادت 9 ربیع الاول کو ہوئی۔

مصر کے عالم محمود پاشا فلکی نے ریاضی کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ آپ کی ولادت 9 ربیع الاول کو ہوئی۔ مفتی صاحب بعد کی دو کتابوں کے حوالے میرے پاس موجود نہیں، (محمد ذیشان اصغر، کوبرا نوالہ)۔

جواب:

دین میں نقل و روایت اصل اور اساس ہے۔ عقلی استدلالات، سائنسی و فنی حسابات سے ہم استفادہ تو کر سکتے ہیں، لیکن اس کی بنیاد پر نقل و روایت کی ساری اساس کو رد نہیں کر سکتے۔ اسی روش کی بنا پر ماضی قریب اور عہد حاضر کے متجدد دین نے

، جو اہل مغرب سے ہمیشہ مرعوب رہتے ہیں اور مستشرقین کے پروپیگنڈے سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں، معجزات انبیاء کرام کا انکار کیا، واقعہ اصحابِ فیل، معجزہ شق القمر، معجزہ معراج النبی ﷺ اور سابق انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات کی جو روایات امت میں تعامل و توارث کے ساتھ مسلمہ چلی آرہی ہیں، ان کی عقلی تاویلیں شروع کر دیں۔ اسی طرح ختم المرسلین رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کا یوم ولادت باسعادت پیر بارہ ربیع الاول کو ہونا، صدیوں سے امت میں مسلمہ ہے، اسے ”تکلفی بالقبول“ حاصل ہے اسی پر تعامل و توارث چلا آ رہا ہے، لہذا اس کے لئے از سر نو بحث و تمحیص کا سلسلہ شروع کرنا درست نہیں ہے۔ پھر یہ کوئی اعتقادی مسئلہ نہیں ہے کہ کسی نے اس معین دن کا انکار کر دیا تو شرعی قباحات لازم آئے گی یا اس کے برعکس اپنی تحقیق کی بنا پر کوئی رائے قائم کر دی تو اسکے محض اس رائے کے سبب فسادِ عقیدہ لازم آجائے گا۔ آپ ﷺ کے یوم ولادت کا متبرک و مقدس ہونا مسلمہ ہونا چاہئے، تعین پر اعتقاد و یقین ضروریات شرعیہ میں سے نہیں ہے۔ جدید سائنسی و فنی علوم کی بنا پر رائے قائم کرنے والے خود بھی آپس میں متفق نہیں ہیں اور یہ حقیقت آپ کے سوال میں بھی عیاں ہے، لہذا ان میں سے کسی ایک پر انحصار کر کے ہم نقل و روایت اور تعامل و توارث پر مبنی متفقہ رائے کو بدل بھی دیں، تو اختلاف کسی نہ کسی صورت میں قائم رہے گا۔ پس اصل بحث یہ نہیں ہے کہ تاریخ کوئی تھی، اصل مرکز عقیدت یوم میلاد النبی ﷺ کی تقدیس، تعظیم اور حرمت ہے اور اہل عقیدت و محبت کے درمیان اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہمارے عہد حاضر کے علماء میں سے جسٹس علامہ پیر کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی مایہ ناز تصنیف ضیاء النبی میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی، اہل ذوق اس کی جلد دوم، صفحات 33 تا 39 پر تفصیل سے

ملاحظہ فرمائیں۔ ہمارے ایک دوسرے دینی اسکالر پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب نے بھی اپنی تصنیف میلاد النبی میں اس پر بحث کی ہے۔ ہم ان دونوں اہل علم کی تحقیقات سے استفادہ کرتے ہوئے اختصار کے ساتھ چند دلائل کا ذکر کر رہے ہیں:

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ خُر کائنات سرور دو عالم ﷺ کا یوم میلاد دوشنبہ (پیر) کا دن تھا، اس پر بھی تمام علمائے ائمہ کا اتفاق ہے کہ ربیع الاول کا بابرکت مہینہ تھا اور متقدمین و متاخرین کا اجماع اسی پر ہے کہ تاریخ ولادت 12 ربیع الاول عام الفیل ہے۔ بقول قاضی سلمان منصور پوری مصنف ”ترجمہ اللعالمین“ یہ 22 اپریل 571 عیسوی اور ہندی مہینوں کے حساب سے یکم جیٹھ 628 ہجری بنتی ہے۔ معروف سیرت نگار علامہ محمد رضا مصری مصنف ”محمد رسول اللہ ﷺ“ اور محمد صادق ابراہیم عربون کی تحقیق کے مطابق سن عیسوی کے حساب سے 20 اگست 570 عیسوی بنتی ہے۔ علم البیوت کے ماہر محمود پاشا فلکی مصری اور بعض دیگر متاخرین کی تحقیق 9 ربیع الاول کے حق میں بھی ہے، مگر عالم اسلام میں قدیم زمانے سے اجماع 12 ربیع الاول پر ہی چلا آ رہا ہے اس لئے قول مختار کا درجہ اسی کو حاصل ہے۔ اس حوالے سے ہم بعض آئمہ کی تحقیق بیان کرتے ہیں:

امام ابن اسحاق متوفی 151 ہجری لکھتے ہیں: ولد رسول اللہ ﷺ یوم الاثنين عام الفیل لاثنتی عشرة لیلة مضت من شهر ربیع الاول۔

ترجمہ: ”رسول اللہ ﷺ کی ولادت مبارکہ بروز 12 ربیع الاول کو عام الفیل میں ہوئی، (الوفاء ص: 88)۔“

مشہور سیرت نگار علامہ ابن ہشام متوفی 213 ہجری لکھتے ہیں: ولد رسول اللہ ﷺ یوم الاثنين لاثنتی عشرة لیلة خلت من شهر ربیع الاول عام الفیل۔

ترجمہ: ”رسول اللہ ﷺ پیر کے دن 12 ربیع الاول کو عام الفیل میں پیدا ہوئے، (سیرت النبویہ، جلد 1، ص: 158، مطبوعہ: دارالکحل، بیروت)۔“

معروف مفسر و مؤرخ امام ابن جریر طبری متوفی 310 ہجری لکھتے ہیں: ولد رسول اللہ ﷺ یوم الاثنين عام الفیل لاثنتی عشرة لیلة مضت من شهر ربیع الاول۔

ترجمہ: ”رسول کریم ﷺ کی ولادت مبارکہ بروز پیر 12 ربیع الاول کو عام الفیل میں ہوئی، (تاریخ الامم والملوک المعروف تاریخ طبری، جلد 2، ص: 125)۔“

علامہ ابن خلدون متوفی 808 ہجری جو علم تاریخ اور فلسفہ تاریخ کے امام مانے جاتے ہیں بلکہ فلسفہ تاریخ کے موجد بھی ہیں، لکھتے ہیں: ولد رسول اللہ ﷺ عام الفیل لاثنتی عشرة لیلة خلت من ربیع الاول لاربعین سنة من ملک کسریٰ نوشیروان۔

ترجمہ: ”رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت عام الفیل کو ماہ ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو ہوئی، نوشیروان کی حکمرانی کا چالیسواں سال تھا، (التاریخ ابن خلدون، جلد 2، ص: 710، مطبوعہ: بیروت)۔“

علامہ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی متوفی 429 ہجری، جو علم سیاست اسلامیہ کے ماہرین میں شمار کئے جاتے ہیں اور ان کی کتاب ”الاحکام السلطانیہ“ علم سیاست کے طلباء کے لئے بہترین ماخذ ہے، اعلام النبوة میں تحریر فرماتے ہیں: لانه ولد بعد خمسين یوما من الفیل وبعد موت أبیه فی یوم الاثنين الثانی عشر من شهر ربیع الاول۔

ترجمہ: ”واقعہ اصحاب الفیل کے پچاس روز بعد اور آپ کے والد کے انتقال کے بعد

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بروز پیر بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے، (اعلام النبوة، ص: 192)۔“

امام الحافظ ابوالفتح محمد بن محمد بن عبد اللہ بن محمد بن یحییٰ بن سید الناس الشافعی الاندلسی متوفی 734 ہجری، لکھتے ہیں: ولد سیدنا ونبینا محمد رسول اللہ ﷺ یوم الاثنين لاثنتی عشرة لیلة مضت من شهر ربیع الاول عام الفیل قبل بعد الفیل بخمسين يوماً۔

ترجمہ: ”ہمارے آقا اور ہمارے نبی محمد ﷺ پیر کے روز بارہ ربیع الاول کو عام الفیل میں پیدا ہوئے، بعض نے کہا ہے کہ واقعہ فیل کے پچاس روز بعد حضور کی ولادت ہوئی، (عیون الاثر، جلد 1، ص: 26، مطبوعہ: دارالمعرفہ، بیروت)۔“

دور حاضر کے سیرت نگار محمد صادق ابراہیم عربون، جو جامعہ ازہر مصر کے کلیہ ”اصول الدین“ کے مدیر رہے ہیں، اپنی تصنیف ”محمد رسول اللہ“ میں لکھتے ہیں: وقد صبح من طرق كثيرة انّ محمداً علیہ السلام ولد یوم الاثنين لاثنتی عشرة مضت من شهر ربیع الاول عام الفیل فی زمن کسریٰ نوشیروان و یقول اصحاب التوفیقات التاریخیة انّ ذالک یوافق الیوم المکمل للعشرین من شهر اغسطس ۵۷۰م بعد میلاد المسیح علیہ السلام۔

ترجمہ: ”بکثرت طرق روایت سے یہ بات صحیح ثابت ہو چکی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ بروز دو شنبہ (پیر) بارہ ربیع الاول عام الفیل، کسریٰ نوشیروان کے عہد حکومت میں تولد ہوئے، اور ایسے علماء، جو شمسی اور قمری تاریخوں کی آپس میں تطبیق کرتے ہیں، نے کہا ہے کہ اس دن شمسی تاریخ 20 اگست 570ء بنتی ہے، (محمد رسول اللہ، جلد 1، ص: 102، مطبوعہ: دارالقلم، دمشق)۔“

اس موضوع پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے پیر محمد کرم شاہ الازہری ”ضیاء النبی ﷺ“ میں لکھتے ہیں: ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں یہی تاریخ روایت کی ہے، چنانچہ وہ بیان کرتے ہیں: رواہ ابن ابی شیبہ فی مصنفہ عن عفان عن سعید بن میناء عن جابر و ابن عباس انہما قالا ولد رسول اللہ ﷺ عام الفیل يوم الاثنين الثاني عشر من شهر ربيع الاول وفيه بُعث وفيه تُرج به الى السماء وفيه هاجر وفيه مات وهذا هو المشہور عند الجمهور واللہ اعلم بالصواب۔

ترجمہ: ”حضرت جابر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ”رسول اللہ ﷺ عام الفیل روز دوشنبہ (پیر) بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے، اسی روز آپ ﷺ کی بعثت ہوئی، اسی روز آپ کو معراج عطا ہوئی، اسی روز آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کی اور آپ ﷺ کے وصال مبارک کا دن بھی یہی ہے، جمہور امت کے نزدیک یہی تاریخ (بارہ ربیع الاول) مشہور ہے، واللہ اعلم بالصواب۔“

اس کے پہلے راوی ابو بکر بن ابی شیبہ ہیں ان کے بارے میں ابو زرعد رازی متوفی 264 ہجری کہتے ہیں کہ میں نے ابو بکر بن ابی شیبہ سے بڑھ کر حافظ حدیث نہیں دیکھا۔ محدث ابن حبان فرماتے ہیں ابو بکر عظیم حافظ حدیث تھے۔ دوسرے راوی عفان ہیں ان کے بارے میں محدثین کی رائے ہے کہ عفان ایک بلند پایا امام، ثقہ اور صاحب ضبط و اتقان ہیں۔ تیسرے راوی سعید بن میناء ہیں ان کا شمار بھی ثقہ راویوں میں ہوتا ہے۔ یہ صحیح الاسناد روایت دو جلیل القدر صحابہ حضرت جابر بن عبد اللہ اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: برصغیر پاک و ہند کے بعض سیرت نگاروں نے محمود پاشا

فلکی کے حوالے سے لکھا ہے کہ بارہ ربیع الاول کو پیر کا دن نہیں تھا بلکہ پیر کا دن نور ربیع الاول کو بنتا ہے، لہذا نو تاریخ صحیح ہے، لیکن دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ ان لوگوں کو محمود پاشا کے اصلی وطن کا بھی حتمی علم نہیں۔

علامہ شبلی نعمانی اور قاضی سلمان منصور پوری نے محمود پاشا کو مصر کا باشندہ لکھا ہے، مفتی محمد شفیع صاحب انہیں ملکی لکھتے ہیں، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے انہیں قسطنطنیہ کا مشہور ہیئت داں اور منجم بتایا ہے۔ مجھے بڑی کوشش کے باوجود محمود پاشا فلکی کی کتاب یا رسالہ نہیں مل سکا، البتہ معلوم ہوا کہ پاشا فلکی کا اصل مقالہ فرانسیسی زبان میں تھا، جس کا ترجمہ سب سے پہلے احمد زکی آفندی نے ”نتائج الافہام“ کے نام سے عربی میں کیا، اس کو مولوی سید محی الدین خان جج ہائی کورٹ حیدرآباد نے اردو کا جامہ پہنایا اور 1898ء میں نولکشور پریس نے شائع کیا لیکن اب یہ ترجمہ نہیں ملتا۔ محمود پاشا فلکی نے اگر علم فلکیات کی مدد سے کچھ تحقیقات کی بھی ہیں، تو صحابہ کرام، تابعین اور دیگر قدامت کی روایات کو جھٹلانے کے لئے ان پر انحصار کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ سائنسی علوم کی طرح فلکیات کی بھی کوئی بات قطعی نہیں ہوتی۔ محمود پاشا سے قبل بھی کچھ لوگوں نے علم نجوم کے حسابات سے یوم ولادت معلوم کرنے کی کوشش کی، علامہ قسطلانی لکھتے ہیں: اہل زیچ (جنتریوں کا حساب نکالنے والے) کا اس قول پر اجماع ہے کہ آٹھ ربیع الاول کو پیر کا دن تھا، اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو شخص بھی علوم نجوم اور ریاضی کے ذریعے حساب لگا کر تاریخ نکالے گا مختلف ہوگی۔ پس ہمیں قدیم سیرت نگاروں، محدثین، مفسرین، تابعین اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی بات ماننا پڑے گی، (ضیاء النبی ﷺ جلد دوم، ص: 33 تا 39، مطبوعہ: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور)۔

محافل میلاد میں مخلوط اجتماعات

سوال : 186

میلاد شریف و گیارہویں، مجالس وعظ و قرآن خوانی اور ایصالِ ثواب کی ایسی محافل، جہاں بے پردہ عورتیں اکثر حاضری دیتی ہیں، تو اس طرح کا نیاز پکانا، بہت سے پیسے خرچ کرنا، مالداروں کو کھلانا اور بے پردہ عورتوں کا مردوں کے ساتھ جمع ہونے کے بارے میں از روئے شرع کیا حکم ہے؟۔

جواب :

محافل ایصالِ ثواب ہوں، جیسے محافل میلاد شریف، گیارہویں شریف کی محفل، مجالس وعظ، قرآن خوانی کی محافل، اپنے اموات کی سوم، چہلم یا برسی کی محافل وغیرہ، یا شادی کی محافل و دیگر سماجی تقریبات، ان سب میں مرد و زن کا ایسا مخلوط اجتماع (Mixed gathering)، جن میں خواتین غیر محرم مردوں کے ساتھ بے تکلف اور بے حجاب گھل مل جائیں، شریعت کی رو سے یہ جائز نہیں ہے، اور خاص طور پر وہ تقاریب یا اجتماعات جو نیک مقاصد کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے منعقد کئے جاتے ہیں، ان

میں شریعت کی پاسداری کا زیادہ اہتمام ہونا چاہئے۔

کس دور میں کس چیز کا اجر زیادہ ہے، میری سمجھ کے مطابق یہ ہر جگہ اور مقام کے اعتبار سے لوگوں کی مقامی ضروریات پر منحصر ہے، کہیں پانی کی فراہمی اشد ضرورت ہے، تو اس کا اجر زیادہ ہوگا، کہیں مسجد یا دینی مدرسے کے قیام کی زیادہ ضرورت ہے تو اس کا اجر زیادہ ہوگا، کہیں لوگ خوراک و لباس کے محتاج ہیں، تو اس کا اجر زیادہ ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ”وہ دشوار گزار گھاٹی میں کیوں نہ داخل ہوا، اور (اے انسان!) تجھے کیا خبر کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟، (لوگوں کی) گلو خلاصی کرانا، یا (شدید) بھوک کے دن کھانا کھلانا یا کسی ایسے یتیم کو جو (تمہارا) رشتے دار بھی ہے، یا کسی ایسے مسکین کو (جو تنگ دستی کے مارے) خاک میں رل رہا ہے، (البلد: 16-11)۔“

امام بخاری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کا زنا میں حصہ لکھ دیا ہے، وہ اسے بہر حال پائے گا، آنکھ کا زنا دیکھنا ہے، اور زبان کا زنا (فحش) گفتگو کرنا ہے، اور نفس (گناہ) کی تمنا کرنا ہے اور (بتلائے) شہوت ہوتا ہے، اور شرم گاہ اس طرح سب کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب (یعنی بالآخر ان مبادی و اسباب اور محرکات زنا کے مراحل سے گزرنے کے بعد انسان شہوت نفس سے مغلوب ہو کر زنا کے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر لیتا ہے اور یا اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نفس پر قابو پا کر بچ جاتا ہے)، (صحیح البخاری: 4، رقم الحدیث: 6243، المکتبۃ العصریہ، بیروت)۔“

اس لئے احتیاط اور تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان زنا کے محرکات (Incentives) و اسباب سے ہمیشہ بچ کر رہے تا کہ غلبہ شہوت سے مغلوب ہو کر اس گناہ میں مبتلا ہونے کی نوبت نہ آئے، اور مردوں اور عورتوں کے مخلوط بے پردہ اجتماعات گناہ کے مبادیات و محرکات ہی میں شمار کئے جائیں گے۔

تبرکات انبیاء کرام کا احترام

سوال: 187

ہمارے شہر میں بارہ ربیع الاول کے دن رسول پاک ﷺ کے موئے مبارک کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ ایک مسجد میں موئے مبارک کی زیارت کا اہتمام کیا جاتا ہے

جس میں عورتیں بھی بغیر پردہ زیارت کے لئے مسجد آتی ہیں، دوران زیارت نماز کا وقت ہو جاتا ہے، تو نماز بجائے مسجد کے ملحقہ مدرسہ میں ادا کی جاتی ہے، یہ سب باتیں کہاں تک صحیح ہیں؟۔

جواب:

انبیاء کرام کے آثار اور تبرکات کا احترام قرآن و سنت سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُمْ مُّؤْمِنِينَ۔

ترجمہ: ”اور ان کے نبی نے ان سے کہا: بیشک ان کی سلطنت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا، جس میں تمہارے رب کی طرف سے (تمہارے دلوں کا) سکون ہے، اور آل موسیٰ اور آل ہارون کے باقی ماندہ (تبرکات) ہیں، اس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے، بلاشبہ اس میں تمہارے لئے ضرور ایک نشانی ہے، اگر تم مومن ہو، (بقرہ: 248)۔“

رہا یہ سوال کہ اس تابوت یا صندوق میں کیا تھا، جسے اللہ کے نبی نے حضرت طالوت کی سلطنت کی نشانی اور رب کی طرف سبب باعث تسکین قرار دیا ہے، تو اس کے بارے میں کئی تفسیری اقوال ہیں، ان کے مطابق اس میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے عصا، الواح تورات کے ٹکڑے، ان کے کپڑے اور بعض روایات میں نعلین کا ذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَذَا فَأَلْقُوهُ عَلَى وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا۔

ترجمہ: ”(یعقوب علیہ السلام نے فرمایا) میری یہ قمیص لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، اس کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی، (یوسف: 93)۔“

ان آیات مبارکہ سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے تبرکات اور ان سے نسبت رکھنے والی اشیاء برکت و کامرانی کا باعث ہوتی ہیں۔

امام مسلم اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

”حضرت اسماء بنت ابی بکر کے غلام عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضرت اسماء نے حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس بھیجا اور کہا یہ رسول اللہ ﷺ کا جبہ ہے، انہوں نے ایک طیالسی کسروانی جبہ نکالا جس کی آستینوں اور گریبان پر ریشم کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے، حضرت اسماء نے کہا:

هذه كانت عند عائشة رضي الله عنها حتى قبضت فلما قبضت قبضتها وكان النبي ﷺ يلبسها فنحن نغسلها للمرضى ونستشفى بها۔

یہ جبہ حضرت عائشہ کی وفات تک ان کے پاس تھا، اور جب ان کی وفات ہوئی تو پھر میں نے اس پر قبضہ کر لیا، نبی اکرم ﷺ اس جبہ کو پہنتے تھے، ہم اس جبہ کو دھو کر اس کا پانی بیماروں کو پلاتے تھے اور اس جبہ سے ان کے لئے شفا طلب کرتے تھے، (صحیح مسلم جلد: 2، ص: 190 مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی، 1375ھ)۔“

امام بیہقی روایت کرتے ہیں: ترجمہ: ”خضیب بن عبدالرحمن بیان کرتے ہیں کہ جنگ بدر میں خضیب بن عدی کا ہونٹ کٹ کر لٹک گیا رسول اللہ ﷺ نے لعاب دہن لگا کر اس کو جوڑ دیا، (دلائل النبوت ج: 3، ص: 98-97، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت)۔“

علامہ غلام رسول سعیدی نے اپنی تفسیر تبیان القرآن (ج: 1، ص: 928-929-930، فرید بک اسٹال لاہور) میں تبرکات انبیاء کے موضوع پر باحوالہ مفصل و مدلل بحث کی ہے۔ اس وقت دنیا میں کئی مقامات پر رسول اللہ ﷺ کے ”مومئے مبارک“ کی موجودگی کا دعویٰ کیا جاتا ہے، ان کی زیارت بھی کرائی جاتی ہے، ہم اس مقدس نسبت کی تعظیم اور اکرام و احترام کرتے ہیں، لیکن ان دعوؤں کی تصویب و توثیق کے ہمارے پاس کوئی قطعی شواہد نہیں ہیں،

اس لئے قطعیت کے ساتھ نہ ہم نسبت کی نفی کر سکتے ہیں، نہ اثبات، لیکن نسبت کا احترام ہمارا عقیدہ بھی ہے اور عقیدت بھی۔ یہ ایسا ہی ہے کہ بعض روایات کی رو سے انبیاء کرام علیہم السلام کی مجموعی تعداد کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، لیکن ہر مسلمان کے لئے تعیین شخصی کے ساتھ

ان پچیس انبیاء کرام پر ایمان لانا فرض عین ہے کہ جن کے اسماء مبارکہ قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصِصْ عَلَيْكَ۔

ترجمہ: ”اور ہم نے آپ سے پہلے (بھی) رسول بھیجے، ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ پر بیان کر فرما دیا اور ان میں سے بعض کا حال آپ پر بیان نہیں فرمایا، (المومن: 78)۔“

لہذا ان معین و مشخص انبیاء کرام کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے دیگر انبیاء کرام پر اجمالی طور پر ایمان لانا فرض عین ہے، یعنی ہم یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کسی کو بھی مختلف ادوار میں نبی یا رسول بنا کر بھیجا ہے، وہ سب حق پر تھے اور ان میں سے کسی

کی بھی نبوت کا انکار کفر ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَأَتْ كُتُبُهُ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ۔

ترجمہ: ”رسول (مکرم) ایمان لائے اس (کتاب) پر جو ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور (تمام) مومن بھی (اس کتاب پر ایمان لائے)، سب سے سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی (تمام) کتابوں پر اور اس کے (تمام) رسولوں پر، (وہ یہ کہتے ہیں کہ) ہم (ایمان لانے میں) اس کے (تمام) رسولوں کے درمیان کسی ایک کے بارے میں فرق نہیں کرتے، (کہ اس پر ایمان نہ لائیں)، (بقرہ: 285)۔“

لہذا موئے مبارک کی زیارت اور اس کا احترام و اکرام باعث سعادت ہے، لیکن اس کے لئے انتظامیہ کی طرف سے مسجد میں جماعت کو موقوف کر دینا یا مسجد سے متصل دوسری عمارت میں منتقل کرنا درست نہیں ہے۔ ”نماز باجماعت“ واجب ہے، مسجد میں جماعت مشروع ہے، جبکہ موئے مبارک کی زیارت ایک مستحب و مستحسن امر ہے، تو امر مستحب کی خاطر واجب کو ترک کرنا یا جماعت کو مسجد سے منتقل کرنا درست نہیں ہے۔ بلکہ موئے مبارک کی زیارت کا اہتمام مسجد کے متصل مدرسہ کی عمارت میں کیا جاسکتا ہے۔ اور نماز باجماعت کے وقت زیارت کو موقوف کر لینا چاہئے تاکہ لوگ باجماعت نماز پڑھیں، کیونکہ موئے مبارک کی زیارت کی محرک عقیدت و محبت رسول ہے، اور اس عقیدت و محبت کا تقاضا ہے کہ نماز باجماعت کو ترجیح دی جائے، یا نماز کے اوقات کے علاوہ دیگر اوقات میں زیارت کا اہتمام کیا جائے، عورتوں کے لئے الگ اہتمام ہو اور ان پر لازم قرار دیا جائے کہ وہ باپردہ

اور حجاب شرعی کے اندر رہتے ہوئے زیارت کے لئے آئیں۔

عوام کا یہ کہنا کہ ہم سب اللہ کے سامنے غریب ہیں

سوال: 188

عوام کا یہ کہنا کہ ہم سب اللہ کے سامنے غریب ہیں، کیسا ہے؟۔

جواب:

عوام کا یہ کہنا کہ: ”ہم سب اللہ کے سامنے غریب ہیں، کیسا ہے؟“۔ یہ کہنے

میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ درست ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ۔

ترجمہ: ”اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو، اور اللہ ہی بے نیاز (ہر احتیاج سے

پاک) ہے، سب خوبیوں والا ہے، (فاطر: 15)۔“

اردو میں لفظ ”غریب“ مفلس و نادار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جبکہ کہ عربی میں

اس کے معنی ہیں اجنبی اور مسافر۔ اور مفلس، نادار اور محتاج کے معنی میں لفظ ”فقیر“ اور

”مسکین“ آتے ہیں۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ ہم سب اللہ کے محتاج ہیں، اور اگر

کوئی دنیوی اعتبار سے غنی اور مال دار بھی ہے تو یہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے، وہ

چاہے تو نواز دے اور چاہے تو سب کچھ سلب فرما دے، بندے کی کیا مجال۔ اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے:

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاتُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ۔

ترجمہ: ”(لوگو! آخر) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، حالانکہ

آسمانوں اور زمینوں کا (حقیقی) وارث تو اللہ ہی ہے، (الحج: 10)۔“

ہمارے یہاں رمضان شریف میں اپنی سنی مسجدوں میں قرآن شریف کی تراویح ہوتی ہے، تراویح پڑھانے والے مدرسے کے طالب علم ہی ہوتے ہیں، جن کو قرآن صحیح یاد نہیں ہوتا اور تجوید بھی نہیں جانتے، سال میں اکثر اوقات نماز کی پابندی بھی نہیں کرتے، اور داڑھی بھی منڈھواتے ہیں، ان میں سے بعض کو تو نماز کے مسائل بھی نہیں آتے، ایسوں کو تراویح میں امام بنانا کیسا ہے؟ اور کیا ان کے پیچھے تراویح ہو جاتی ہے یا نہیں؟، کچھ لوگوں نے انتظامیہ مسجد سے بات کی، جواب میں کہا گیا کہ حافظوں کو پریکٹس کے لئے چانس دیتے ہیں تو ایسا سسٹم چلانے میں گنہگار کون ہے؟ اور یہ سب کام ہمارے یہاں ایک مفتی صاحب کی زیر نگرانی ہو رہا ہے، جو حکم شرع ہو بیان فرمائیں۔

جواب:

متشرع و دین دار حافظ و قاری و عالم امام کی موجودگی میں ایسے افراد کو نماز تراویح کا امام بنانا ہرگز درست نہیں ہے، جو کہ:

(ا) نابالغ ہوں (ب) تلاوت قرآن میں ایسی غلطیاں کرتے ہوں جو فساد نماز کا باعث بنتی ہیں (ح) داڑھی منڈھواتے ہیں یا کٹواتے ہیں اور حد شرعی سے کم ہوتی ہے (د) یا رمضان المبارک سے قبل محض قرآن سنانے کے لئے داڑھی رکھ لیتے ہیں اور رمضان کے بعد منڈھوادیتے ہیں یا حد شرعی سے کم کر دیتے ہیں، (کیوں کہ اس میں سنت رسول کا استخفاف ہے

جس کے لئے بڑی وعید ہے) (ہ) یا سال بھر نماز کے تارک رہتے ہیں۔ مفتی

صاحب کو انتظامیہ کمیٹی یا بااثر لوگوں کی رضامندی کی خاطر شرعی حدود و قیود کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ انہیں چاہئے کہ حفاظ کرام کو وہ اتباع شریعت کی تلقین کریں اور جب تک وہ

اتباع شریعت پر کاربند نہیں ہوتے، انہیں امام نہ بنائیں، بلکہ جماعت سے باہر ایک دوسرے کو قرآن کی منزل سنا کر اس کی حفاظت کریں۔

مدرسے کی سالانہ رپورٹ میں تصاویر کی اشاعت

سوال : 190

ہمارے یہاں مدرسے میں سال بھر کے بعد ایک سالانہ رپورٹ چھپواتے ہیں، جس میں کچھ اساتذہ اور طلباء کی تصاویر ہوتی ہیں، ایسی تصویریں جائز ہیں یا ناجائز؟۔

جواب :

مدرسے کی سالانہ رپورٹ میں تصاویر کا شائع کرنا درست نہیں ہے، اس سے اجتناب بہتر ہے، کیونکہ یہ ایسی ضروریات میں سے نہیں ہے، جن پر اس فقہی اصول کا اطلاق ہوتا ہے کہ: ”الضرورة تبیح المحظورات“، یعنی ”ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں“۔ البتہ ہم دینی، دعوتی و تبلیغی مقاصد کے لئے (Movies/video) فلم کے جواز کے قائل ہیں، بشرطیکہ ان میں دیگر ممنوعات و محارم شامل نہ ہوں، مثلاً بے پردہ بے حجاب و بے تکلف مردوں اور عورتوں کے مخلوط اجتماعات وغیرہ، بعض علماء (Vedeo/Movie) کے عدم جواز کے قائل ہیں، عوام جس عالم، فقیہ یا مفتی پر اعتماد کریں، اس کے فتوے پر عمل کریں۔